زندگی کے ساتھ ساتھ

ماہنامہ

چہارسو

راولپنڈی

ABC CERTIFIED

ماہنامہ

چہار سو

راولپنڈی

جلد ۱۲ شمارہ مئی جون ۲۰۰۳ء

مجلسِ ادارت

بانی مدیرِ اعلیٰ ——— سید ضمیر جعفری

مدیر مسئول ——— گلزار جاوید

مدیرِ معاون ——— بینا جاوید

مجلسِ مشاورت

محسن بھوپالی ☆☆☆ بیگم ثاقبہ رحیم الدین ☆☆☆ ڈاکٹر انور نسیم

قیمت

فی پرچہ	35روپے
چھ شمارے	150روپے
زرِ سالانہ	300روپے

بیرونِ ملک ہوائی ڈاک سے

امریکہ کینیڈا	40 ڈالر
برطانیہ	20 پونڈ
سعودی عرب	80 ریال
متحدہ عرب امارات	80 درہم
قطر	ایضاً
شارجہ	ایضاً

رابطہ: 537/D-1 ویسٹریج III راولپنڈی۔

فون 5462495 فیکس 4433619 موبائل: 0300-5176062

E-Mail:waqar's_oma@yahoo.com

پرنٹر: فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

قرطاسِ اعزاز

عروج و زوال..... حمیدہ معین رضوی

براہِ راست..... گلزار جاوید

اکیلا پن..... ڈاکٹر انور سدید

دشتِ غربت کی مسافر..... محسن بھوپالی

عورت کی مظلومیت..... پروفیسر ممتاز احمد خان

پاکستانی تارکِ وطن..... الطاف فاطمہ

گھر میں ڈوبی چاندنی..... نشاط یاد

مغرب اور اردو افسانہ..... سید محمد عقیل

کہانی کا سحر..... ڈاکٹر طاہر تونسوی

محرم کے مختلف پہلو..... ایمن مغل

افسانہ

دہشت گرد اور دہشت گرد..... حمیدہ معین رضوی

خاکہ

جوتا..... حمیدہ معین رضوی

قلبِ سلیم

رفعت سروش، غالب عرفان، عبدالعزیز خالد، ناصر زیدی، اسلم راہی، علی آذر

سخنِ تازہ

جگن ناتھ آزاد، شوکت واسطی، بیکل اتساہی، عبدالعزیز خالد، مشکور حسین یاد، ذکا الفضلی، پرتو روہیلہ، ماہرن ایمن، شاہد واسطی، شہین کاف نظام، باقر زیدی، اکبر حمیدی، قیصر نجفی، پنہاں، ذکیہ غزل، مناظر عاشق ہرگانوی، سوہن راہی، ناشر نقوی، غالب عرفان، سلطان میروانی، صدیق شاہد، دل نواز دل، مختار ابرار، ملک زادہ جاوید، آنا دہلوی، شگفتہ نازلی، اسلم راہی، نسیم گیاجی، کرامت بخاری، خورشید انور رضوی، صابر عظیم آبادی، سحرتاب رومانی، سجاد مرزا، اکرام تبسم، حمیر نوری، علی عرفان عابدی، احمد محمود، شہاب صفدر، ساگر سیالکوٹی، شاکر نیازی، شاکر۔

افسانے

وقت کا پہیہ..... انور خواجہ

سہما ہوا آدمی..... تنہا کشور کرم

خود ساختہ خدا..... گلزار جاوید

نظمِ عصر

حمایت علی شاعر، نازی انصاری، معراج کول، رفعت سروش، شلیکھ چندر کنول، مرزا ابالوی، ناصر زیدی، سید عارف، ضیاالحق قاسمی، مناظر عاشق ہرگانوی، قیصر نجفی، سوہن راہی، خیال آفاقی، تبسم اخلاق، بھگوان داس اعجاز، کاوش پرتاپگڈھی، علی آذر، شگفتہ نازلی، بزم آرا، زیدی، شبر طرف۔

نشانِ راہ

شاہ خوباں..... محسن احسان

حسن عسکری کی تنقید..... تحسین زہرا

آئینۂ فن

وشواس کمات..... قیصر نجفی

بساطِ نشاط

یادش بخیر..... ساحر خیالی

بیڑہ جگر..... ٹی ایس راز

تخلیقِ عصر

تازہ تصانیف کا تعارف..... عطیہ سکندر علی

رس رابطے

جستجو ترتیب و تدوین..........محمد اعجاز گھمر   ساگر سیالکوٹی

جلد ۱۲ شمارہ مئی جون ۲۰۰۷ء

تربیت: سیالکوٹ پاکستان

تعلیم: حافظ قرآن، ایم اے (اردو)، ایم اے (انگریزی)، پوسٹ گریجویٹ انگریزی ٹیچنگ سرٹیفکیٹ، یوتھ کونسلنگ، انتظامی ڈپلومہ لندن یونیورسٹی (UK)، مشغلہ: تدریس (اسلامک کلچر سینٹر لندن)۔

تدریسی اعزازات: قائد اعظم طلائی تمغہ، تمغہ حسن تلاوت، بہترین مضمون نگار اور نظم نگار کا اول انعام از گورنمنٹ کالج برائے خواتین، لڑکوں اور لڑکیوں کے تحریری مقابلہ میں اول آنے پر طلائی تمغہ، کالج میگزین کی ادارت کا اول انعام، انگریزی تقریر میں اول انعام، کل پاکستان ٹین ایجرز ٹیلنٹ ٹرافی، اخبار مسلم نیوز تمغہ حسن کارکردگی (برائے کمیونٹی سروس)، کالج کی سو سالہ تاریخ کی پہلی اور آخری کامیاب مدیرہ شاعرہ، افسانہ نگار اور انسانی حقوق کی علمبردار ہونے پر طلائی ٹرافی 1991ء۔

اشاعت: پہلا ادبی مضمون "اسلام اور اشتراکیت" کالج میگزین افق میں شائع ہوا اسی دوران پہلا افسانہ لکھا جو کافی عرصہ بعد "لیل و نہار" میں شائع ہوا اس کے بعد "ادبی دنیا"، "محفل"، "ادب لطیف"، "فنون"، "سیپ"، "کتاب"، "اوراق"، "تخلیق" اور "چہار سو" وغیرہ میں باقاعدگی سے شائع ہوتی رہیں۔ پہلی غزل اخبار امروز اور دوسری ادب لطیف میں شائع ہوئی۔

پسندیدہ قلم کار: جیمز جوائس، ورجینیا وولف، قرۃ العین حیدر، جیلانی بانو، خواجہ احمد عباس، غلام عباس۔

پسندیدہ ہمعصر: رفعت مرتضیٰ، قیصر تمکین، ش صغیر ادیب، شاہدہ احمد، محسنہ جیلانی، صفیہ صدیقی، فیروزہ جعفر اور دیگر کئی۔

تخلیقات: مردہ لمحوں کے زندہ صنم (طویل افسانوں کا مجموعہ) 1980ء، اجلی زمین میلا آسمان (1980 سے 1988 کے افسانے) 1989ء، شیش نگر (شاعری کا مجموعہ) 1998ء، بے سورج بستی (1992 سے 2000 تک کے افسانے) 2001ء۔

قرطاس اعزاز

حمیدہ معین رضوی

کے نام

قوموں اور نسلوں کا عروج و زوال

حمیدہ معین رضوی

آج کا موضوع اردو کے مسائل اور مستقبل سے تا اہم مراد یہ ہے کہ اردو زبان کے مسائل اور اردو زبان کا مستقبل۔ چنانچہ اردو ایک زبان ہے۔ انسان کی تخلیق و گویائی صلاحیت، اظہار خیال کی اہلیت، اس کی انسانی عظمت کا ثبوت ہے۔ کوئی بھی زبان کیوں اور کیسے وجود میں آئی ابھی تک ماہرین اس معاملہ میں خاموش ہیں۔ تاہم آثار و قرائن اور تحقیقات و جستجو سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ کوئی زبان کسی سوچی سمجھی تدبیر، منصوبے اور منصوبے کے مطابق ساخت نہیں کی جا سکتی نہ ہی اس کے لب و لہجے کو پیدا کیا جا سکتا ہے۔

دنیا کی تمام دوسری زبانوں کی طرح اردو مختلف النوع نسلوں، قوموں، تہذیبوں، ثقافتوں، رسموں رواجوں اور مذہبوں کے اختلاط، میل جول، محبتوں، نفرتوں، چاہتوں کی آئینہ دار ہے۔ اردو کی ساخت، تلفظ لفظوں کی تراکیب، صرف و نحو اور لہجے کی شستگی، شائستگی اور فضا قوموں کی صدیوں کی محبتوں کی قصہ خواں ہے۔

اردو کا شجرہ جہاں سنسکرت جیسی زبان سے ملتا ہے جو مغنیوں کی بھی زبان رہی ہے تو دوسری طرف سے اس کا شجرہ فارسی سے بھی ملتا ہے جو اپنی ابتدا ہی سے سنسکرت کی ہی بہن تھی مگر آمد اسلام کے بعد اس نے عربی لباس زیب کر لیا۔ کیونکہ ایران کی اکثریت نے جب اسلام قبول کیا تو اسلامی منطقی اور سائنسی رویہ بھی اپنایا اور عربی ادب سے بھی متاثر ہوئے خصوصاً شاعری سے اور ادب و تحقیق سے انہیں دلچسپی ہوئی۔ ان مسلمانوں کو پرانی فارسی سے دلچسپی نہیں تھی اس لئے اس رسم الخط کو زندہ رکھنے کی ضرورت بھی نہ رہی۔

یاد رہے کہ ریاضی میں صفر کا اضافہ کرنے والا عمر خیام تھا۔ اور عمر خیام نے فارسی میں شاعری کی۔ پہلوی ایرانی میں پڑھے لکھے لوگ ایک تو برائے نام تھے دوسرے عربی بھی زمانہ تھا۔ رسم الخط کا بدل جانا ان کے لئے زیادہ کارآمد ہوا.... کیسے؟.... اس تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔

خود عربی نے تحریر میں کئی زمانے دیکھے ہیں اور نسخ و نستعلیق وقت اور ضرورت کے تحت وجود میں آئی اور ارتقاء کے منازل طے کرتی گئی۔ ہر زبان صدیوں کا فاصلہ طے کر کے تحریر کے ضابطے میں آئی ہے۔ زبانوں کی ارتقا اور اہتمام میں مذہب کا بہت زیادہ ہاتھ رہا ہے اور مذہبی مغنیوں نے تحریری زبان کو نشوونما دی ہے۔ زرتشت کے اقوال پہلوی فارسی میں محفوظ ہیں۔ سنسکرت میں ویدوں کا شاندار اور پروقار انداز اور قرآن عربی کا عجب خیز اور عظیم خطاب۔ توریت کی بدولت عبرانی زبان کی بقا اور تعمیر سے اس نکتے کا ثبوت ہے۔ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ زبان کی تحریر میں اولیت ساری زبانوں کو حاصل ہے اور اگر اردو کی تاریخ پیدائش ڈھونڈی جائے تو یہ آٹھ سو سال پرانی بھی ہو سکتی ہے اور فارسی عربی اور سنسکرت کے رابطے سے اس کو ہزاروں سال پرانی صحیفہ زبان بھی گردانا جا سکتا ہے۔

اردو بہت سی قوموں اور نسلوں کے عروج و زوال کی شاہد ہے اور اس کا ہر لفظ ایک داستان رکھتا ہے۔

اس مقالہ میں میرا موقف یہ ہے کہ اردو کے مسائل خود اردو بولنے والوں کی اس زبان سے غداری سے شروع ہوئے یہ غداری کرنے والے ہندوستان کے ہر مذہب کے لوگ ہیں۔ مسلمانوں پر اس کی ذمہ داری زیادہ ڈالی جا سکتی ہے۔ میرا موقف یہ بھی ہے کہ اردو نہ تو مسلمانوں کی زبان ہے نہ مذہبی زبان ہے۔ اردو میں کوئی صحیفہ نازل نہیں ہوا مسلمانوں کا صحیفہ عربی میں ہے اس حیثیت سے عربی ضرور مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے کیونکہ ہندوؤں، سکھوں، عیسائیوں یا پارسیوں کسی کو بھی عربی سیکھنے اور عرب ممالک میں جا کر پیسہ کمانے میں اعتراض نہیں ہے لیکن اردو کو سیاسی مقصد برآری کے لئے ہندوستان والوں نے اسے مسلمانوں کی زبان ہونے کا الزام دیا اور مسلمانوں نے بے حد احمقانہ انداز میں بخوشی اس فرد جرم کو تسلیم کر لیا۔ انہوں نے پچاس برس تک یہ احتجاج کیوں نہیں کیا کہ یہ الزام تاریخی، معاشرتی، تہذیبی اور منطقی طور پر غلط ہے اردو عوام کی زبان ہے۔

پاکستان میں اردو کے لئے کیا ہوتا ہے؟... اور اسے سیاسی قربان گاہ پر وہاں کیسے استعمال کیا گیا ہے۔ اور بنگالی پر فوقیت دے کر کیا کیا گنوایا گیا ہے اس سے ہندوستان کے اردو بولنے لکھنے والوں کو سروکار نہیں ہونا چاہئے تھا۔ خواہ یہ بولنے لکھنے والے ہندو تھے یا مسلمان۔ اردو بولنے والوں نے ایسی کوئی تحریک کیوں نہیں چلائی جس سے یہ وضاحت ہوتی کہ زبانوں کا مذہب نہیں ہوتا۔ مذہبی نظریات کی زبانوں میں اوضرور ہوئے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اپنی کرسیاں بچانے کے لیے پاکستان میں بھی اردو کو قربان گاہ تک اکھاڑے میں گھسیٹا گیا اور ہندوستان میں خود پنڈت نہرو اور ابوالکلام آزاد جیسے اردو کے درخشندہ آفتابوں نے بھی اردو کو مصلوب کرنے کے فرمان پر دستخط کئے۔ حوالہ کے لئے ماہنامہ شاعر کے جنوری سے جولائی تک کے شمارے پڑھئے۔

اس اقدام کے بعد بھی شاید ان کی کرسیوں کو خطرہ تھا۔ حیدرآباد میں رہی سہی پھلتی پھولتی ارتقا پذیر اردو کی آبرو ریزی کی گئی اور پھر سر عام پھانسی دی گئی۔ اس اقدام کا کوئی منطقی جواز نہیں تھا مگر یہ قدم اٹھایا گیا۔ پنڈت نہرو اور ابوالکلام آزاد بھی اس کی وجہ نہ بتا سکے۔ اردو سے محبت کرنے والوں نے آخر ایک متحدہ تحریک کیوں نہیں چلائی کہ جس میں اردو کے مسائل کا حل ان چار نکات کے مطابق ڈھونڈا جاتا۔

(۱) اردو کسی گروہ کی زبان نہیں۔ یہ یہاں کے بولنے والوں کی زبان

ہے۔

(۲) اردو ہندی کی رقیب نہیں ہے کوئی بیٹی اپنی ماں کی رقیب نہیں ہو سکتی۔

(۳) اردو کو ہندی کے شانہ بشانہ ذریعہ تعلیم اور ذریعہ تعلیم رہنے دینا چاہئے۔

(۴) پاکستان کیا کرتا ہے؟.. اس سے ہندوستانیوں کو کوئی واسطہ نہیں ہے اردو ان کی تہذیب کا ورثہ ہے انہیں اس کی حفاظت کرنی ہے ہندوستانی مسلمان پاکستان سے علیحدہ ایک حقیقت ہیں۔

اردو سے محبت کرنے والوں نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ انہوں نے خود بھی اردو کی سرپرستی چھوڑ دی۔ مجھے ابھی تک یاد ہے بچپن میں ابا کے خطوط آتے تو تاکید ہوتی۔ اردو میں پتہ نہ لکھیے گا اردو میں خط نہ لکھیے گا... جانے کیوں؟....

مسلمانوں نے اردو گھر میں اپنے بچوں کو پڑھانا کیوں چھوڑ دیا؟ کیا ایسا کرنا قانونی جرم تھا؟ ہندوستان دنیا کی بہت بڑی جمہوریت ہے پھر اس ردعمل کا کیا مطلب تھا؟ کہ گھروں سے خود اردو بولنے لکھنے والوں نے اردو کے جنازے نکالے آخر گھروں میں اردو پڑھانے کا رواج رکھا جاتا تو کیا نقصان تھا؟ اردو سے محبت کرنے والوں نے ایسا نہیں کیا۔

ہندوستان سے آئے ادیبوں نے جن میں ڈاکٹر رانگ بھی شامل ہیں بار بار ہندوستان کے بجٹ میں اردو کے لئے مخصوص کی جانے والی رقم کا ذکر کیا اور اس کا مقابلہ پاکستان کے بجٹ سے کیا ہے یہ مقابلہ بے مقصد اور غیر منطقی ہی نہیں احمقانہ بھی ہے اسے آج کی زبان میں گپّی کا کھیل کہا جاتا ہے اس رقم سے کتنے اردو ذریعہ تعلیم کے اسکول کھلے اور کتنے بزرگ کھایا کروڑ بچے اردو میں سند لے کر نکلے ہیں اس کا ذکر کبھی نہیں ہوا۔ وہ رقم کن اردو کے غدار مسلمانوں کی جیبوں میں گئی۔ کن لوگوں پر خرچ ہوئی ہے حوالہ کے لئے اس پر بھی سو ادشاعر کے شماروں میں مل جائے گا۔ مقابلہ بازی کرتے ہوئے ہندوستان کے اہل دانش یہ نہیں یاد رکھتے کہ پاکستان بننے سے عرصں پہلے سے پاکستانی علاقے میں پنجابی سرائیکی پشتو اور سندھی کے ساتھ ساتھ اردو ذریعہ تعلیم رہی ہے اور آج بھی ہے ان سب کا رسم الخط بھی ملتا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ اردو کے لئے ذریعہ تعلیم حاصل کرکے اہم مقام پیدا کرنا پہلے بھی مشکل تھا مگر کیا جا سکتا تھا۔ اب اور مشکل ہو گیا ہے کہ نظام تعلیم اور وسائل بڑھتی ہوئے آبادی کا ساتھ نہیں دے پا رہے ہیں معیار تعلیم گر گیا ہے۔ یہ بھی غلطی خود اردو سے محبت کرنے والوں کی ہے۔ جو اردو میں لکھتے ہیں ریڈیو میں ٹی وی پر اردو پروگرام کرتے ہیں اور اپنے بچوں کو انگریزی سکولوں میں بھیجتے ہیں اور ان کے بچے گھروں میں نہ صرف انگریزی بولتے ہیں بلکہ اردو کو نوکروں کی زبان سمجھتے ہیں۔

اب برطانیہ میں اردو کی المناک موت کو بھی تھوڑا ذکر ہو جائے۔

میں اس ملک میں اوائل اڑسٹھ میں آئی تھی۔ 1969ء کے اوائل میں میں نے ILEA کے تحت معلمی کی نوکری شروع کی اور مجھے آل گیٹ کے ایک سکول میں بھیجا گیا۔ تو منظر ا سرپوں تھا۔ اسکول میں پچیس فیصد بچے انگریز تھے وہ سب انتہائی غریب بے روزگار یا عام مزدوری کرنے والوں کے بچے تھے باقی پچھتر فی صد بچے بنگالی سری لنکن پاکستانی پنجابی بولنے والے مسلمان ہندوستانی پنجابی بولنے والے سکھ پشتو بولنے والے اردو بولنے والے ترکی بولنے والے پولش بولنے والے اور چند یہودی بچے تھے جو نہایت ذہین تھے اور جن کا بول بالا تھا کہ اسکول کی نائب ہیڈ مسٹریس بھی یہودی تھیں۔ تعلیمی لحاظ سے لیس ہونے کے باوجود عمر اور تجربے کی کمی کے باعث میں پگھلا گئی تھی۔ ایسے میں میرے سپرد پنجابی ہندی اردو بولنے والے بچوں کے والدین سے رابطے کی ترجمانی بھی ہوتی۔ ماضی میں گھوم کر دیکھتی ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پچھتر فی صد بچے ایسے کند ذہن نہیں تھے جیسے انہیں ظاہر کیا جاتا تھا۔ سٹاف روم میں اساتذہ ان بچوں کی کند ذہنی ان کے عادات و خصائل اور ان کے والدین کا بے جھجک مذاق اڑاتیں اور میں تک تک دیدم دم نہ کشیدم دل میں کڑھتی۔ مجھے ہدایت تھی کہ میں والدین کو تاکید کروں کہ وہ بچوں سے اپنی زبان میں بالکل گفتگو نہ کریں۔ بیچاری عورتیں حیرت سے آنکھیں پھاڑتیں۔

بھلی جی اسی نیں کیہڑے سانوں تے انگریزی نئیں آؤندی۔

اور بھلی جی خود آنکھیں پھاڑے خاموش رہتیں۔ اسکول کا حکم تھا کیا کرتی۔

اسکول کے اساتذہ کی یہ بھی پیش گوئی ہوتی کہ ان بچوں میں سوائے چند یہودی بچوں کے کوئی بھی سیکنڈری اسکول سے آگے نہ پڑھ سکے گا۔ بہر حال برطانیہ کو مزدور چاہئے۔ یہ بچے مزدور اچھے ہوں گے... اساتذہ بہت بلندی سے کہتی سنائی دیتیں۔

اس طبقاتی برتری کا دماغی کیڑا... اور ہر ایک سے استہزائی رویہ مجھے بہت دکھ دیتا۔ عجب بات کہ اس استہزائی رویہ کی حمایت میں ان دو کتابوں اور مصنفین کا تذکرہ ضرور ہوتا ہے۔ Olto Jeperson کی کتاب The Language جس نے دنیا بھر کے ماہرین لسانیات کو سوچ دیا تھا کہ وہ ایک زبان سیکھنے پر اکتفا کریں کیونکہ دو زبانیں سیکھنا عقل و ذہانت کو گھٹاتا ہے اور دماغ کو کمزور کرتا ہے تارکِ وطن بچے اسی لئے تعلیم میں پیچھے ہیں۔ اس زمانے میں انگریز اساتذہ زیادہ تر وہ تھیں جو ایجوکیشن کالجوں سے خود دس دس سال پہلے نکلی تھیں اور لکیر کی فقیر تھیں اور مصر تھیں کہ مکمل انضمام ہی تارکین وطن بچوں کی نجات کا ذریعہ ہے یعنی Total Assimilation۔

حالانکہ سوئٹزرلینڈ کے ڈی ریسکلا نے جیسپرسن کے خیال کو مسترد کر دیا تھا اور اس کی دلیلیں مکمل ضم کئے جانے کے خلاف تھیں۔ اس کی تحقیقی کتابیں بازار میں آ چکی تھیں۔ علاوہ بیل اور والس لیمرٹ کی کتاب The

Foundation of Language - (1962) آ چکی تھی جس میں لکھا تھا۔

"ہماری ریسرچ کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ بچوں کو دو زبانیں یا اس سے زیادہ زبانیں ساتھ ساتھ لکھنا پڑھنا اور بولنا سکھایا جائے تو اس سے ذہنی گھٹن کے بجائے ذہنی وسعت پیدا ہوتی ہے ان کے نقطۂ نظر میں ذہنی وسعت و پختگی اور زیادہ سے زیادہ الفاظ استعمال کرنے کی قوت اور مشاہدہ اور اظہار کی صلاحیت اور اہلیت میں اضافہ ہوتا ہے"

برطانیہ میں 1965ء سے پچھتر تک پروان چڑھنے والی نسل تعلیمی لحاظ سے پس ماندہ اور معاشی لحاظ سے درماندہ رہ گئی۔ اس کے علاوہ ان کے اپنے والدین سے دوری پیدا ہوئی۔ سوائے چند بچوں کے جو پرائیویٹ اسکول گئے اور انہوں نے یونیورسٹی کی شکل دیکھی۔

جس وقت اسکولوں میں بچوں اور ان کے والدین پر کرب کی کیفیت گذر رہی تھی اس کے شانہ بشانہ شاعر سے منعقد ہو رہے تھے۔ جن کا بنیادی مقصد تفریح تھا کیونکہ یہی شاعر و شاعرات یا ادیب مرد و زن خود اپنے بچوں کو اردو نہیں سکھا رہی تھیں۔ جس کا دل چاہے تحقیق کرے کہ ادیبوں شاعروں کے بچے کتنی اردو جانتے ہیں کیا یہ حقیقت میرے موقف کو صحیح ثابت نہیں کرتا کہ اردو کو برباد کرنے والے خود اردو کے اہل زبان ہیں۔ باہر کے دشمن سے مقابلہ بھی ہو سکتا ہے بچاؤ بھی گھر کے دشمنوں سے کوئی نہیں ہو سکتا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جب نسلی مساوات کا قانون پارلیمنٹ میں منظور ہوا اور نسلی مساوات کی انجمنیں وجود میں لائی گئیں تو اقلیتوں کی زبانوں کی تعلیم کا بھی تذکرہ چلا اور شمالی برطانیہ میں اردو کی تعلیم اسکول میں شروع ہوئی جب کہ یہودی بچے 1960ء سے اپنے مذہبی اسکولوں میں عبرانی کی تعلیم لے رہے تھے۔ 1975ء میں جب میں نے ایجوکیشن کے پوسٹ گریجویٹ کورس کے لیے یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو اس وقت مختلف النسل اور مختلف الزبان بچوں کو پڑھانے کے لئے ایک خاص مضمون کا اضافہ کیا جا چکا تھا اور اس مضمون میں مکمل انضمام یعنی تارکین وطن کے بچوں کو زبردستی انگریز بنانے کی سابقہ روش پر کڑی نکتہ چینی کی گئی تھی۔ وہ روش جو میں نے 1969ء میں دیکھی تھی کہ اب یہ کہا جا رہا تھا کہ اپنی زبان نہ جاننے کی وجہ سے بچوں میں محرومی والدین سے دوری جوش و خروش میں کمی درماندگی پیدا ہوئی ہے اور وہ بچے تعلیمی لحاظ سے پیچھے رہ گئے ہیں۔

کیرولائن کیسلر اور یہودی نژاد خاتون مس Zeev نے وافر تحقیقات اس ضمن میں مہیا کی ہیں کہ بچوں کو بہت چھوٹی عمر سے گھر پر اپنی زبان میں پڑھنے لکھنے کی تعلیم دی جائے تو وہ بہت جلد گھر کی زبان اور ذریعہ تعلیم کی زبان میں نہ صرف یہ کہ مہارت پیدا کر سکتے ہیں بلکہ مہارت کی وجہ سے دوسرے مضامین میں اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ جن لوگوں کو اردو سے دلچسپی ہو وہ یہ کتاب ضرور پڑھیں:

(1) A guide to family reading in two language by Theodone Anderson-1981

(2) Language in Bilingual comminuties by Dervick Sharp - 1973

(3) Bilingual Children from Birth to Teen - George Sanders

اس کی تجاویز پر عمل کر کے لوگ اپنے پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کو پڑھا کر اپنی تساہلی کا کفارہ بھی ادا کر سکتے ہیں اور اپ گریڈ اردو کو زندہ کر کے اس کے مسائل بھی حل کر سکتے ہیں۔

نسلی امتیاز کے قانون کے بعد اردو لندن کے سرکاری اسکولوں میں بھی شروع کر دی گئی ہے گو کہ اردو پڑھانے والوں کو وہ وقار حاصل نہیں ہوتا جو دوسرے اساتذہ کو ہوتا ہے۔ راقم الحروف کی سرکردگی میں ایک جماعت منتخب ہوئی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ اردو کو جدید غیر ملکی زبانوں کے ہم پلہ کرنے کے لئے اس کا جدید نصاب اور کتابیں مرتب کی جائیں لیکن اس کے کام کرنے والوں میں پچاس فیصد وہ تھے جو اردو کے ماہر تھے لیکن جدید طریقۂ تعلیم سے کورے تھے اور پچاس فیصد وہ تھے جنہیں جدید طریقۂ تعلیم کا تو علم تھا لیکن اردو کی ساخت مزاج طبیعت اور صرف و نحو سے ناواقف تھے لہٰذا یہ منصوبہ ناکام ہو گیا۔ آج بھی اے لیول کا نصاب جدید زندگی اور اس سے متعلق ادب سے کوسوں دور ہے۔ بابا آدم کے زمانے کے ادب پر مشتمل ہے جو طلبا دل سے پڑھتے ہیں اور رٹ کر امتحان کو کوس کوس کر امتحان دیتے ہیں اور کورے کے کورے رہ جاتے ہیں۔ سوچئے ذرا امراؤ جان ادا اور چوتھی کے جوڑے سے آج کے بچوں کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اردو کے صاحب اقتدار لوگ آج تک نصاب کے مسائل بھی حل نہ کر سکے اور وہ کیا کریں گے۔

بہت سے لوگوں نے اردو کے رسم الخط کو اردو کی موت کا ذمہ دار قرار دیا ہے میں سمجھتی ہوں یہ چند کاہل اور احساس کمتری کے مارے ہوئے لوگوں کا شوشہ ہے۔ اگر عبرانی، فارسی اور عربی زندہ رہ سکتی ہیں تو اردو کے زندہ رہنے میں کونسی چیز حائل ہے۔ ہندوستان میں اردو کو اور جرمنی میں یہودیوں کو اگر ایک منصوبہ بندی کے ساتھ کچلا گیا تو یہ اردو کے اہل زبان کے لئے کوئی منطقی جواز نہیں ہے کہ وہ خود ہی اپنی گردن میں پھانسی کے لئے پھندے ڈال لیں۔

میرا پیشہ معلمی ہے عام قومی مضامین اور نصاب بھی میں نے پڑھایا ہے اور انگریزی میں کمزور بچوں کو تصویر کے ذریعے بھی انگریزی پڑھائی ہے یہ سب بچے مختلف نسلوں اور قومیت سے تعلق رکھنے والوں کے بچے تھے۔ اردو بولنے والوں کو ترجمے کے طریقے سے پڑھانا نسبتاً آسان رہا ہے۔ میں نے تعلیم بالغان کے کالج میں بھی کافی عرصہ انگریزی پڑھائی ہے یہاں انگریزی

غیر ملکی زبان کی حیثیت میں بھی پڑھاتی ہے پھر جب دس گیارہ سال میں نے اردو کی کلاسیں شروع کیں تو زیادہ تر بچے ایسے ہی تھے جو کم از کم اردو بول سکتے تھے۔ وہ آسانی کے ساتھ او لیول کر گئے۔ گذشتہ پانچ برسوں سے ایسے بچے اسکول میں آنے شروع ہوئے جن کے دادا دادی تو اردو بولتے ہیں لیکن ماں باپ اردو نہیں جانتے یہاں بہت بڑا مسئلہ پیدا ہوا اس کے لئے اردو غیر ملکی زبان کی حیثیت سے پڑھائی جاری ہے۔ میں تقریباً روزی work sheet بھی استعمال کر لیتی ہوں جو غیر ملکیوں کو انگریزی سکھانے میں استعمال کرتی ہوں خصوصاً بول چال کے لئے۔ بچوں کو ہر لفظ کا ترجمہ لکھوایا جاتا ہے۔ جلد ہی املا ٹیسٹ بھی شروع کیا جائے گا میں انگریزی کے حروف تہجی سے فائدہ اٹھاتی ہوں۔ اس کے باوجود کا اور کھا۔ با بھی دفعہ اور بھا رومن میں انہیں پہچان کرنے میں بہت وقت لگتا ہے۔ عربی کے حروف بچے فوراً سیکھ لیتے ہیں۔ اور انہیں ادا کرنے پہچاننے اور لکھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ رومن املا سے انہیں تلفظ سیکھنے میں زیادہ پریشانی ہوتی ہے۔ البتہ جب بچے ایک دفعہ اردو پڑھنے لگتے ہیں اور ان کی الفاظ سے شناسائی ہو جاتی ہے تو پھر وہ ضرور ان الفاظ کو رومن میں بھی لکھ لیتے ہیں جیسے انجام Anjaam۔ پھر End بھی اپنے طور پر لکھ لیتے ہیں اور اس کی حیثیت ذاتی نوٹس کی سی ہوتی ہے گذشتہ اردو کے تقریری مقابلہ میں او لیول کے بچوں نے پوری تقریر اردو میں لکھی اور بولی اور وہ بچے جن کی زبان انگریزی تھی اور والدین بھی انگریزی بولتے ہیں انہوں نے تقریر اردو میں لکھی مگر اس کے کافی حصے کو رومن میں لکھ لیا۔ یہ بچے 10 سے 13 سال کے ہیں۔ اور یہ بچے نے اپنے طور پر رومن میں لکھا تھا۔ جو ان کے خیال میں صرف وہ پڑھ سکتے تھے۔ جو اور فقرے البتہ میں نے انہیں رومن میں لکھوائی تھی اور وہ بھی اس وقت جب اردو میں انہوں نے تلفظ کی اچھی طرح مشق کر لی تھی۔

جیسے انگریزی سیکھنے والے وہ مرد اور خواتین جنہوں نے کبھی پاکستان میں انگریزی نہیں سیکھی تھی مگر اردو پڑھ سکتے تھے ان کو میں انگریزی الفاظ کا اردو میں ترجمہ بتاتی تھی اور وہ معانی کے ساتھ تیسرے خانے میں اردو میں اردو تلفظ لکھتے تھے جیسے لفظ بیوٹی فُل ہے۔ جب میں نے انہیں اس طرح لکھتے دیکھا اور اس سے انہیں فائدہ ہوتے ہوئے بھی دیکھا تو میں تاکید کرتی کہ زیر زبر پیش بھی لگائیں تاکہ beautiful بیوٹی فل نہ ہو جائے۔

کورین، جاپانی، عرب، ایرانی سب انگریزی الفاظ کے ڈکشنری سے معانی دیکھ کر لکھتے اور پھر تلفظ بھی لکھ لیتے۔ انگریزی گرامر اور صرف و نحو غیر ملکی کو انتہائی مشکل محسوس ہوتی ہے۔ تو کہنے کا مطلب یہاں یہ ہے کہ دوسری زبان سیکھنا اور سکھانا خود کوئی زبان ہوا آسان نہیں ہے مگر لوگ ہر ایک دوسرے کی زبانیں سیکھتے ہیں اور مہارت حاصل کر لیتے ہیں۔ اور یہ ہماری انسانی صلاحیت ہے۔

انگریزوں کو اردو پڑھاتے ہوئے میں بالکل انگریزی کی طرح نصاب ترتیب دیتی تھی یعنی پہلے سال صرف بول چال، زمانے، کھانوں کے نام، پسند ناپسند، پوچھنا، رشتہ دار، تہوار اور رنگ۔ یہ سب میں رومن یعنی انگریزی میں سکھاتی اور جیسے آسان ’اور کہاں‘ میں اور میں کا فرق بتایا واضح کرتی مگر وہ طلبا بار بار تلفظ بھولتے۔ دوسرے سال جب کہ وہ تقریباً سو الفاظ سے واقف ہو چکے تھے تب میں نے حروف تہجی سکھائے جس میں انہیں دقت نہیں ہوئی۔

رومن رسم الخط کو اردو کی مدد کے لئے استعمال کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے لیکن چند موٹے دماغ والے احمقوں کے لئے جنہیں زبان پڑھانے اور پڑھنے کی صلاحیت نہیں ان کی آسانی کے لیے ایک خوبصورت زبان کی تحریر کو بدل دینا اس کو مسخ کر دینا اس کے تلفظ کو بگاڑ دینا دانشمندی نہیں ہے۔

اگر دائیں سے بائیں لکھی جانے والی عبرانی زبان چار ہزار سال کی مسافت طے کر کے اپنا وجود منوا سکتی ہے عربی اور فارسی دو تین ہزار سال سے زندہ ہیں اور جب تک دنیا زندہ رہیں گی تو پھر اردو کے رسم الخط کو دار پر چڑھانے کا کیا جواز ہے؟

آخر میں ایک تجزیہ اور بیان کروں گی۔ بہت سے لوگ ترکی کی مثال دیتے ہیں ان کی حالت اس اندھے کی طرح ہے جو ہاتھی کی دم ہاتھ آجانے پر سمجھتا ہے کہ ہاتھی رسی کی طرح لمبی اور بال والی کوئی چیز ہے حقیقت یہ ہے کہ کمال اتاترک نے ترک قوم کی زبان چھین کر وہی سلوک کیا جو ہٹلر نے یہودیوں کو گیس چیمبر میں بھیج کر کیا۔

قوم سے وعدہ کیا گیا کہ خلافت جمہوریت کی دشمن ہے اس لئے اسے ختم کرنا ہے لیکن خلافت ختم کر کے آمریت نافذ کی گئی۔ خیال، فکر، تقریر و تحریر کی آزادی سلب کی گئی اور تمام مخالفین کو تختۂ مشق بنایا گیا۔ انسانی حقوق کو پامال کیا گیا اور یہ پامالی اب بھی روز افزوں ہے۔ خلافت کا جوا اتار کر مغرب کی غلامی کا طوق ہمیشہ کے لئے پہن لیا گیا۔ 70 سال میں کبھی آزادانہ رائے شماری نہیں ہوئی۔ جمہوریت کا مذاق اڑا رہا۔ زبان چھین لی گئی۔ کردوں پر آئے دن بمباری ہوتی ہے۔ تعلیم کا اوسط عام غریب ایشیائی ملکوں سے بھی کم ہے۔ عورتوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک کیا جاتا ہے۔ یہ 1993ء میں ٹیلی گراف کی ایک رپورٹ میں ذکر ہے۔ انسانی حقوق کا کمیشن بار بار شکایت کرتا ہے کہ سیاسی مخالفین پر ترکی میں تشدد ہو رہا ہے لیکن...... ترکی نیٹو میں ہے اور یہ ایک بات اس کے سارے جرائم دھونے کو کافی ہے۔ یہی نہیں گذشتہ ساٹھ ستر سال میں ترکی نے کوئی دانشور، کوئی سائنسدان پیدا نہیں کیا۔ ترکی کا کوئی ادیب بین الاقوامی شہرت کا حامل نہیں ہے۔ ترکی نے کوئی نوبل انعام حاصل نہیں کیا۔ اپنی زبان، شاعری، ادب، تاریخ، عزت، قدر و منزلت دریا برد کرنے کے بعد ترکی نے

کیا حاصل کیا جس پر فخر کیا جاسکتا ہے۔ پرانی زبان کے ساتھ ترکوں نے دنیا کو بہت کچھ دیا تھا۔ ترکی کی مثال دینا اور سامنے رکھنا بشری بے بسی کو سر اٹھانا ہے اور میں ترکی کی مثال کو اس قابل نہیں سمجھتی کہ اسے سنجیدگی سے دیکھا جائے۔ ترکی کے شہر استنبول میں دو ہفتے کے لئے گئی تو جہاز سے اترتے ہی یونیفارم میں کیا فائرنگ سکواڈ کھڑا تھا پھر وہ سائے کی طرح لگے رہے شکر ہے ہوٹل تک نہیں آئے۔ دو چار دنوں بعد معلوم ہوا کہ یہاں ہمیشہ فوجی سر پر سوار رہتے ہیں۔ لوگ ایسے بات کرتے جیسے کانا کے اول "ڈی ٹرائنگل" میں کرتے ہیں۔ یہ جبر یہ خوف یہ تشدد یہ زبان بندی یہ ذہنی قتل ثقافت، مذہب، روحانیت بدلنے کا نتیجہ ہے یہ میرا ہی خیال نہیں ہے ترکی کے لوگوں نے خود یہ بات مجھ سے کی۔ رسم الخط بدلنے سے قوم کا مزاج بدل جاتا ہے اس سے آپ کو میرے موقف کی حمایت کرنی ہوگی کہ اردو، سنسکرت، ہندی، فارسی، عربی کے میل ملاپ سے صدیوں میں وجود میں آئی۔ اس کے رسم الخط میں اس کے صوتی اثرات اور تلفظ کی صحیح نمائندگی ہوتی ہے جو رومن میں ناممکن ہے۔ یہ مسلمانوں کی زبان نہیں ہے کہ زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ نہ ہی زبان میں صحیفے نازل ہوئے ہیں۔ اردو میں ہندو مسلمان کسی کا بھی صحیفہ نازل نہیں ہوا۔ اردو پہ سارے حوالوں ذمہ داری خود اردو کے ادیبوں پر عائد ہوتی ہے خواہ یہ ابوالکلام آزاد ہوں، پنڈت نہرو ہوں، عبدالحق ہوں یا عام بولی کے اردو بولنے والے ہوں۔

پاکستان میں اردو کو سیاسی تعصب پھیلانے اور سیاسی مطلب حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا گیا تا کہ کرسیاں محفوظ رہیں۔ اردو پورے پاکستان میں ذریعہ تعلیم ہے ہر جگہ بولی سمجھی جاتی ہے لیکن عزت آج بھی انگریزی کو حاصل ہے اور ملک کے نوے فیصد پڑھے لکھے والی اور بولی جانے والی زبان کو عزت حاصل نہیں اور خود برطانیہ میں بھی اس زبان کو عام کرنے کے لئے اردو کے ادیب اور شاعروں نے ابھی تک کوئی مثبت کارنامہ سرانجام نہیں دیا۔

آج اردو کو زندہ رکھنے کے لئے نوجوان والدین میں اردو کا رواج عام کرنے کی ضرورت ہے۔

ویسے دشمنان اردو کے لئے عرض ہے کہ برطانیہ آ کر جیسے ترک افغان عرب یوگنڈین وغیرہ اپنی زبانوں کو بھول چکے ہیں تو ان کے اس عمل سے ان کے اپنے ملک میں یہ زبانیں ختم نہیں ہوں گی اسی طرح برطانیہ کے دو چار لاکھ اردو بولنے والے اگر مر بھی چکیں گے اور ان کے بچے بھی اردو نہیں بولیں گے تب بھی اردو مر نہیں جائے گی اردو زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔ جیسے پاکستان زندہ ہے اور رہے گا اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود.... اس لئے کسی کو بغلیں بجانے کی ضرورت نہیں۔ زبان کو پیدا ہونے میں صدیاں لگتی ہیں... مگر ختم ہونے میں کون جانے۔ یہ اور بات ہے کہ اردو کی محفلیں نہیں ہوں گی برطانیہ سے شاعروں کے دعوت نامے نہیں بھیجے جائیں گے۔

براہِ راست

"قرطاسِ ابرق" ادبی صحت کا حامل ایسا آئینہ ہے جس میں اپنے عصر کے Living Legend کو ایک جلد میں محفوظ کر کے تحقیق و جستجو کے حامل افراد کو سہولت مہیا کرنا دراصل منفرد نظر کی توجہ اپنے تخلیق کاروں کی جانب مبذول کرنا ہے جو ادب نے اعلیٰ پائے کا تخلیق کر رہے ہیں تو جو اپنے استحقاق سے کم پا رہے ہیں......!

محترمہ حمیدہ معین رضوی اسی قبیل کی مہذب، محقق، ادیبہ، نقاد اور شائستہ تخلیق کار ہیں جو زندگی کی تمام تر سچائیوں کو ساتھ لے کر "اردو ادب" کو سینچنے کے باوجود تاحال وہ قرب حاصل نہ کر پائی ہیں جس کا تقاضا اُن کی تخلیقات ہم سے کر رہی ہیں......!! زیرِ نظر شمارے میں محترمہ حمیدہ معین رضوی کا ایک گوشہ پیش کیا جا رہا ہے جس سے حق بجانب ادارے کے بہت سے تقاضے پورے ہونے کی اُمید باندھی جا سکتی ہے......!!!

گلزار جاوید

☆ والد محترم کی حوصلہ افزائی کے علاوہ کس جذبے اور تحریک کے زیرِ اثر قلم اُٹھانے پر مجبور ہوئیں؟

☆☆ مجھے کچھ یاد نہیں، اتنا معلوم ہے کہ میں نے کچھ اچھے مضامین لکھ کر والد صاحب کو دکھائے اس سے ان کو خیال گزرا کہ میرے اندر کچھ صلاحیتیں ہیں اور یوں انہوں نے گھر میں ادبی رسالے جاری کروا دیے۔ اچھے مضامین لکھنے کا سلسلہ یوں ہوا کہ میں نے بہت چھوٹی عمر میں والد صاحب سے پڑھ کر فارسی پر عبور حاصل کر لیا تھا اس لیے آٹھویں جماعت کے ساتھ منشی کا امتحان بھی دیا۔ یوں فارسی ادب کے لیے شبلی کی شعر العجم، چار مقالہ اور اسی طرح کی چند اور کتابیں پڑھیں۔ اسی زمانے میں ایک مضمون لکھا تھا اسلام، اقبال اور اشتراکیت۔ جسے دیکھ کر والد صاحب متاثر ہوئے تھے یہ مضمون جب کالج کے سال اول میں پہنچی تو کالج میگزین "افق" میں شائع ہوا تھا آٹھویں میں ہی میں نے شاعری شروع کی۔ جسے والد صاحب نے پسند نہیں کیا اور کہا کہ میں اس پر وقت ضائع نہ کروں۔ پھر میں نے ایک مزاحیہ کہانی بھی لکھی تھی جو شاید "علم و ادب" یا "تعلیم و تربیت" میں چھپی تھی "کنول اور پھول" میں بھی۔ شاید انعامی مقابلہ جیتا تھا یوں سلسلہ شروع ہوا۔

☆ ہر کام کرنے کا کوئی مقصد یا ہدف ہوا کرتا ہے آپ کے ہاں وہ مقاصد اور اہداف کیا ہیں؟

☆☆ چار دہائیوں قبل جب میں ادب کے میدان میں آئی تو میری عمر اور تجربے میں کسی مربوط فلسفۂ فن کے ادراک کی گنجائش نہیں تھی سوائے اس کے کہ ادب کا تعلق فن سے ہے۔ فن تخلیق کار کو تخلیق پر مجبور کرتا ہے۔ اسی مجبوری کے تحت میں نے بھی لکھا ہو گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جیسے سارتر نے کہا کہ فنکار کے مرنے کے بعد باقی رہنے کی لاشعوری خواہش نے لکھنے پر مجبور کیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی فن دیدہ وری کی تلاش میں رہتا ہے ادب میں یہ کردار قاری ادا کرتا ہے۔ یعنی فنکار کی یہ خواہش کہ اس کے خیالات جب اظہار کے سانچے میں ڈھلیں تو دوسروں تک پہنچیں۔ اپنے خیالات اور فنی سانچے دوسروں تک پہنچانے کی مسرت بذاتِ خود ایک مقصد ہے اور اب میں یہ کہہ سکتی ہوں ادبی فن پارے کی تخلیق کی تکمیل صرف پڑھے جانے میں ہے۔ قاری کے شعور کے ذریعے فنکار کا جو بیان ہوتا ہے وہ اس کی قدر متعین کرتا ہے اور فنکار کو مسرت بخشتا ہے یہ مسرت بذاتِ خود تخلیق کا لاشعوری ہدف ہو سکتا ہے۔ جمالیاتی مسرت کا حصول بھی ایک مقصد ہو سکتا ہے جب میں نے لکھنا شروع کیا تو ممکن ہے ان میں سے کوئی ایک وجہ ہو یا سب کی سب ہوں۔ لیکن اب میرے ادبی مقاصد یہ ہیں کہ میں اپنے اظہار کی آزادی کے ساتھ زندگی کی کشمکش، کشاکشی اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل کا مشاہدہ کروں پھر ان کو قلم بند کر کے قاری کو اپنے تجربات میں شریک کروں کہ ادب شخصیت کے ذریعے زندگی کا اظہار ہے۔ میں اب اس شعور کے ساتھ قلم اٹھاتی ہوں کہ زندگی کی مثبت قدروں کو عام کروں۔

☆ کب اور کس ذریعے سے آپ کی ادبی حیثیت کنفرم ہوئی؟ اور اس وقت آپ کے احساسات کیا تھے؟

☆☆ میرا پہلا افسانہ "رقیب" تھا۔ جو ایک سچے واقعے سے متاثر ہو کر لکھا تھا اس میں کچھ ہم جنس پرستی کی طرف اشارے تھے۔ تقریباً دو برس بعد "لیل و نہار" میں چھپنے کے لیے بھیجا جس کے چیف ایڈیٹر فیض صاحب تھے اور مدیر صوفی تبسم۔ پھر جلد ہی کئی افسانے لکھے "فنون"، "ادبِ لطیف"، "نقوش"، "ادبی دنیا" اور "سیپ" میں آگے پیچھے چھپے۔ اس کے بعد قاسمی صاحب نے رائٹرز گلڈ کا ممبر بنوا دیا۔ جب "اوراق" شائع ہونا شروع ہوا تو "اوراق" میں لکھنا شروع کیا۔ جس کے بعد "فنون" والوں نے مجھے چھاپنا بند کر دیا۔ ان سب کا اندازہ مجھے مدتوں بعد ہوا۔ تین برس میں میں نے تقریباً ۲۰ بیس افسانے لکھے تھے جو چھپ چکے تھے میرے خیال میں اس وقت میری ادبی حیثیت مسلم ہو چکی تھی۔ بہت سے بہت بڑے نقاد جو اس وقت بڑے نہیں تھے انہوں نے تعریفی خطوط لکھے تھے یقیناً ان چیزوں نے مجھے اعتماد بخشا اور مسرت اور حیرانی بھی ہوئی جو فن تخلیق کر کے حاصل ہوتی ہے۔

☆ شادی کے بعد آپ کے شوہرِ نامدار جناب معین رضوی کا آپ کے قلمی سفر کی بابت رویہ کیسا تھا؟ آپ اُن کو کس قدر کریڈٹ دینا پسند کریں گی اپنی کامیاب ادبی زندگی کا؟

☆☆ شادی میرے لیے ایسا واقعہ ثابت ہوئی جس کی وجہ سے میں قافلے سے بہت پیچھے چلی گئی اگر میرے شوہر میرے ذوق اور ادب کے قدر دان ہوتے تو میرے افسانوں کا پہلا مجموعہ ۱۹۶۸ء میں ہی چھپ گیا ہوتا۔ بلکہ شادی کے بعد جو افسانے میں نے لکھے وہ بھی پاکستان جا کر لکھے۔ بچوں کی آمد، صحت کی خرابی، اظہار کی پابندی...... نو دس برس میں نے ڈپریشن کی گولیوں میں گزارے۔ دو حضرات نے مجھے لکھنے کی دوبارہ تحریک دی۔ علی سردار جعفری اور کمار پاشی دونوں نے مجھے ڈانٹ پلائی کہ وہ دونوں میرے افسانوں کے فین ہیں۔ اور کس وجہ سے میں نے لکھنا چھوڑا ہے؟ سردار جعفری پہلی بار بحرین میں ملے اور کمار پاشی "شعر و حکمت" میں ملے تھے۔ میں فیصلہ آپ پر چھوڑتی ہوں کریڈٹ کا۔ فنکار کے اظہار کی ضرورت ایک طوفان ہے پاگل کی سی مثال لیجیے۔ تصویر بنانے پر پابندی لگی تو ریاضی کی اشکال میں اظہار ڈھونڈا۔

☆ آپ کو اپنی شناخت کا کونسا حوالہ پسند ہے؟ عورت، ماں، بیٹی،

ہے یا صرف ایک قلم کار اور قلم کار کی حیثیت میں کونسا حوالہ آپ کو پسند ہے؟

☆☆ میں سب سے پہلے ایک عورت ہوں اور مجھے اس پر فخر ہے پھر قلم کار ہوں۔ اور میں ایک ایسا مضبوط اخلاقی نظام رکھتی ہوں جس میں منافقت سب سے بڑا گناہ ہے۔ میں سچ کہوں گی خواہ کتنا ہی نقصان ہو۔ مصلحت آمیز جھوٹ کی بھی میں قائل نہیں میرے حصے میں اب تک اس وجہ سے خسارے ہی آئے ہیں۔ اس کی دو بڑی وجوہات ہیں میری دینی تربیت اور مغرب کا سازگار ماحول۔ بہرحال یہی میرا حوالہ ہے۔ فنکار بس فنکار ہوتا ہے یا ہوتی ہے... باقی فیصلہ دوسرے کر سکتے ہیں۔

☆ پاکستان اور انگلستان کے ادبی حلقوں اور تخلیق ہونے والے ادب کا موازنہ کس طرح کریں گی؟

☆☆ انگلستان میں افسانہ لکھنے والی زیادہ تر خواتین ہیں ان کے موضوعات پاکستان کے لکھنے والوں سے زیادہ حقیقی ہیں۔ ان کا مشاہدہ بھی زیادہ سچا ہے اور اس حیثیت سے وہ پاکستان کے اوسط لکھنے والوں سے بہتر ہیں۔ لوگ ان کے افسانوں میں نئی تکنیک نہیں ہے نہ ہی کسی اور اشارے کنایے سے تہہ داری پیدا کر سکی ہیں۔ یہاں برٹش مشیر ادیب قیصر تمکین بہت اچھا لکھتے ہیں۔ صفیہ صدیقی، محسنہ جیلانی، عطیہ خان، شاہدہ احمد، انور نسرین، یہ لوگ مدت دراز سے لکھ رہی ہیں پروین لاشاری اور نجمہ عثمان نے بھی افسانہ لکھنا شروع کیا ہے اپنے اپنے رنگ میں سب اچھا لکھ رہے ہیں۔ یہاں لکھے گئے افسانے خاص طور پر قیصر تمکین کے افسانے چونکا دینے والے بھی ہیں باقی جتیندر بلو نے غالباً میری طرح اوراق کی اشاعت کے آغاز سے ہی لکھنا شروع کیا اور بہت پختہ لکھنے والے ہیں۔ مقصود الٰہی شیخ نے دھیرے دھیرے اور مسلسل لکھا ہے ان کی کتاب "برف کے آنسو" سے اب نئے افسانے تک کامیاب سفر طے کیا ہے۔ باقی خواتین جو بھی لکھ رہی ہیں ان کی اشاعت ہو رہی ہے اور سب نے ہی بڑی طاقتوں کا سامنا کر کے یہ افسانے لکھے ہیں ان میں سے کسی کو ہندوستان پاکستان کی لکھنے والیوں کا عیش حاصل نہ ہو سکا نہ مہلت اور سکون دل۔ نہیں ذات کا شعور بھی انڈو پاک کے لکھنے والوں سے زیادہ ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ نئے ہندوستان اور پاکستان کے لکھنے والے بھی سب اوسط درجے کے لکھنے والے ہیں میرے سامنے اس وقت چند رسالے ہیں جن میں ہندوستان پاکستان کے لکھنے والے اور لکھنے والیاں ہیں بشمول "مخزن" جو مقصود الٰہی شیخ نے شائع کیا ہے سب افسانے اوسط درجے کے ہیں اور حقیقت تو یہ ہے ٹی۔ وی، فلم اور کمپیوٹر کی وجہ سے خود انگریزی میں بھی اچھے لکھنے والے نظر نہیں آ رہے ہیں۔ مغرب میں شہرت کا ایک فارمولا مسلمانوں کے لئے موجود ہے اسلام کو برا کہیئے۔ عورت ہے تو اور زیادہ شہرت ملے گی۔ ایسی کتابوں کی اشاعت پر پیسہ پانی کی طرح بہایا جاتا ہے بعد میں چاہے وہ کتابیں ٹائلٹ پیپر کی جگہ استعمال ہوں۔

☆ آپ کے انداز تحریر میں پایا جانے والا دھیما پن آج کے دور سے میل نہیں کھاتا پھر بھی آپ اس پر قائم ہیں۔ یہ سست روی آپ کے اندر کب اور کہاں سے در آئی؟

☆☆ اصل میں یہ سوال زیادہ واضح نہیں ہے؟ تاہم دیکھیں پہلے اگر آپ کی مراد ہے کہ میں جزئیات میں بہت زیادہ وقت صرف کرتی ہوں ممکن ہے ایسا ہو کہ بنیادی طور پر میں طویل مختصر افسانے لکھتی رہی ہوں۔ مختصر افسانے کم لکھے ہیں تاہم لکھے جا سکتے ہیں۔ دوسری وجہ طوالت کے میرا فلسفہ ہے کہ کوئی انسان خلا میں پیدا نہیں ہوتا۔ اس کرۂ ارض پر ہمارے وجود سے رشتے ناطے اور تعلقات وجود میں آتے ہیں اور ہمارے ارد گرد پھیلی یہ کائنات انسانی وجود سے نئے معانی اختیار کرتی ہے۔ ادب حقیقت کا ترجمان ہے ادب ماورائے دنیا سے باہر کی چیز نہیں اس لئے کرداروں کا پس منظر دکھانا ضروری ہوتا ہے میرا خیال ہے اور ژاک ڈالتا نے بھی کہا ہے کہ کہانی میں زندگی ہماری صحیح زندگی ہے یہی بات ایڈورڈ سعید نے دہرائی ہے "ادبی تحریر ایک تحریر ہونے کے باوجود خود اس دنیا کا وجود ہے" ادب تحریر اور نقاد 1983ء چنانچہ کرداروں کی نفسیات کو اس کے دنیا اور دنیا والوں سے رشتے ناطوں کے ساتھ بیان کرنے سے مقصود کردار کے نظام فکر اور اس کی نفسیاتی وجوہ پر روشنی ڈالنا ہوتا ہے اسے کسی بھی تنقیدی نقطۂ نظر سے خامی، کمزوری یا غیر ضروری نہیں کہا جا سکتا.... سوائے اس کے کہ کاغذ کی تنگی کی وجہ سے مدیر حضرات اب طویل افسانے چھاپنا نہیں چاہتے اور شاید یہی وجہ ہے کہ اب بڑا افسانوی ادب لکھا نہیں جا رہا ہے میرا خیال ہے کہ مجھے اب ایک ناول لکھ ڈالنا چاہئے جو عمروں سے مجھے تنگ کر رہا ہے اور میری تکنیک کا صحیح استعمال ہو۔ اگر دیکھیں پہلے سے مراد سنسنی خیزی کی کمی ہے یا جنسیات کے بیان کی کمی ہے تو حقیقت یہ ہے کہ میں کرداروں کا تعاقب ان کے بستروں کے اندر کرنا پسند نہیں کرتی۔ میں اس معاملہ میں پطرس کی ہمنوا ہوں کہ جس طرح "بیت الخلا میں بیٹھے آدمی کی تفصیل لکھنا ادب کا حصہ نہیں اسی طرح کردار کے جنسی عمل کی تفصیل تحریر کا حصہ نہیں ہے۔ یہ بات بھی میری سمجھ میں نہیں آئی "آج کے دور سے میل نہیں کھاتا" سے آپ کی کس معاشرے سے مراد ہے؟ کیا ہم پاکستان کی بات کر رہے ہیں یا انگلینڈ کی اور کونسی تیز رفتاری اور کونسی سست روی؟ اگر آپ کی مراد ہے کہ میں بہت کم لکھتی ہوں تو اس کا جواب یہ ہے کہ میری زندگی اتنی مصروفیات میں بٹ گئی ہے کہ فیصلہ نہیں کر پاتی لمحہ موجود میں کس چیز کا اولین تقاضا کیا ہے۔ کبھی سوشل ورک کبھی کالج۔ کبھی لکھنا جتنا وقت ہو وہ دو ڈیوٹی بھی۔ شاعری، سنجیدہ مضامین کے لئے وقت اور محنت درکار ہے۔ شاعری اور افسانہ موڈ پر لکھا جاتا ہے۔

☆ آپ کا ادبی سفر بیقراری میں گرفتار کیوں ہے؟ مثلاً افسانہ، تنقید، شاعری، سماجی مضامین اور بچوں کا ادب وغیرہ؟

☆☆ اس کا جواب دینا بھی ذرا مشکل ہے۔ شاید یہ میرے حالات اور اس کے نتیجے میں شخصیت کی انفرادی خصوصیت کی عکاسی ہے۔ مثلاً میں خواتین کو مشورے بھی دیتی ہوں Counselling یہ رضا کارانہ کاموں کا حصہ ہے۔ خواتین کا ایک Discussion Group بھی لیتی ہوں جس میں لوگ جدید زندگی اور اسلام کے تعلق سے سوالات کرتے ہیں۔ کالج میں پڑھاتی

ہوں۔ کچھ خیراتی اداروں کی بھی مدد کرتی ہوں جو بین الاقوامی طور پر مسلمانوں کی مدد کرتے ہیں ان میں پاکستان ہندوستان میں صاف پانی مہیا کرنے کا منصوبہ اولیت رکھتا ہے۔ یہ سب میں دکھاوے اور تعریف کے بجائے مجبوری کے تحت کیا رہی ہوں ایک اردو کا اسکول بھی کھول رکھا ہے کبھی کبھی ادبی تقریبات میں بھی جاتی ہوں اور اس کا انتظام بھی کرتی ہوں۔ کوشش میں ہوں کہ کچھ جوان لوگ آگے آئیں اور ذمہ داری نبھائیں مگر ایسا ہوتا نہیں پایا ہے یہاں کی نوجوان خواتین کو نہ اردو سے دلچسپی ہے نہ پاکستانی ثقافت سے کیونکہ انہیں مغربی ثقافت اور پاکستانی ثقافت میں کوئی ایسا فرق نظر نہیں آتا۔ وہاں سے شادی ہو کر آنے والی لڑکیاں انگریز لڑکیوں کی طرح حرکات کرنے میں فخر محسوس کرتی ہیں۔ میری ذات ٹکڑوں میں بٹ گئی ہے اور پھر گھریلو مسائل کے جوار بھاٹے کو بھی نظر میں رکھنا ہوتا ہے۔ میں اپنے ذاتی اور کائناتی دکھوں کی صلیب اٹھائے منزل کی طرف رواں دواں ہوں ایسے میں ادھر ادھر ستانے کی مہلت کے دوران جو لکھ جاتا ہے میں لکھ رہی ہوں۔ پہلے میں سمجھتی تھی کہ زندگی میں سب سے اہم میرا اللہ پہ اعتقاد ہے پھر بچے ہیں پھر ادب ہے۔ اب میرے بچے والے معاجز ہوئے نے جن کی شادی میں نے بھائی کی بیٹی سے کی جس کو میں اپنی بیٹی کی طرح پیار کرتی تھی اپنی تربیت کے ساتھ ایک کوشش سے نکل کر بیٹھ میں تجربہ مارتی ہے اور بیٹے کو بھی نافرمان بنا دیا ہے تو مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کس چیز پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے بھائی یہ بھائی بھتیجی اور بیٹا۔ ایسے میں اب تو یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ میری زندگی کا مقصد کیا ہے؟.... ادب کیا ہے؟ اور اس کی کس صنف میں طبع آزمائی کیا سود مند ہوگا۔ مدتیں ہوئیں ایک ناول شروع کیا تھا۔ دو سال قبل ایک ریسرچ مضمون شروع کیا تھا۔ بس زندگی کی اسی بیقراری نے ادب میں بیقراری پیدا کردی ہے شاید یہ میری زندگی اور ضرورت سے زیادہ احساس ذمہ داری کی خطا ہے ملکہ جو امر ثروت دی ہے اس کے لئے ہاؤس آف کامنز سے نامزدگی کا فارم آیا ہے بہت طویل ہے ابھی تک بھرنے کی فرصت نہ ملی۔ یہی ممکن ہے میری بیقراری کی وجہ مصروفیت اندرونی بے اطمینانی یا بیرونی پریشانی اور.....

☆ ایک رائے یہ بھی ہے کہ اسی پھیلاؤ نے اب تک آپ کی واضح ادبی شناخت نہیں بننے دی؟

☆☆ اسے آپ اصول پرستی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اصول کے لئے میں دھمکیوں سے دہل کر میں نہیں آتی۔ نہ خسارے کی پروا کرتی ہوں۔

☆ اچھا یہ بتائیے! کہ سنجیدہ تنقید نگاروں نے آپ کی جانب اس قدر توجہ کیوں نہ کی جس کی آپ بجا طور پر مستحق ہیں؟

☆☆ آپ کا بے حد شکریہ کہ آپ نے مجھے تنقید میں بیان کئے جانے کا مستحق سمجھا اور پھر "بجا طور پر" کا اضافہ تو واقعی بات کو بھاری بنا دیتا ہے چالیس برس قبل پاکستانی معاشرے کی زندگی میں سچ تھا تو ادب میں بھی سچ تھا۔ توجہ نو واردان ادب کی طرف دی جاتی تھی اب نقادی بھی بازار کے بھاؤ کا شکار ہے جیسے سونے اور مرغی کا بھاؤ اور نرخ گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں۔ اسی طرح موجودہ نقادوں کی آراء بھی ہیں۔ وہ کسی پر توجہ اس صورت میں دیتے ہیں جب ان سے فائدہ کی امید ہوتی ہے وہ تنقید تخلیق کی قدر متعین کرنے کے لئے نہیں کرتے۔ وہ ادبی تحریر میں چھپی قوت کو تلاش نہیں کرتے۔ فنی اور جمالیاتی خوبیوں کی جستجو نہیں کرتے وہ تخلیق کار سے پردہ اٹھانے کا ارادہ نہیں رکھتے بلکہ فنکار سے تعلقات کو بہتر بنانے کے لئے لکھتے ہیں پھر ان کی رائے تنقیدی صلاحیتوں سے خالی ہوتی ہے اور چونکہ باہر رہنے والے سنجیدہ فنکار اصول پرست ہیں اور نقادوں کی خوشامد نہیں کر سکتے۔ یہ بیچارے تو فضول سمجھتے ہیں ان سے فائدوں کی امید نہیں ہوتی نہ ان سے کوئی مروت کا معاملہ ہوتا ہے اس لئے وہ ان کا ذکر نہیں کرتے۔ بددیانتی اور خود غرضی نے قومی نشاں ہمارا..... حالانکہ میری رائے ہے کہ جو بھی فرمائش کرے لکھنے کی نقاد لکھیں... دیانت داری سے تخلیق کا تجزیہ کریں اور اپنے وقت کی قیمت متعین کرلیں۔ وقت کی قیمت وصول کرنے میں حرج نہیں ہے اس کی قیمت کے بارے میں ہمارا بھی حرج کی بات نہیں۔ حرج کی بات یہ ہے کہ کسی نے اگر کوئی بڑا احسان کر دیا یعنی بڑا چیک دے دیا تو وہ بڑا ادیب ہو گیا اور چھوٹا چیک آیا تو چھوٹا ادیب ہو گیا۔ ساتھ یہ بھی ہے کہ ملک میں نقاد ہیں ہی کتنے؟ اور پھر خواتین کے بارے میں ان کا رویہ کیا ہے؟ یہ سب باتیں وہ وجوہات ہو سکتی ہیں جس کے باعث نام نہاد سنجیدہ نقادوں نے میری کہانیوں پر توجہ نہیں دی۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر واقعی ملک میں سنجیدہ نقاد ہوتے تو ضرور توجہ دیتے۔

☆ آپ کی ترقی پسندی کا جواز بھی کچھ ایسا لگتا ہے کہ آپ خالص اسلامی ویژن رکھنے والی تخلیق کار ہیں؟

☆☆ اگر آپ لوگوں نے مغرب میں لکھی جانے والی ریسرچ پڑھی ہوتیں جو اسلام پر کی گئی ہیں تو آپ یہ سوال نہ کرتے کہ ترقی پسندی اور اسلام ساتھ ساتھ کیسے ہو سکتے ہیں؟ دراصل معاملہ کہ ترقی پسندی آپ لوگ اگر اس تحریک کو کہتے ہیں جو ۱۹۳۶ء میں سجاد ظہیر وغیرہ نے شروع کی اور جس کے لئے مخدوم نے لکھا تھا۔

جبیں شوق سرِ رہگذر کب سے ہے
گلو بھی جا کہ تہِ انتظار کب سے ہے

اور فیض نے کہا تھا "کہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں" اور جس کے لئے پنڈی سازش کیس چلا تھا تو وہ ترقی پسندی چوتھائی صدی پہلے مر چکی ہے اور اس کے مرنے کی پیش گوئی میں نے بھی کی تھی ان مضامین میں جو میں نے ساحر کسی کے حوالے سے لکھے تھے۔ اس کے منشور میں ادبی ایک ضروری شق تھی لیکن خیالات بدل جاتے ہیں حالات کے ساتھ اس میں شک نہیں کہ پروفیسر ممتاز حسین اور اس نسل کے اور ادیب آخری دم تک ادبی ہی رہے مگر فیض کے اپنے خیالات میں لچک آ چکی تھی۔ دیکھیں گے ہم بھی دیکھیں گے ثبوت ہے خیالات کی تبدیلی کا اس کے علاوہ ایک ملاقات میں بھی انہوں نے اقرار کیا۔ ۱۹۳۲ء کے تقاضے ۱۹۸۰ء کے تقاضوں سے مختلف تھے۔ سردار جعفری سے میری پہلی ملاقات ۱۹۷۲ء میں ایک مشاعرہ میں ہوئی انہوں نے بعد میں میرے ایک شعر کی بہت تعریف کی یہ پہلا اتفاق تھا کہ ایک بہت بڑے شاعر نے جسے میں بچپن

سے بہرہ رکھتی تھی اس نے میرے کلام کی تعریف کی۔ دوسری ملاقات بیاسی میں اردو مرکز میں ہوئی۔ تب انہوں نے وعدہ کیا کہ اگلی بار وہ ضرور میرے گھر آئیں گے۔ ۱۹۸۵ء میں ترقی پسند تحریک کی سہ روزہ کانفرنس کے اختتام پر قرار داد میں اس بات پر بحث ہوئی۔ لادینی کی شق نکالنے کے لئے اس سے قبل کے لکھنؤ کے اجلاس میں تجویز پیش ہوئی تھی مگر مسترد کر دی گئی تھی کہا گیا کہ اب اسے نکال دیا جائے مگر وہ دوبارہ مسترد ہوگئی۔ بعد میں جب جعفری صاحب میرے گھر کھانے پر آئے تو اندازہ ہوا کہ وہ بھی لادینی کو ترقی پسندی کے لئے ضروری نہیں سمجھتے حالانکہ میری تحریروں کو ترقی پسند مانتے تھے انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ میں انہیں تلاوت سناؤں۔ وہ میرے والد سے کچھ بڑے تھے اور ان کی شخصیت میں مجھے ان کی جھلک نظر آ رہی تھی میں نے انہیں تلاوت سنائی۔ وہ دم بخود سنتے رہے تلاوت ختم ہونے کے بعد بھی سکوت چھایا رہا۔ پھر انہوں نے کہا ماشاءاللہ جیسے وہ بہت متاثر ہوئے۔ تو اگر ترقی پسند تحریک کے کرتا دھرتا اور رہنما ہی لادینی سے تائب ہو گئے تو پھر میری ترقی پسندی پر حیرانی کیوں؟ ویسے بھی... اب بیسویں صدی میں ہر لکھنے والا ترقی پسند ہی ہوتا ہے اور ہوگا۔ جاگیرداری، سرمایہ داری کی قوت شیطان کی قوت کی طرح دنیا میں موجود ہی رہے تو کیا؟ اس نظام کی لائی ہوئی لعنتوں کے خلاف آواز اٹھاتے رہنا ترقی پسندی ہے۔ وہ ہم بنیادی انسانی حقوق کے لئے لڑتے رہنا ترقی پسندی ہے اور یہی اسلام ہے۔

☆ آپ نے اپنے ایک مضمون میں ہندوستان میں اردو کی حالت زار پر بڑی دل شکستگی کا اظہار کیا ہے۔ وہاں تخلیق ہونے والے ادب بالخصوص اردو ادب کی بابت آپ کی رائے اور امیدیں کیا ہیں؟

☆☆ اس سوال کے جواب میں صرف یہ لکھنا چاہتا ہوں ”تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو“ میں نے اپنے مضمون میں شاید یہ لکھا تھا اردو کو ختم کر دینے والے وہاں کے مسلمان ہیں اگر یہودی عبرانی کو صرف گھروں میں پڑھا کر چار ہزار سال سے زندہ رکھ سکتے ہیں تو یوپی کے مسلمان گھروں میں کیوں اردو نہیں پڑھا سکتے تھے۔ ہماری پھوپھی نے اپنے سب بچوں کو پڑھایا۔ ان کا ایک بیٹا انجینئر ہے اور جز وقتی طور پر مقامی اخبار ”راستی“ کا رپورٹر بھی ہے۔ ان کی ایک لڑکی نے اردو میں ایم اے کیا ہے اگر ہر گھر میں ایسا ہوتا تو اردو باقی رہتی مگر ایسا نہیں ہوا اور اردو مر گئی۔ ہندوستان سے جو رسالے نکلتے ہیں اور ان میں جس قسم کی شاعری اور افسانے چھپتے ہیں وہ بہت معمولی معیار کے ہوتے ہیں۔ صرف وہی ادیب معیاری ادب لکھ رہے ہیں جو تقسیم سے پہلے سے لکھ رہے ہیں جیسے جگن ناتھ آزاد، جوگندر پال، عینی آپا..... الہ آباد سے نکلنے والے رسالے نیا سفر میں اچھی تحریریں نظر آتی ہیں۔

☆ کیا آپ وطن عزیز میں اردو زبان اور اردو ادب کے مستقبل سے اسی قدر مطمئن ہیں جس قدر ایک دردمند اور ذمہ دار تخلیق کار کو ہونا چاہئے؟

☆☆ اردو جب تک اسکول کالج میں ثانوی حیثیت سے نہ پڑھائی جائے گی اردو کا مستقبل تاریک ہے وطن عزیز میں بھی اردو کا مستقبل کچھ ایسا تابناک نہیں ہے وجہ یہ ہے کہ اردو بولنے والے پڑھنے والے متوسط اور غریب متوسط طبقے کے لوگ نظر آتے ہیں۔ کیونکہ سب اردو بولتے سمجھتے ہیں پیسے والے عام لوگ نہیں۔ اردو لکھنے والوں کے بچے بھی انگریزی بولتے ہیں ہمارے بچے پاکستان جا کر اس لئے چڑتے تھے کہ یہاں ان سے کہا جاتا تھا ”اردو بولو“ اور وہاں لوگ اپنی انگریزی کی مشق کر رہے ہوتے۔

ہم جب کالج میں تھے تو کالجوں میں لائبریریاں ہوتی تھیں ان میں اردو کی کتابیں ہوتی تھیں بڑے بڑے ادبی رسالوں کے مخصوص شمارے ہوتے تھے۔ گھروں میں ادبی رسالے آنا پڑھے لکھے ہونے کی نشانی ہوتی تھی۔ اب لوگ ادبی رسالے نہیں پڑھتے نہ خریدتے ہیں ڈائجسٹ پھر بھی پڑھے جاتے ہیں۔ اخباروں کا معیار گر گیا ہے املا غلط ہوتا ہے۔ ریڈیو ٹیلی ویژن سے لوگ اپنی زبان کی تصحیح کیا کرتے تھے اب وہاں بھی بگڑی ہوئی الٹی ہوئی بگڑی سنائی دیتی ہے.... مگر پھر بھی جب تک مزدور اور متوسط طبقے کے لوگ زندہ ہیں اردو زبان زندہ رہے گی بولنے اور رابطے کی زبان کے طور پر بھی ہمیں اپنی فکر کر کے زبان کو زندہ رکھنا چاہئے ہندوستان سے مقابلہ کا کیا فائدہ؟

☆ مغرب میں بسنے والے اردو داں اہل قلم اپنی انگریزی استطاعت کو کام میں لا کر اردو ادب کو مغرب میں بہتر طریقے پر متعارف کیوں نہیں کرواتے؟

☆☆ مغرب میں رہنے والے سارے ادیبوں کو انگریزی پر عبور نہیں دوسرے روزی کی دوڑ نے مہلت نہ دی۔ ہم جب فرصت ہوئی تو اولاد کی ناقدریوں کے غم میں موت کے دروازے تک آ پہنچے۔ ہمارے ادیب مغرب میں رہیں یا مشرق میں سنجیدہ اور محنت کا کام کرنے سے کتراتے ہیں۔ گزشتہ سال خواتین شاعرات پر مجھے انگریزی میں مقالہ پڑھنے کو کہا گیا جو میں نے پڑھا۔ اس پر بہت سے لوگوں نے شور مچایا کہ یہ غلط حرکت تھی اب آپ بتائیے ”اردو کی بات انگریزی میں کیوں کی؟“ یہ غلطی کی حرکت تھی اب فیصلہ کیجئے کہ وہ انگریزی کو کیا سمجھتے ہیں۔

☆ پہلے آپ لوگ بہتر معاش کے باعث یورپ میں بس جاتے ہیں پھر وہاں پیش آنے والے مسائل پر واویلا کرنے لگتے ہیں۔ کوئی قیمت تو انسان کو دینا ہی پڑتی ہے آرام و آسائش کی؟

☆☆ آپ کو شاید یہ خبر دلچسپ معلوم ہو کہ جو لوگ بہتر معاش کے لئے آ کر بسے وہ واویلا نہیں کرتے کیونکہ انہوں نے مسائل کو جاننے کی کوشش ہی نہیں کی وہ ایسی کشتی میں ہیں جو ہوا کے رخ بہہ رہی ہے۔ ہوا مخالف ہوئی تو ڈوب گئے اور بعض صورتوں میں منزل تک پہنچ گئے جو لوگ ہماری طرح عارضی طور پر آئے اور شوہروں کی وجہ سے یہاں رہ گئے .... ان کا واویلا مردوں کی بے حسی کی وجہ سے زیادہ رہا ہے اور مسائل کی وجہ سے کم۔ مرد حضرات نے کم ہمتی پر کمر باندھی اور خواتین کو فرصت سے زیادہ ذمہ داریاں سونپ گئیں۔ اس لئے زندگی میں مسائل پیدا ہوئے اگر ان کی محنت کی قدر کی جاتی اور ان کی اہمیت تسلیم کر کے پیار و محبت کا ماحول رکھا جاتا تو مسائل کم پیدا ہوتے تاہم اور ایسا بھی نہیں کہ ہر کوئی مسائل سے دوچار ہے متوسط پڑھے لکھے طبقے کی دوسری نسل نے تعلیمی

میدان میں مقامی لوگوں کو بھی مات دی ہے مگر یہ بھی نہیں کہا جا سکتا ہے کہ تمام پاکستانیوں کی تعلیمی کارکردگی باقی تمام تارکین وطن سے نیچے ہے اور جرائم میں ان کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ دوسری بات یہ کہ جن باتوں پر ہم لوگ واویلا کرتے ہیں اور انہیں جرم گردانتے ہیں کہ ہمیں تین چار دہائی کی پرانی معاشرت کو زندہ رکھنا چاہئے جب کہ وہ معاشرت پاکستان میں مر چکی ہے وہ تہذیب زیر زمین ہو گئی ہے اور جن چیزوں کو ہم عیب سمجھتے ہیں وہ پاکستان میں بہتر بن گئی ہے یا بن چکی ہے۔ جہاں تک مغرب کے دیئے آرام و آسائش کا تعلق ہے تو اس سے زیادہ آرام مجھے اپنے والد کے گھر حاصل تھا۔ جوتیاں پٹخا کر آسائش حاصل کیا کوئی میا کمال بھی نہیں محنت کرنے والوں کو اس کا پھل مل ہی جاتا ہے۔ میں بہت کما سکتی تھی اپنی تعلیمی صلاحیت کی وجہ سے مگر میں نے پیسے کو کبھی اہم نہیں سمجھا.... پیسہ صرف خود پر خرچ کرنا فرعون اور قارون کا کام ہے مومن کی دولت میں بہت لوگوں کا حصہ ہوتا ہے۔ دوسری اہم بات کہ جب میں آئی تھی تو مجھے یہاں کی بھاگ دوڑ پسند نہیں تھی..... چھتیس برس بعد آج میں اس مقام پر ہوں کہ پاکستان آ کر برطانیہ سے دوگنی آسائش کی زندگی گزار سکتی ہوں مگر مجبوری ہے لندن کی اخلاقیات انسانی حقوق کی نگہداشت اور دیانت نے مجھے اتنا مجبور اور بے بس کر دیا ہے کہ پاکستان میں میرا دم گھٹتا ہے۔ میں خود کو اجنبی محسوس کرتی ہوں وہاں کی کوئی چیز مجھے اپنا حوالہ نہیں دیتی اب بہت دیر ہو چکی ہے میں وہاں کی معاشرت اور منافقت کے ساتھ گزارا نہیں کر سکتی۔

☆ آپ کے خیال میں مغرب میں بسنے والے آباد کار بالخصوص مسلمان اُن کی زبان، ثقافت اور مذہب کا مستقبل کیا ہے؟

☆☆ میرے خیال میں مغرب میں بسنے والے مسلمانوں کا مستقبل بہت روشن ہے یہاں کی نئی نسل کا حوالہ صرف اسلام ہے ان کی زبان انگریزی ہے وہ ثقافت کو بدعت کہتے ہیں جب اردو، بنگالی، پنجابی، سندھی بولنے والی ہماری نسل قبر میں جا سوئے گی تو پھر یہاں صرف مسلمان رہ جائیں گے۔ اردو بنگالی زبان ایک مضمون کی حیثیت سے باقی رہے گی۔ گیارہ مضامین میں سے ایک یہ زبان بھی ہو گی۔ جس کو امتحان کے بعد طلباء امتحان ہال میں ہی چھوڑ آئیں گے۔ پاکستان جا کر.... "آگے خطرہ ہے" ختم کے بعد پڑھا کریں گے اور گڑھے میں گرنے سے بچ جائیں گے۔ نوجوانوں میں عربی پڑھنے کا شوق بڑھ رہا ہے جہاں تک زبان کا تعلق ہے وہ ادب سے ایک علیحدہ چیز ہے برطانیہ میں سو سے ننانوے فیصد لوگ پڑھے لکھے ہیں مگر ادب پڑھنے والے دس فیصد بھی نہیں ہیں صرف انگریزی کے اساتذہ ہی ادب و شاعری سے واقف ہیں مگر قوم ترقی کر رہی ہے لوگ موٹے موٹے سائنسی ناول پڑھتے نظر آتے ہیں مگر اس سے ان کی ادبی سمجھ میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا کہانی پڑھنے کی طلب ٹیلی ویژن سے پوری ہو جاتی ہے اس لئے پڑھنے کی کسی کو ضرورت نہیں ہوتی اس لئے انگریزی ادب میں بھی جیمز جوائس اور ورجینا وولف کے بعد گراف نیچے کو جا رہا ہے۔

☆ نوجوان نسل اس حوالے سے کس طرح کے ذہنی تحفظات میں گرفتار اور مستقبل کی بابت کس طرح کی پیش بندی کی فکر کر رہی ہے؟

☆☆ نوجوان نسل سے متعلق سوال واضح نہیں ہے کہ ہم کس نوجوان نسل کی بات کر رہے ہیں اگر ہم دنیا بھر کی نوجوان نسل کی بات کر رہے ہیں تو میں کہہ سکتی ہوں کہ نوجوان نسل ایک خلا کے گرد گھوم رہی ہے اور وہ لوگ خلا پُر کرنے کے لئے کبھی مجاہد بننے کے لئے نکل کھڑے ہوتے ہیں کبھی خودکش حملوں کی باتیں کرتے ہیں گمراہوں کو راہبر بنا کر چل پڑتے ہیں خواہ وہ پنجاب کے گاؤں سے چل کر آنے والا مسجد کا امام ہو یا جاہلوں کا امام بن جانے والا ملا ہو جس کو تقریر میں ایک ہی بات یاد رہتی ہے اگر کسی کو سجدہ کا حکم ہوتا تو عورت کو حکم ہوتا کہ شوہر کو سجدہ کرے۔ اس کو اس سے کوئی واسطہ نہیں کہ قرآن میں ہے "گناہ کبیرہ کے علاوہ تمام گناہ بخش دوں گا مگر شرک کرنے والا ستر دفعہ استغفار پڑھے تو نہیں بخشوں گا۔" وہ ایسے کہتے ہیں جیسے سجدہ کا حکم آ چکا اور کنیز یہ کہہ کر گاتے ہیں کہ جب دل چاہے عورت کو پیٹو۔ اس ملا سے زیادہ ایک خطرناک مخلوق وارد ہونے لگی ہے وہ پیران طریقت ہیں جو بھاگے ہوئے محبوبوں کو ملانے کے لئے آتے ہیں ان کی بیعت میں نوجوان مسلمانوں کی اکثریت مختلف جرائم میں مبتلا ہو جاتی ہے کہتے ہیں انگریز نوجوان میں منشیات بہت بڑھ گئی ہے۔ پاکستان میں آپ تو رہتے ہیں وہاں بھی صورت حال کچھ مختلف نہیں ہے۔ چند منظم اور تعلیم یافتہ لوگوں نے بیٹھ کر حکومت کی ہے وہی اب بھی کریں گے۔ یہاں تک کہ کوئی عالمی انقلاب برپا نہ ہو جائے پڑھے لکھے نوجوان اور سنجیدہ لوگ اب ان مسائل پر بحث کرتے نظر آتے ہیں جو گزشتہ صدی میں متروک ہو چکا تھا۔ یعنی انسانی روح اس کی ماہیت، اس کی ارتقا اور بقا کے طریقے کچھ نہیں کہا جا سکتا کل کیا ہو گا؟ ایک رپورٹ کے مطابق دو سے ڈھائی ہزار لوگ برطانیہ میں ہر سال دائرہ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں جب کہ اس سے زیادہ مسلمان عرب، افغانی، بنگالی، ترکی، پاکستانی، ہندوستانی مسلمان اسلام کو چھوڑ کر جرائم کی زندگی اختیار کر رہے ہیں۔ شاید اللہ تعالیٰ پرانے مسلمانوں کی جگہ نئے مسلمانوں کو دینے والا ہے سورہ مائدہ میں یہ وعدہ کیا گیا ہے۔ تجربے کے واقعات نے مغرب کی مسلمان نسل کو مایوسی میں مبتلا کر دیا ہے۔

☆ سنا ہے آپ کی اولاد بھی اردو زبان و ادب سے نا آشنا ہے بطور مسلمان آپ اُن کا مستقبل کس طرح دیکھتی ہیں اور وہ تھرڈ ورلڈ کے ایک پسماندہ ملک اور زبان کی رائٹر کے طور پر اپنی والدہ کی بابت کیا حسن ظن رکھتے ہیں؟

☆☆ اس سوال میں بھی تھوڑی منطقی پیچیدگی ہے "لفظ زبان و ادب میں"۔ دیکھئے ادب تخلیق کرنے کے لئے ایک بولی، لکھی اور سمجھی جانے والی زبان کا وجود جسم اور روح کے رشتے کی طرح ساتھ ہونا ضروری ہے۔ لیکن ایک بولی، لکھی اور سمجھی جانے والی زبان کے لئے ادب افسانہ، ناول اور شاعری ضروری نہیں ہے اس زبان کی حیثیت کاروباری ہوتی ہے۔ میرے بڑے بیٹے نے صحافت میں ایم اے کیا ہے انگریزی زبان میں خیالات کے اظہار کی وہ مکمل مہارت رکھتا ہے مگر شاعری اور ادب کی تعریف بھی نہیں کر سکتا۔ آج کے جدید دور میں ہر مضمون کی اپنی زبان میں اتنی وسعت ہے کہ وہاں ادب کی گنجائش نہیں ہے۔ چھوٹے نے نو اور لیول تک اردو پڑھی ہے اب بھی پڑھ لیتے ہیں مگر لکھنا

بھول چکے ہیں۔ مطلب یہ کہ اب خط یا مضمون لکھنا مشکل ہے۔ تو ریول میں چھ افسانے، ایک ناول کورس کا حصہ تھا امراؤ جان اور مراۃ العروس۔ یہ اردو میں ہی نہیں ہے، فرنچ کا بھی یہی حال ہے تاہم کورس ہر مغربی زبان کا ہے مگر اس سے طلباء مہارت نہیں حاصل کرتے نہ مزید کہانیاں اور شاعری پڑھنے کا انہیں شوق ہے۔ اور شاید آپ کو تعجب ہو کہ انگریزی اے لیول میں بھی دو ناول چھ افسانے ہیں۔ ۱۹۳۰ء کی شاعری دو ڈرامے شامل ہیں مگر انگریزی ادب کا مطالعہ کرنے والے بہت کم ملتے ہیں جب کہ لائبریریاں ادبی کتابوں سے بھری ہیں۔ میری اولاد بہت بہتر ہے۔ چھوٹا سلطان بیٹا جس نے اردو میں اے گریڈ میں اے لیول کیا ہے اس کو میں اکثر نیا شعر لکھوں تو سناتی ہوں۔ سلطان انگریزی میں کبھی کبھی شعر کہتے ہیں۔ کبھی میں شعر سناؤں تو ترجمہ پر اصرار کرتے ہیں۔ تعریف کرتے ہیں Mum it is deep اس کے ساتھ ہی پاکستان میں کزن اور بھانجوں بھتیجوں میں سے کسی نے اردو میں ایم اے نہیں کیا نہ ادب سے دلچسپی ہے۔ اردو میں خط لکھنے کا رواج بھی ختم ہو رہا ہے۔ ٹیلیفون اور انٹرنیٹ نے اس کی کمر توڑ دی ہے۔ کوئی ادبی تحریر نہ پڑھتا ہے نہ سمجھتا ہے۔ بطور مسلمان ان کا مستقبل پاکستان کے مسلمانوں سے بہت بہتر ہے۔ برطانوی حیثیت نے انہیں با اصول بنایا۔ اسلامی تعلیم نے ان کے اخلاق کو جلا دی ہے۔ یہ اس لئے کہ یہی میری زندگی کا مقصد تھا۔ بڑا اور چھوٹا بیٹا دین پر کاربند ہیں بیچ والے صاحب شادی کے بعد گمراہ ہوئے ہیں جب کہ ان کی بیوی پاکستان سے آئی ہے۔ بہت سے لوگ یہی کہتے ہیں کہ پاکستانیوں کی منافقانہ اخلاقیات سسرال سے منتقل ہو کر ان کی زندگی پر حاوی ہو چکی ہیں۔ بیس سال میں شادی ہو تو انسان کی شخصیت اتنی ہی کمزور ہوتی ہے کہ ان کے بچے کیسے ہوں گے؟ یہ میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ یہاں کا مسئلہ ہوگا۔ میرے بچے جن چیزوں کے بارے میں مجھ سے متاثر ہیں وہ یہ کہ (۱) وہ مجھے چلتا پھرتا انسائیکلوپیڈیا سمجھتے ہیں۔ (۲) انگریزی ادب پر عبور ہے کہ میں انہیں ادب پڑھاتی رہی ہوں۔ (۳) میری ٹیچنگ ٹیکنیک سے متاثر ہیں خواہ میں کچھ پڑھاؤں۔ (۴) انہیں اس بات پر فخر ہے کہ جدید نوجوان ذہنوں کے سوالات کا جواب دے کر قائل کر سکتی ہوں۔ (۵) اردو انگریزی دونوں میں ایک مقبول مقرر ہوں۔ (۶) ہر ضرورت مند کی ضرورت پوری کرنا اپنا فرض سمجھتی ہوں خواہ یہ ضرورت مادی ہو، روحانی ہو، معاشرتی ہو یا صرف جذباتی ہو۔ کسی کے پیسے اور دولت پر رشک نہیں کرتی کسی سے مرعوب نہیں ہوتی اور اصول سے اخلاقی اور دینی اصول سے کسی بھی لالچ سے پیچھے نہیں ہٹتی خواہ گلا کٹتا ہو..... لیکن میں کیا لکھتی ہوں؟..... میرا ادبی مقام کچھ ہے کہ نہیں ہے؟ میری تحریروں میں ہے کیا؟ ان تحریروں کا مستقبل کیا ہے؟ ان چیزوں سے انہیں دلچسپی نہیں ہے اندھے کے لئے ہیرا پتھر برابر ہے..... اور حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں بھی میرے بھائی بہن سوائے ایک آدھ کے میرے ادبی کاموں کی حیثیت اور نوعیت سے واقف ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ یہ ان کا لاشعوری حسد ہے جو اس وجہ سے پیدا ہوا کہ والد صاحب مجھے بہت زیادہ چاہتے تھے اور میری ذہانت کی علی الاعلان تعریف کرتے تھے یا یہ ان کی جہالت ہے..... یا دونوں.....

☆ کیا آپ سمجھتی ہیں کہ بطور خاتون تخلیقی سفر میں آپ کو کچھ دشواریوں کا سامنا رہا ہے۔ جواب ہاں میں ہے تو اُن کی نشاندہی اور صنف نازک کی تازہ دم تخلیق کاروں کو ان سے بچنے کے طریقے ضرور بتائیے؟

☆☆ یہ understatement ہے۔ مجھے خاتون ہونے کی حیثیت سے تخلیقی سفر میں صرف دشواریاں ملی ہیں۔ میں جہد جانکاہ لڑتے رہنے میں یقین رکھتی ہوں۔ جو مثبت قدروں کے لئے لڑتا ہے وہ ضرور کامیاب ہوتا ہے یہ جنگ میں نے بچپن سے لڑی ہے سارے خاندان کی طاقتوں کے باوجود میں نے اپنی مرضی کی تعلیم حاصل کی اور..... جو کچھ زندگی میں حاصل کیا اپنی محنت اور اللہ کی عنایت سے۔ میرے اوپر کسی کا کوئی احسان نہیں سوائے والد صاحب کی حوصلہ افزائی کے یا کراچی والے بھائی جو ہیں انہوں نے کتاب کی اشاعت میں بھاگ دوڑ کا احسان ضرور کیا۔

مشورہ ایک تو یہ ہے اور اس کی حسرت بھی ہے کہ خواتین کو ایک دوسرے سے تعاون کرنا چاہئے انہیں آگے بڑھانا چاہئے۔ اور حوصلہ دینا چاہئے کاٹنا نہیں دینا چاہئے۔ دوسرے یہ کہ کوئی لاکھ کہے آپ وقت ضائع کر رہی ہیں کون ادب پڑھتا ہے آپ یقین نہ کیجئے..... اپنے آپ پر اعتماد رکھئے آپ خود کو منوانے کی جنگ جاری رکھیں تو شاید میری طرح آپ کی پچاس فیصد صلاحیتیں ضرور ضائع ہو جائیں گی اور اگر آپ جنگ جیت لیں تو عصمت آپا کی طرح آسمان ادب کا سب سے چمکدار ستارہ بن سکتی ہیں ادب تخلیق کرنا صلیب اٹھا کر کوڑے کھاتے چلنا ہے۔ بڑی ہمت کی ضرورت ہے۔ ایک بات اور ہے مجھے غلط نہ سمجھئے میں فیمنسٹ کی طرح مردوں اور عورتوں کے ادب کو علیحدہ خانوں میں بانٹنے کی قائل نہیں نہ ان کی طرح یہ ماننے کو تیار ہوں "عورت کم ذہانت کی مالک ہے تو کم ذہن رکھنا خوبی ہو گی۔" عورت کی ذہانت مرد سے قطعاً نہ کم ہے نہ کمتر ہے مختلف ضرور ہے بعض میدان ایسے ہیں کہ اس میں وہ مرد سے زیادہ بھی صلاحیت رکھتی ہے مثلاً انتظامیہ کے شعبے میں دوسری بات میں یہ بھی نہیں سمجھتی مرد عورت کا دشمن ہے بلکہ اپنی خود غرضی کے لئے اس نے جو نظام ترتیب دیا ہے وہ صنف نازک کو زمرے کے کھونٹے سے یوں باندھتا کہ اس کی صلاحیتوں کو دبایا جاتا ہے۔ مجھے اس نظام سے لڑنا ہے۔

☆ اگر آپ کو یہ فریضہ سونپا جائے تو آپ خود کو اردو ادب میں بطور افسانہ نگار، شاعرہ، تنقید نگار کہاں asses کریں گی اور اس assesment سے کس طرح کی توقعات باندھیں گی؟

☆☆ ویسے تو گلزار صاحب آپ ہی میری اتنی قدر دانی کر رہے ہیں اور مرد ہیں سو میں خود کو اچھی افسانہ نگار اور اوسط درجہ کی شاعرہ سمجھتی ہوں..... بہت اچھی تنقید نگار بن سکتی ہوں مگر..... دیکھئے تقدیر کے پردے سے کیا ظہور میں آتا ہے وقت تو گزرا ہی جا رہا ہے۔ شکریہ آپ کا آپ نے آزادی رائے کا موقع دیا۔ میری ایک غزل کے دو شعر دیکھئے:

مڑ کے دیکھا تو آشکار ہوا — دل میں جبر کے تھے کیا انداز
اک شخص کی تھی جا دکار — اور مقابل مرے تھے کتنے محاذ

شیشہ نگر میں اکیلی لڑکی

انور سدید

حمیدہ معین رضوی کی کہانی اس عام پاکستانی لڑکی کی کہانی ہے جو مشرق کے ایک خالص مذہبی گھرانے میں جنم لیتی ہے لیکن جسے ہوا اڑا کر مغرب میں لے جاتی ہے تو وہ اس نئی دنیا کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو جاتی ہے۔ حمیدہ معین رضوی کی کہانی اس خاص تعلیم یافتہ لڑکی کی کہانی ہے جو اعلیٰ تعلیم پانے کے بعد جب لندن جاتی ہے تو لیڈی ڈیانا کے اس ملک سے مرعوب نہیں ہوتی بلکہ اس کی مشرقیت مغرب پر حملہ آور ہو جاتی ہے اور کہانیاں لکھنے لگتی ہے تو وہ مغرب کو تجسیم کرتی ہے۔

کہ شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

اتفاق کی بات ہے کہ جس سال حمیدہ معین رضوی نے ایم اے کیا میں نے اس برس پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت میں ایم اے اردو کیا تھا۔ تقسیم اسناد کے جلسے سے فارغ ہوئے تو ڈاکٹر عبدالسلام خورشید اپنے طالب علموں کے جھرمٹ میں، جن میں زیادہ لڑکیاں تھیں، راجہ اندر بنے چہک رہے تھے۔ شاید اس برس شعبہ جرنلزم کا نتیجہ سو فیصد تھا۔ ڈاکٹر خورشید نے اپنے شعبہ جاتی حریف مرغوب صدیقی کو چاروں شانے چت کر دیا تھا۔ صدر شعبہ کی حیثیت میں شاید یہ ان کی پہلی کامرانی تھی۔ میں اپنے دوست اقبال منہاس کو تلاش کرتا کرتا ان کی طرف نکل گیا تو ڈاکٹر صاحب نے میرے ہاتھ میں کیمرہ دیکھ کر کہا کہ میں ان کے پورے شعبہ صحافت کی ایک تصویر بنا دوں۔

تذکرۃ اقبال منہاس نے میرا تعارف حمیدہ معین رضوی سے کرایا انہوں نے بتایا کہ وہ بھی شہر اقبال میں رہتی ہیں، ان کی ہم وطن ہیں، افسانے لکھتی ہیں۔ ان دنوں اقبال منہاس میرے رسالہ "اردو زبان" میں شاعری کرتے تھے۔ خدا جانے انہوں نے حمیدہ معین رضوی کا افسانہ بھجوایا تھا یا نہیں اور یہ "اردو زبان" میں چھپا تھا یا نہیں لیکن مجھے یاد ہے کہ اقبال منہاس انگریزی پڑھانے کے لئے عدن چلا گیا اور بعد میں دنیا سے ہی روپوش ہو گیا۔

حمیدہ معین رضوی کا افسانہ لندن سے آیا تو وہ "اوراق" میں شائع ہوا۔ اس وقت سے لے کر اب تک میرے ذہن میں حمیدہ معین رضوی ایک ایسی افسانہ نگار کی حیثیت میں محفوظ ہیں جو بلاشبہ مشرق کی ایک مسکین لڑکی ہے لیکن جس کا دل مغرب میں جا کر کہیں اٹکا نہیں۔ وجہ شاید یہ ہے کہ ان کے شوہر نے لندن کے کلچر میں بھی اپنے جنوں کو اور حمیدہ معین رضوی کو فارغ نہیں بیٹھنے دیا۔ ان کی شادی ہوئی تو ان کے شوہر لندن میں زیر تعلیم تھے۔ شادی اس شرط پر ہوئی کہ شوہر دو سال میں تعلیم مکمل کر کے پاکستان آ جائیں گے لیکن جب وہ تین سال کے بعد حمیدہ معین کے ساتھ سیالکوٹ آئے تو انہوں نے لندن میں ایک مکان خرید لیا تھا۔ اور حمیدہ معین رضوی کی گود میں ایک بچہ بھی تھا جو برطانیہ کا باضابطہ اور قانونی شہری تھا۔ سو اس وقت سے حمیدہ معین رضوی پاکستان سے کٹی ہوئی اور لندن سے جڑی ہوئی ہیں۔ بریڈفورڈ سے مقصود الٰہی شیخ اپنا رسالہ "راوی" بھیجتے ہیں تو اس میں ان کے افسانے چھپے ہوتے ہیں، ان ادبی محفلوں کا تذکرہ ہوتا ہے جن میں حمیدہ معین شرکت کرتی ہیں۔ پاکستان میں انہوں نے "اوراق"، "ادب لطیف" اور "تخلیق" کے ساتھ مضبوط رابطہ قائم کر رکھا ہے لیکن انہیں گمان ہے کہ ان کی "پی آر" کمزور ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ "اوراق" میں لکھ کر انہوں نے اپنے ادبی دشمنوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ چنانچہ احباب افسانہ نگاروں کی جتنی لمبی کھتاونیاں بنائیں اس میں آپ کو حمیدہ معین رضوی کا نام نظر نہیں آئے گا۔ حمیدہ معین کی شرافت ہے کہ وہ احتجاج نہیں کرتیں۔ نہ اس لمبی فہرست میں نام لکھوانے کے لئے کسی کو لندن آنے جانے کا ٹکٹ بھجواتی ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اگر وہ صرف ایک خط لکھ دیتیں تو انہیں ہاجرہ مسرور اور فہمیدہ ریاض کے ساتھ اور پروین شاکر اور منصورہ احمد سے اوپر جگہ مل سکتی تھی لیکن انہوں نے

"احسان ناخدا کا اٹھائے مری بلا"

کے مصداق اپنے فن کی کشتی اظہر جاوید اور صدیقہ بیگم کے ساکن سمندروں میں چھوڑ دی اور صرف اتنی شہرت پر قناعت کی جو مٹائے مٹ نہیں سکتی۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ "تخلیق" اور "ادب لطیف" میں لکھ کر ان کی "پی آر" محدود نہیں رہی بلکہ اس کا دائرہ مغرب اور مشرق کی ان اکناف تک پھیل گیا ہے جہاں ادب کے غیر سیاسی لوگ آباد ہیں اور ادب کو ذوق کی عبادت سمجھ کر پڑھتے اور اسے تجارت بنانے سے گریز کرتے ہیں اور اب عالم یہ ہے کہ حمیدہ معین "تخلیق" اور "ادب لطیف" کی قلم کار نظر نہیں آتیں بلکہ وہ اظہر جاوید اور صدیقہ بیگم کے اس کنبے کی فرد نظر آتی ہیں جو ہر ماہ ایک باوقار رسالے کی صورت میں ہمارے سامنے آتا

ہے

اب حمیدہ معین رضوی سے مجھے ایک اور ملاقات بھی یاد آ رہی ہے چند سال پہلے وہ لاہور آئیں تو "اوراق" کے مستقل قلمی معاون کی حیثیت میں سائرہ ہاشمی کے ساتھ مدیر اوراق ڈاکٹر وزیر آغا سے بھی ملنے آئیں۔ حامد خان بھی وہاں موجود تھا۔ اس روز سائرہ لاہور کے ادیبوں سے کچھ نالاں تھیں۔ حالانکہ ان دنوں نہ تو کشور ناہید کی "بری عورت کی کتھا" چھپی تھی۔ نہ جاوید شاہین نے اپنے ملو سال کا حال بیان کیا تھا۔ نہ افتخار نسیم کی "پچھڑی" کی کتاب "نرمان" یہاں پہنچی تھی اور نہ غزالہ خاکوانی کا لاہور کے مرد ادیبوں کے بارے میں مشہور و معروف انٹرویو چھپا تھا۔ سائرہ ہاشمی نے "زمانے کو برا" اظہار کیا اور کچھ یوں بتایا کہ وہ اتنی تنہا ہو گئی ہیں کہ جس گھر میں مرد شاعر یا ادیب اکیلا رہتا ہو وہاں جاتی ہی نہیں ہیں۔" میرے منہ سے ازراہِ مذاق نکلا

"بی بی۔ یہاں بھی تو دو مرد ادیب ہی بیٹھے ہیں۔"

سائرہ نے اپنی روایتی سادگی سے جواب دیا "ہم آپ کو مردوں میں شمار نہیں کرتے۔"

اس جملے پر حمیدہ معین کھلکھلا کر ہنسیں لیکن وزیر آغا اور میرے لئے شرمندگی کی کوئی بات نہیں تھی۔ کیونکہ ہم میں بھی بنانے اور باعزت ذکر حق ادا کرنے کی صلاحیت نہیں ہے لیکن عورت کو ہمیشہ احترام کا بلند مقام دیتے ہیں۔" اس روز حمیدہ معین رضوی نے ترجیحی مردوں میں زندگی باوقار انداز میں کرنے کا جو اسلوب بتایا وہ یقیناً برطانوی معاشرے کی عطا تھی۔ دراصل ان کی اس روز کی جرأت مندانہ باتوں نے ہی مجھے آج یہ مضمون پڑھنے کی ہمت عطا کی ہے

بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ بہت عرصے پہلے حمیدہ معین افسانے کی دنیا میں غائب ہو گئی تھیں۔ پھر اچانک ایک دھماکہ ہوا اور حمیدہ معین اظہر جاوید کے رسالہ "تخلیق" سے ایک نقاد کی حیثیت میں نمودار ہوئیں اور انہوں نے عالمی شہرت کے ناول نگار سلمان رشدی کو دھوکنا شروع کیا تو پھر اسے تخلیق کی کئی اشاعتوں میں دھکیلتی چلی گئیں۔ اس زمانے میں حمیدہ معین رضوی کی افسانہ نگاری پر ان کی تنقید غالب آ گئی تھی اور کئی خواتین افسانہ نگاروں نے سجدہ شکر ادا کیا کہ اس میدان سے ان کی ایک حریف تو کم ہوئی۔ افسوس یہ ہے کہ جب حمیدہ معین تنقید لکھ رہی تھیں تو اردو کی واحد خاتون تنقید نگار ممتاز شیریں اس دنیا سے رخصت ہو چکی تھیں اگر زندہ ہوتیں تو حمیدہ معین رضوی سے افسانے کی بجائے تنقید لکھنے کا تقاضا کرتیں۔ انہیں ادبی تنقید میں اپنی شہرت کو مستحکم کرنے کا مشورہ دیتیں۔ لیکن تنقید ان کا عارضی پڑاؤ ثابت ہوا اور وہ اس عارضہ میں تھوڑی سی آبلہ پائی کے بعد پھر افسانے کی خوش رنگ وادی میں آ گئیں۔ چنانچہ حمیدہ معین نے اب تک جتنے جھنڈے گاڑے ہیں وہ سب افسانے کے میدان میں ہی گاڑے ہیں لیکن کیا پتا تھا کہ ان کے باطن میں ایک شاعرہ بھی موجود تھی۔ اس شاعرہ کی نمود تو بچپن میں ہی ہو گئی تھی لیکن انہوں نے اپنے والد کے اس مشورے پر عمل کیا کہ

"پہلے تعلیم مکمل کرو پھر شاعری کرنا۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حمیدہ معین نے تعلیم کی طرف پوری توجہ دی تو شاعری کا راستہ بھول گئیں۔ انہوں نے اپنے والد گرامی کی زندگی میں شاعری نہیں کی۔ اگر کی ہے تو والد سے پوشیدہ رکھی۔ کاش! وہ ان کی زندگی میں اپنے فن کا یہ تخلیقی روپ بھی انہیں دکھاتیں اور ان کے مشوروں سے استفادہ کرتیں۔

"دشتِ جگر" حمیدہ معین رضوی کی شاعری کی کتاب ہے۔ افسانوں کے دو معروف مجموعوں کے بعد یہ شاعری کی کتاب بھی اسی طرح ایک دھماکہ ہے جس طرح انہوں نے سلمان رشدی پر سلسلہ مضامین لکھ کر دھماکہ کیا تھا۔ میں اس دھماکے سے ابھی جانبر نہیں ہو سکا اس لئے پہلے اس کتاب کا پیش لفظ اور حمیدہ معین کی خود نوشت پڑھی۔ نثر کی یہ تحریریں اتنی خیال انگیز اور معلومات افزا ہیں کہ شروع کریں تو قاری شاعری کا راستہ بھول جاتا ہے۔ ان دو تحریروں میں آپ کی ملاقات نہال چند شریعت سیالکوٹ میں پرورش پانے والی اس معصوم سی دھان پان لڑکی سے نہیں ہوتی جس نے تعلیم مکمل کی تو اگلے سال شادی کے بندھن میں باندھ دی گئی۔ ان میں ہماری ملاقات اس دلیر اور جوش ہمت خاتون سے ہوتی ہے جس نے آنچل کو پرچم بنا رکھا ہے اور جو مشرقی عورت کی آزادی تحفظ نسوانیت کے مضبوط حربے اور جذبے سے کر رہی ہیں اور حریص ادیبوں کے پاکستانی معاشرے میں کسی سے بات کرنے سے نہیں گھبرائیں۔ میں ان دو نثری تحریروں کے سحر میں گرفتار ہوں۔ ان کا تاثر کم ہوگا تو آہستہ آہستہ "دشتِ جگر" کی شاعری پڑھوں گا اور یہ دیکھنے کی کوشش کروں گا کہ معاشرے کو آنکھیں دکھانے والی یہ خاتون شاعری میں انقلاب کا نعرہ کس طرح بلند کرتی ہے۔

دشتِ غربت کی مسافر

محسن بھوپالی

حمیدہ معین رضوی ہر چند کہ ایک مدت سے دیارِ مغرب میں مقیم ہیں لیکن وہ اپنی شاعری کے ذریعے پاکستان کے ادبی حلقوں میں بھی پوری طرح متعارف ہیں۔ وہ کافی عرصے سے شعر کہہ رہی ہیں۔ چند برس پہلے ان کا ایک شعری مجموعہ "دشتِ نگر" کے نام سے شائع ہو چکا ہے جسے اہلِ ذوق قارئین کی خاطر خواہ پذیرائی حاصل ہوئی تھی۔

حمیدہ معین رضوی نے غزلیں بھی کہی ہیں اور نظمیں بھی۔ انھیں ہر دو اصناف پر بہت حد تک دسترس حاصل ہے۔ غزلوں میں وہ اپنی بات اپنے انداز میں کہنے کا سلیقہ جانتی ہیں۔ انہوں نے بیشتر غزلیں اساتذہ اور ہم عصر شعراء کی زمینوں میں کہی ہیں اور نئے رخ اور نئے زاویے سے شعر کہے ہیں۔

چند شعر ملاحظہ کیجئے:

قصۂ عشق مرا قصۂ دوراں نکلا
جس کو بھی دیکھا یہاں سوختہ ساماں نکلا
پارسائی کا لبادہ تھا بدن پر سب کے
سچ کے آئینے میں ہر شخص ہی عریاں نکلا

☆

دشت کی اندھی مسافت میں رفیقِ جاں جو ہو
ہر قدم پر پاؤں کو وہ آبلہ بھی مل گیا

☆

آنگن میں اترتی ہوئی شاموں کی اداسی
اور دل میں چھپے درد کی صورت بھی وہی ہے

ان کی بعض غزلیں تسلسلِ آہنگ اور وحدتِ تاثر کی عمدہ مثال ہیں۔ حوالے کے طور پر یہ اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں۔

تنہائی کے اس دشت میں جاری جو سفر ہے
اک عمر کو اس دل سے لگائے ہوئے ہم ہیں
بے مہری حالات کا شکوہ بھی کریں کیا
جب اپنے ہی لوگوں کے ستائے ہوئے ہم ہیں
باطن میں بپا شور ہے محشر سا بظاہر
چہروں سے ہر آواز چھپائے ہوئے ہم ہیں
یہ برف سے لمحے بھی گزر جائیں گے اک دن
اس آس پہ خوابوں کو جگائے ہوئے ہم ہیں

حمیدہ معین کے یہاں غزل کے بعض ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جو ان کے نمائندہ اشعار کہے جا سکتے ہیں۔ میرے نزدیک اس معیار کے اشعار کسی بھی شاعر کے لئے سرمایۂ سخن کا درجہ رکھتے ہیں۔

جلتے جلتے رکھ گیا دُکھ کا ہتھیلی پر چراغ
غم کی صورت دیکھنے کو آئینہ بھی مل گیا
قدروں کے ضابطوں میں خسارہ ہی لکھا ہے
ہستی میں خساروں کو بڑھائے ہوئے ہم ہیں

☆

فلک سے ٹوٹ کر ستارہ اک گرا نصیب کا
ہتھیلیوں پر اک نئی لکیر بن کے رہ گئی

حمیدہ معین غزل سے زیادہ نظموں میں اپنی تخلیقی صلاحیت کو اجاگر کرنے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔ ان کی نظمیں فکری تازہ کاری، ندرتِ الفاظ اور نئی طرزِ ادا کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ مثلاً ان کی نظم "منزل دور ہے اب تک" میں انہوں نے دنیا کے سفر اور زندگی کے سفر میں جو ہمہ وقت تلاش کی ہے اسے بعض پیش رو شعراء نے بھی اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ حمیدہ نے بھی دنیا کو ایک نئے رخ سے دیکھا ہے اور اپنے مشاہدے کو اس طرح قلم بند کیا ہے:

مثالِ کارواں چلا ہی رہتا ہے
کہیں پر سست رو ہوتا،
کہیں سیلِ بلا ہوتا
کبھی وسعت میں بستی اور بیاباں کو
لبھاتا ہے کشش سے گرم جوشی سے وہ ہر اک کو
گلے ملتا ہے وہ اک سرخوشی سے اور
سما جاتا ہے ہستی کی ہر اک شے میں
نمو دیتا ہے ہر اک جزوِ ہستی کو
مگر رہتا رواں ہے وہ بھلا رکتا کہاں ہے وہ
اگر پانی ٹھہر جائے تو تعفن دینے لگتا ہے

وہ اس نظم کو اگلے مصرعوں میں کلائمکس پر پہنچا کر نہایت چابک دستی سے ختم کر دیتی ہیں:

حیات اس کی سفر میں ہے
حیات اپنی سفر میں ہے... تو یہ جانا
کہ مجموعہ محبت اور حرکت کی جنوں خیزی

ہمیشہ آگے بڑھتے رہنے کی جرأت
اصولی اتفاق اجزائے ہستی میں
چھپی ہے داستاں اک شادکامی کی
چلو آؤ... چلیں ہم سب سفر پر اب
کہ منزل دور ہے اب تک!

ان کی ایک اور نظم "کون سوچے گا" احساس کی سطح پر نہایت پُر اثر نظم ہے اس کا آغاز ہی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اس نظم میں وحشتِ غربت کے مسافر کا جیتا جاگتا کردار نظر آتی ہیں:

بچھڑتے وقت سوچا تھا بچھڑ کر مل بھی جاتے ہیں
کہ ہم سب ہی سفر میں ہیں
سفر میں زندگی کے موڑ اک ایسا بھی آئے گا
جہاں پر چند ساعت کو نگاہیں چار تو ہوں گی
ٹھٹک کر دیکھ تو لیں گے

اس نظم کا اختتام یاسیت کی فضا میں ہوتا ہے اس طرح شاعرہ قارئین کو ایک بھرپور تاثر دینے میں کامیاب نظر آتی ہے

میں قرنوں کی مسافت میں
ہر اک رستے میں ہر اک موڑ پہ گاڑ آئی تھی آنکھیں
تو وہ ساعت بشارت کی
ہجوم حادثاتِ زندگی کے بوجھ سے دب کر
کبھی کی مر چکی ہو، مٹ چکی ہو!
.... اور اب تو دیدہ و دل منتظر ہیں
میں آنسو روکے بیٹھی ہوں
میں اس نامہرباں ساعت کو اب رونے لگی ہوں
جو آ کر بھی نہیں آئی
تو پھر اب کون سوچے گا غلط کیا ہے؟
صحیح کیا ہے؟

آخر میں اُن کی نعت اور بالخصوص نظم "حبل الورید" (مناجات) کا ذکر ضروری سمجھتی ہوں۔ ان کی نعت عقیدت و ارادت کی ترجمان ہے جب کہ "حبل الورید" میں خالق کائنات کی انسان پر فیاضانہ تجلیات اور انسان کی ناسپاسی اور کج روی کو حمیدہ معین نے شعری پیرائے میں اس قدر رواں اور بھرپور تاثر کے ساتھ ادا کیا ہے کہ بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے بلاشبہ یہ ان کی بہترین نظموں میں شمار کی جائے گی۔ نظم اس طرح شروع ہوتی ہے

کروں نا کروں پہلے آسماں کے
سکوت اور خلاء سے پرے جانے کیا
میرے افکار کی جست سے ماورا
میری تخلیق کی تعبیر سے لامکاں
بے کلی؟ بے کلی؟؟
وسعتوں سے سوا فاصلوں سے بڑا
ورے سے ورا جس کو ہم نے کہا
اس لئے ہم نے خود کو بہت دکھ دیا
اپنے اندر کے شیطان سے بے خبر
اپنے اندر کے انسان سے بے بصر
فرقتوں میں گھرے خول میں ہیں گھسے
جانتے ہیں نہیں.... مانتے ہیں نہیں۔

... اور ان مصرعوں پر ختم ہو کر پڑھنے والے کے ذہن پر انمٹ نقوش چھوڑ جاتی ہے

میرے افکار کی عرش کی تزئین سے
میرے سجدوں دعاؤں کی تسکین سے
ہے وہی میرا رب میرا خالق وہی جو
ہر اک آدمی کے نہاں خانۂ دل میں مستور ہے
اس لئے آدمیت ہے پہچان میری
میرا خالق تو شہ رگ سے نزدیک ہے!

مجھے یقین ہے اگر حمیدہ معین رضوی نے اپنا تخلیقی سفر اسی طرح جاری رکھا تو مستقبل میں ان کا شمار اردو کی اہم شاعرات میں کیا جائے گا۔

عورت کی مظلومیت کا قصہ

پروفیسر ڈاکٹر ممتاز احمد خان

اس وقت ہماری جانی پہچانی کہانی کار حمیدہ معین رضوی کے دو افسانے میرے پیش نظر ہیں۔ یہ ہیں "بڑے بھیا" اور "کوکا بھی تا".... دونوں افسانے اپنی ضخامت میں طویل مختصر افسانے سے چھوٹے اور مختصر افسانے سے بڑے ہیں اور ایسی جزئیات سے بھرپور ہیں جس کا تقاضا ناولٹ کرتا ہے۔

ہمارے افسانوی ادب میں عورت کی مظلومیت کا قصہ مسلم الثبوت ہے لیکن اس حقیقت سے مفر ممکن نہیں کہ ظلم اور اضافی جیسی زیادتیاں جس قدر خواتین کے حصے میں آتی ہیں شاید مردوں کے حصے میں نہ آتی ہوں۔ خواتین چونکہ صنف نازک ہیں اور بچوں کی پیدائش کے تکلیف دہ عمل سے لے کر گرہستی کے بارگراں جو زبردست ذمہ داریاں ان کو نبھانا پڑتی ہیں ان کے پیش نظر پڑھنے والوں کا دل ان پر روا رکھے جانے والے ظلم پر پسیجنا کڑھتا ہے۔ کچھ ناقدوں کا خیال ہے کہ خواتین افسانہ نگار عورتوں کو ضرورت سے زیادہ ہی مظلومیت کی علامت بنا کر پیش کرتی ہیں۔ کہیں کہیں یہ رائے درست ہو سکتی ہے لیکن میں پھر کہوں گا کہ چونکہ عورت مرد کی زیادتیوں کا زیادہ تر بوجھ سہارتی ہے اس لیے یہ موضوع سدا بہار ہی رہے گا۔ عورت کا معاملہ یہ بھی ہے کہ وہ عورت کے بھی ظلم سہتی ہے یعنی بہو ساس اور نندوں کی شاطرانہ چالوں کا بھی اسے شکار بننا پڑتا ہے۔ بہر صورت عورت کی مظلومیت کا موضوع ہمارے مشرقی معاشرے میں معنی رکھتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ افسانہ نگار واقعیت اور حقیقت پسندی کے زور پر اس موضوع کو اس طرح پیش کرے کہ قارئین محسوس کریں کہ ہمارے معاشرے میں واقعی خواتین چکی کے دو پاٹوں کے بیچ پس رہی ہیں۔

افسانہ "بڑے بھیا" میں اس کی ہیروئن شاہینہ ایک باشعور خاتون ہوتے ہوئے بھی اپنے بڑے بھیا کو غلط پالیسی کے ہاتھوں ایک طویل عرصہ آہوں اور سسکیوں کے درمیان گزارنی رہی ہے بچپن میں وہ گڑیا گڈے جیسا کھیل رچاتی ہے اور اپنے کزن انور کی دلہن بنتی ہے اس وقت بھی اس کے بڑے بھیا اپنے زہر لیے جملوں سے اس کو تکلیف پہنچاتے ہیں اور یہ بات کرتے ہیں کہ لڑکی کی شادی کا مطلب ہے ماں باپ سے عمر بھر کی جدائی۔ وہ اس کے بچپن کے جذبات کو کچلتے رہتے ہیں لڑکی کی وہ جبلت جو اسے بچپن ہی سے اپنے پیا کے گھر جانے کی ذہنی تیاری کراتی ہے اسے وہ کچلنے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہتے ہیں۔ وہ ذہنی طور سے ایک بیمار کردار ہیں۔ شاہینہ کی والدہ اس کی شادی اوائل عمری ہی میں کرنا چاہتی ہیں لیکن بڑے بھیا انور کو غلط سوسائٹی کا کردار بنا کر پیش کر کے اسے کالج کی تعلیم دلواتے ہیں۔ بی اے کے بعد اسے ایم اے کراتے ہیں تا کہ کسی طرح اس کی شادی نہ ہو سکے وہ حوالی فضاری جیسے مخلص کردار کو بھی اس کے راستے سے ہٹا دیتے ہیں۔ خود ان کی شادی ہو جاتی ہے اور چھوٹے بھیا کی بھی....!

بڑے بھیا ایک انوکھے کردار ہیں ایک مکمل ولن۔ ایک سادیت پسند Sadist انسان جو بہن کی خوشیوں میں زہر گھولنے کے لیے ہر وقت تیار ہے۔

ادھر شاہینہ جو پیکر وبے بغاوت کی ہمت نہیں کر پاتی۔ بڑے بھیا تو اس کی خوشیوں کے سب سے بڑے مخالف ہیں ہی اس کی بھاوجیں بھی اس سے مخاصمت کا رویہ روا رکھتی ہیں۔

آخر نزہت باجی جو چالیس سالہ بیوہ خاتون ہیں۔ اس کی حالت پر ترس کھاتی ہیں اس کے خیالات کو انقلابی انداز سے بدل دیتی ہیں اور ساتھ ہی عملی مدد کر کے بڑے بھیا کے اعصاب کو توڑ دیتی ہیں۔ وہ اپنے معمولی سے شکل وصورت والے بھائی نعمان کو اس سے شادی کے لیے پیش کر دیتی ہیں نعمان کو اس کی کزن بدصورت قرار دے کر مسترد ہونے کے باوجود ٹھکرا دیتی ہے نعمان سے اس کی ایک باغ میں ملاقات ہوا اس کا جذباتی ہو کر اسے لپٹا لینا اس کی شادی کی شدید ترین خواہش کو مہمیز لگا دیتا ہے اور وہ اپنے بڑے بھیا کو ایک ایسا خط تحریر کرتی ہے جس کی بڑے بھیا کو قطعا امید نہ ہوگی دوسری جانب نزہت اپنے بھائی کا رشتہ جو کہ چالیس سال کا ہے بڑے بھیا کے سامنے پیش کر دیتی ہیں اور ساتھ ہی یہ بات بھی واضح کر دیتی ہیں کہ قانون شاہینہ کی موافقت میں ہے۔

بڑے بھیا رشتہ قبول کرنے کے باوجود بھی ایک رات قبل اس سے کہتے ہیں کہ وہ انکار کر دے۔ وہ نفی کو اسا جواب دیتی ہے۔

آخر کار بھیا ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور ایک شکست خوردہ انسان کی حیثیت سے ان کی نگرانی میں نکاح اور رخصتی کے مراحل طے ہوتے ہیں۔ مگر ان کی سنگ دلی اور شقاوت قلبی اپنی جگہ موجود ہے یہ دونوں زہر آلود عناصر اب شاہینہ کو گزند نہیں پہنچاتے بلکہ ان کا ہی گلا گھونٹ دیتے ہیں۔

میں نے شروع میں لکھا تھا کہ وہ ایک انوکھے کردار ہیں۔ ایک مکمل ولن ایک سادیت پسند شخص جو ایک طویل عرصے تک اپنی معصوم بہن کی خوشیوں پر شب خون مارتا رہتا ہے اور پھر ہار جاتا ہے۔ وہ مقاومت نہیں کر سکتا مجھک نہیں سکتا لچک نہیں کھا سکتا ٹوٹ سکتا ہے۔

مجھے ایملی برانٹے کا کردار ہیتھ کلف یاد آتا ہے جو اس کے معروف ناول ووذرنگ ہائٹس (wuthering heights) کا ایک اہم ترین کردار ہے یہ ناول عشق بلا خیر کی ایک زبردست داستان ہے۔

شاہینہ جو کہ مشرقی روایت میں جکڑی ایک بے بس و مظلوم عورت ہے زندگی کے ایک ٹرننگ پوائنٹ (turning point) پر آزادی حاصل کر لیتی ہے اور یہ ٹرننگ پوائنٹ ہے نعمان جسے عورت کے لیے تڑپتے ہوئے شخص سے محض ایک جذباتی مگر نفسیاتی و جنسی کیفیت کی بیداری جو آزادی کی تحریک کا سبب ہے۔ ساتھ ہی نزہت باجی کا وجہ شفقت اور انسانی ہمدردی کا بے مثال رویہ۔ نزہت باجی جیسے کردار اگر نایاب ہیں تو ان کی ہمارے معاشرے میں اہمیت اور ضرورت کا جواز بھی بنتا ہے۔ شاہینہ میں آزادی کا جذبہ بیدار کرنا باشعور عورت کی ذمہ داری ہے خصوصاً وہ عورت جو شوہر سے محروم ہو گئی ہے۔ یہ اخلاقی کردار ہے اور مظلوم انسان کو کسی نہ کسی موڑ پر ضرور ملتا ہے۔ صرف صادق جذبے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی پر ضرورت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ تقدیر بھی انسان کا ساتھ دیتی ہے۔ اتفاقات منجانب تقدیر یا منجانب خدا ہوتے ہیں اس مابعد الطبیعیاتی عنصر کا احساس مشاہدے اور تجربے دونوں سے ہوتا ہے۔ بڑے بھیا اگر شر کے نمائندے ہیں تو نزہت باجی خیر کی۔ زندگی میں خیر و شر کے ڈرامے چلتے رہتے ہیں کبھی جیت ہے تو کبھی ہار۔ شاہینہ مشرقی روایت کے تحت اطاعت شعار اور ایثار پسند ہے تو یہی اقدار اس کی پشت پناہی کرتی ہیں اور کامیابی کا سبب بنتی ہیں۔ شاہینہ کی جیت اس عورت کی جیت ہے جو کبھی نہ کبھی جاگ جاتی ہے اس کا مشغل بنے رہنا اس کے وقار کی موت ہے۔ معاشرے کے قوانین، روایات، رسوم اور پابندیاں اگر عورت کو اس کے جائز حق سے محروم کریں تو اس کے خلاف کھڑے ہو جانا اور شر کی قوتوں کو بے دم کرنا از بس ضروری ہے۔ افسانہ بڑے بھیا سے اس تاثر کا اخذ ہونا وقت کی بڑی ضرورت ہے۔

ادب انسانی زندگی میں دخیل بھی ہے پڑھنے والے پر اس کے دیرپا اثرات مرتب ہوتے ہیں خواہ ان کی تعداد کم ہو۔ اب اسے کیا کہیے کہ ہر عہد میں شر کی قوتیں نیا جال لے آتی ہیں اور پھر سے وہی ڈراما اور وہی مبارزت شروع ہو جاتی ہے لیکن خیر کی ضرورت کا احساس بھی جاوداں ہو سکتا ہے۔

حمیدہ معین رضوی کا یہ افسانہ ان کی عورت کی سائیکی (psyche) کے ادراک کا احساس دلاتا ہے۔ ایک چھوٹی سی بچی سے لے کر جوان ہو جانے والی خواب دیکھتی رہنے والی عورت جسے شوہر اور بچے اور پرسکون خانگی زندگی چاہیے جو اس کے بغیر ادھوری ہے اور زندہ ہوتے ہوئے مردوں سے بدتر۔ یہ کہنا چاہیے بھی نہیں کہ عورت کی سائیکی کو عورت بہتر سمجھتی ہے اسی لیے اس کے باطن کا اظہار خواتین افسانہ نگاروں نے اچھے انداز سے کیا ہے۔ اس افسانے میں بھی شاہینہ کے اندرون کا حمیدہ معین رضوی نے بہت خوب جائزہ لیا ہے اور یہ عورت ہر عہد ہر جگہ اور ہر جگت کی عورت ہے اس کی مثال دیکھیے۔

"جیسے وہ تنہا ایک باغ میں کھڑی ہے وہاں اردگرد بڑے خوب صورت پھول ہیں درمیان میں ایک گہرا کنواں ہے پھر یکایک کنویں میں سے ایک ستون نمودار ہوتا ہے وہ ستون بڑھنے لگا بڑھتا چلا گیا آسمان تک، پھر اس ستون میں سے ایک نوجوان اترتا ہے اور اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے.... آؤ بھاگ چلیں ... کدھر سے؟ وہ چاروں اور دیکھتی ہے مضبوط سیاہ آہنی دیوار اس کے چاروں سمت کھڑی ہے سارے میں تو قیدی ہوں میں کیسے نکل سکتی ہوں۔"

یہ حوالہ ہر اس عورت کا ہے جو خوابوں اور وسوسوں کے درمیان ناامیدی کی صلیب پر لٹکا دی جاتی ہے۔ یہ کہانی دہرائی جاتی ہے اور دہرائی جاتی رہے گی مگر حل وہی ہے جو اس افسانے میں دیا گیا ہے بڑے بھیا جیسے کردار کے یہ خیالات کہ ... تم کسی مرد کے قریب ہو کر دیکھو وہ گدھ کی طرح جھپٹ کر تمہارا گوشت نوچ ڈالے گا اور ہڈیوں کا پنجر چھوڑ کر کسی تازہ شکار کی تلاش میں نکل پڑے گا... محض زہریلے خیالات ہیں جن میں کوئی سچائی نہیں.... سچائی اس خط میں ہے جو اس نے بڑے بھیا کو لکھا اور اس عمل میں پنہاں ہے جس نے اسے آزادی دلائی اور طویل عرصے بعد خواب کی تعبیر بہم پہنچائی۔

شاہینہ کی زندگی کے واقعات کو جس ترتیب سے حمیدہ معین رضوی نے بیان کیا ہے وہ اپنے اسلوب میں فطری ہیں اور قاری کو ان کے بیان کردہ منظرنامے میں شریک کر لیتے ہیں بیانیہ کی خوبی یہ ہونا چاہیے کہ پڑھنے والا پڑھتا چلا جائے اپنے اس فن میں وہ طاق ہیں اس افسانے میں 'بڑے بھیا' جیسا انوکھا منفرد اور ناقابل یقین کردار تخلیق کر کے انہوں نے یہ احساس دلایا ہے کہ وہ ایسے کردار کو بھی تخلیق کر سکتی ہیں جو خال خال پائے جاتے ہیں اور قارئین کے اطراف میں کہیں چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایسے ہی کردار بلکہ یوں کہا جائے کہ ایسے ہی کسی ناقابل یقین واقعے کو زندگی سے اخذ کر کے دکھانا ہی کسی افسانے کی خوبی ہے۔ بڑے بھیا بیمار ذہنیت کا شکار ہیں اور خود ہی موت کی سولی پر لٹک جاتے ہیں۔ اس حوالے سے افسانہ اپنا اثبات کراتا ہے۔

ان کا دوسرا افسانہ "کوکا بھی تا ..." عورت پر مرد کے ستم کی وہ داستان ہے جو ۱۹۵۵ء سے اب تک بار بار دہرائی جا رہی ہے۔ رشتوں کے سلسلے میں لڑکیوں کی خاموشی اور رشتہ طے کرنے والے لوگوں کی جلد بازی کو بے حسی بلکہ بے وقوفی معصوم لڑکیوں کو دکھ کے دلدل میں جس طرح گراتی ہے وہ بھی ہمارے معاشرے کی احمقانہ روایات سے ہم آہنگ ہے۔

"کوکا بھی تا ..." میں شبینہ کی بدبختی کا آغاز ۱۹۵۵ء سے ہوتا ہے جب اسے بے سوچے سمجھے ایک بے ہودہ اور عورت دشمن شخص کے پلے باندھ دیا جاتا ہے جو برطانیہ میں اس پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑتا ہے۔ یہ واقعات آج بھی پیش آ رہے ہیں اور دیار غیر میں نامعلوم کتنی لڑکیاں اس ظلم کی بھینٹ چڑھ چکی ہیں اور کتنی ہیں جنہیں جسمانی اور نفسیاتی کچوکے کھانے کے بعد آزادی نصیب ہوتی ہے یہی حال شبینہ درانی کا ہے جسے ۱۹۵۵ء میں ایک بہتر معاشی و سماجی مستقبل کے پیش نظر کم عمری میں ایک بے حس، عیاش، کم ظرف اور ظالم شخص

جمشید کے پلے باندھ دیا جاتا ہے پوری شادی ایک پراسرار ماحول میں ہوتی ہے۔ جمشید کے بڑے بھائی اور ماں رشتے کے سلسلے میں شبینہ کی بہن اور بہنوئی پر چھائے رہے اور جمشید خاموش رہا۔ اسے توقع تھی کہ خوب نقدی اور زیورات ملیں گے جس سے وہ لندن میں عیش کرے گا اس کے پاس تو کچھ نہ تھا سوائے لندن پہنچنے کا کرایہ کے نہ تھا جب کہ صورت حال یہ تھی کہ شبینہ کی بہن اور بہنوئی مڈل کلاس کے وہ لوگ تھے جو رزق حلال میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ شبینہ کے ماں باپ مر چکے تھے اسے بہن اور بہنوئی نے پالا تھا۔ بہنوئی ایک ہیڈ ورکس پر اوورسیر تھے اور رزق حرام سے نفرت کرتے تھے۔ انہوں نے سوچا کہ یتیم بچی کا مستقبل سنور جائے گا زیادہ چھان بین نہ کی جس کی کہ سخت ضرورت تھی۔ آج جب کہ ذرائع مواصلات ترقی کی معراج پر ہیں، اسی قسم کے واقعات پیش آرہے ہیں اس لیے کہ لوگ دھوکا دہی میں طاق ہیں اور لڑکے کی مائیں بھی معصوم لڑکیوں کی قسمتوں کو بگاڑنے میں پیش پیش ہیں۔ اس قسم کے اسکینڈل بھی اخبارات کی زینت بنتے رہے ہیں کہ ایک گھرانے کے افراد لاہور، راولپنڈی، کراچی، کوئٹہ ہے اور افسانے کو ۱۹۵۵ء سے شروع کر کے نصف صدی کے دوران معصوم لڑکیوں کے ساتھ ہونے والے اس مخصوص ظلم کو حقیقی تفصیلات اور جزئیات کے ساتھ آشکار کیا ہے۔

شبینہ درانی کا کیس بھی "بڑے بھیا" کی شاہینہ سے مختلف نہیں ہے۔ وہ بھی ستم رانی کا لمبے عرصے تک چلتا ہی ہے اور جمشید جیسے شقی القلب، زانی مجرم اور شرابی کی زیادتیاں برداشت کرتی ہے۔ اس پر آفرین ہے کہ وہ انتہا سے زیادہ صبر و سکون کے ساتھ اپنے تاریک وقت کو کاٹتی ہے۔ اس کا بچہ بھی بڑا ہو جاتا ہے اور میڈیکل لائن میں کامیابی حاصل کرتا ہے۔ ادھر وہ خود سوشل ورکر جیسے مفید سلسلے اور اس کی ہمت افزائی کے تحت قانون کے شکنجے پہنچ جاتی ہے جب کہ جمشید جوئے، شراب اور دیگر جرائم پیشہ سرگرمیوں میں مبتلا ہو کر آخر کار جیل کی ہوا کھاتا ہے لیکن اس کی اسے دھمکیاں برقرار رہتی ہیں۔ ایک لمبے عرصے تک وہ سوشل ورکر کی آدھی رقم زبردستی لے جاتا رہا ہے۔ اس دوران شبینہ درانی کا صبر و تحمل سنہرے الفاظ میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ عورت کے لیے جلد بازی اور بے وقوفانہ اعمال کے طعنے دیے جاتے رہے ہیں اور دیے جاتے رہیں گے تاہم اسے اپنے بچوں کا مستقبل بنانے کی خاطر ظلم و زیادتیاں سہتے ہوئے زبردست برداشت، صبر و تحمل اور اپنی ذات کی نفی کے اعمال کے صدقے صد فخر ملتے رہے ہیں اسی میں عورت کی عظمت پوشیدہ ہے اور شاید اسی لیے ماں کے قدموں تلے جنت کا تصور باری تعالیٰ کی جانب سے تشکیل دیا گیا ہے۔

اس افسانے میں بھی حمیدہ معین رضوی نے یہ ثابت کیا ہے کہ وقت اور تقدیر ہمیشہ عورت کی مدد کو آتے ہیں۔ وقت سدا ایک سا نہیں رہتا۔ تاریکی ہی میں روشن دن کا ظہور ہوتا ہے۔ یہ نقطہ نظر یا زندگی کے بارے میں وژن مثبت اور تعمیری ہے اور ہم اس کا مشاہدہ اپنی زندگیوں میں کرتے رہتے ہیں خواہ افسانے کی تشکیل مشرقی ماحول میں ہو یا برطانیہ کی سرزمین پر۔ چوں کہ حمیدہ معین رضوی برطانیہ یا انگلستان میں مقیم ہیں اس لیے ان کی نظریں اپنے ہم وطنوں پر گزرنے والی ظالمانہ وارداتوں پر گہرے طور پر پڑتی ہیں اس طرح ان کے ہاں دو مختلف ساجوں کا احاطہ ہو جاتا ہے۔

اس افسانے کے اختتام پر اب کچھ بات ہو جائے۔ یہاں پر بھی شر کی شکست خیر کے ہاتھوں دکھائی گئی ہے جو کہ حقیقت پسندی پر مبنی ہے۔ جمشید جیل سے آنے کے بعد شراب نوشی کا عادی بن جاتا ہے مگر وہ شبینہ کو معاف نہیں کرتا، اپنی مدہوش حالت میں وہ بیویوں سے لڑ رہا تھا اور اب بھی اسے ختم کرنا چاہتا تھا، اس نے اس کے گھر کے آگے کھڑی کار کے شیشے توڑے تھے اور آخر میں وہ سفید مرسیڈیز کار کے آگے آ کر سامنے سے کچلا گیا تھا اور اس کی زد میں آ گیا تھا اور دنیا سے گزر گیا تھا۔

آخر میں شبینہ نے اپنے سرجن بیٹے سے کہا تھا کہ اس کی اصلاحی تدفین کے لیے وہ مالی امداد فراہم کرے۔ بیٹا سعادت مند تھا اس نے ایسا ہی کیا ہوگا۔

سرجن بیٹا ڈیوٹی پر تھا جب کہ اس نے متوفی کا اگر کو دیکھا تھا۔ غلیظ، بدبودار اور چہرہ زخموں سے مسخ۔ ریستوران کے سامنے بیٹھنے والا کشکول لے کر۔ ایک برا انجام برے کاموں کا۔

مجھے احساس ہوتا ہے کہ حمیدہ معین رضوی افسانہ نگاروں کے اس قبیل سے تعلق رکھتی ہیں جو مکافات عمل (retribution) کو زندگی کا اہم جز گردانتے ہیں۔ مجھے جارج ایلیٹ کا ناول ایڈم بیڈ (Adam Bede) یاد آ رہا ہے جسے ایم اے (انگریزی ادب) کی تعلیم کے دوران پڑھا تھا۔ جارج ایلیٹ سائنسی زمانے کی عورت تھی، سیکولر اور روشن خیال بلکہ ترقی پسند بھی، وہ اس امر کی شاہد تھی کہ برائی والے کو برائی کا بدلہ ملتا ہے۔ یہ ایک مذہبی قدر ہے جسے جارج ایلیٹ نے بھانپ لیا تھا۔ اس کے ناول ایڈم بیڈ میں یہ جملہ Action Carry their consequences within themselves یعنی اعمال ہی میں نتائج پوشیدہ ہوتے ہیں، پورے ناول پر چھایا رہتا ہے۔

اس اعتبار سے حمیدہ معین رضوی قارئین کے کتھارسس کا بھی خیال رکھتی ہیں ورنہ بہت سے فن کار اس بات پر بھی یقین رکھتے ہیں کہ برے آدمی یا ولن کا کچھ نہیں بگڑتا وہ خوب ترقی کرتا ہے اور مظلوم مٹ جاتا ہے لیکن بڑی سچائی مکافات عمل ہی کی ہے۔ یہ طے شدہ بات ہے کہ اگر ہم قرآن شریف، انجیل اور توریت کی تعلیمات پر نظر ڈالیں اور قرآن شریف کو دیکھیں جس میں گزشتہ مذہبی کتابوں کا نچوڑ موجود ہے تو پتا چلے گا کہ جہنم بہر حال ایسے ظالم شخص کا مقدر ہے

اگر یہاں بچ نکلے تو آخرت میں پکڑے جائیں گے اور دوزخ میں جلیں گے۔

پھر ایک اندر کا جہنم بھی تو ہے۔ جمشید کی حالت اس کے اندرونی کرب کی غماز تھی۔ ریستورانوں کے سامنے بیٹھ کر کشکول لیے بھیک مانگنا ایک عذاب ناک تجربہ بھی تو تھا ایک اندر کا دہکتا اور کھولتا ہوا جہنم جہاں انسان بے بس اور لاچار بھی ہے۔ اس منظر کی عکاسی اپنی جگہ خوب ہوتی ہے اور زندگی کی عدالت سے ظلم سہنے کے بعد قانون سے وابستہ شاہینہ بری ہوتی ہے اور جمشید ایک مستقل قید خانے میں منتقل ہو جاتا ہے یوں افسانہ عورت کی فتح کی نوید سناتا ہے۔

اتفاق سے دونوں افسانے ایک ہی ماجرائی پیٹرن پر تخلیق ہوئے ہیں یا مصیبت عورتوں کی داستان سے ہماری زندگی بھری پڑی ہے۔ عظمت کے حصول کے لیے مصائب اور کٹھنائیوں سے گزرنا ضروری ہے۔ حمیدہ معین رضوی اپنے مخصوص کرداروں کے توسط سے قارئین سے بہت کچھ مکالمہ کر لیتی ہیں ان کا فن جہاں ایک طرف واقعات کے فطری دروبست کا ہے تو دوسری طرف کردار نگاری کی اہمیت کا بھی احساس دلاتا ہے۔ کردار نگاری معمولی فن نہیں۔ ڈرامے کی طرح یہاں کرداروں کی تشکیل ان کے منہ میں زبان دینے اور اعمال و افعال سے وابستہ کرنے کے لیے زبردست تخیل کی ضرورت پیش آتی ہے۔ حمیدہ معین رضوی اس میدان میں ایک کہنہ مشق افسانہ نگار ہونے کے ناطے کامیابی سے گزر جاتی ہیں۔

مجموعی طور پر وہ اپنے موضوع کو نبھانے کا فن جانتی ہیں ان کا اسلوب پیچیدہ نہیں ہے کہ ابہام کا مسئلہ پیدا کرے۔ اپنے بیانیہ کو وہ ہلکے پھلکے استعاروں سے سجا دیتی ہیں اور کہیں کہیں تصویری پیکر بھی تراشتی ہیں تاکہ کردارو ں کے نازک باطنی احساسات اور جذبات کی موثر تصویر کشی ہو سکے۔ ان کے یہاں پاکستان اور انگلستان کے لوکلز (locales) دو مختلف تہذیبوں کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں جس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ ہم کرداروں کے چہرے آسانی سے پہچان لیتے ہیں انسان کا مشرق میں ایک چہرہ اور مغرب میں دوسرا چہرہ جس سے اس کی منافقت اور ریاکاری واضح ہو جاتی ہے اور ایک وہ چہرہ جو اچھی اقدار کی نمائندگی کرتا ہے اور دونوں جگہوں پر ایک جیسا ہے جیسے کہ ’’بڑے بھیا‘‘ اور ’’کوکلا بھی نا....‘‘ کی شاہینہ اور شبینہ۔

عام طور پر خواتین افسانہ نگاروں کا فن تفصیل اور جزئیات کا فن ہوتا ہے وہ زیادہ فضائی مناظر دکھانے پر قادر ہوتی ہیں وہ چاہیں تو اپنے کینوس کو اختصار سے بھی مملو کر کے اس تاثر کو واگزار کر سکتی ہیں۔ حمیدہ معین رضوی کے یہاں اسلوب محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایسا کر سکتی ہیں بشرطیکہ وہ اس ضرورت کو محسوس کریں۔ موجودہ کیفیت میں بھی ان کے دونوں افسانے مطالعاتی وصف رکھتے ہیں۔

ایک پاکستانی
تارک وطن

الطاف فاطمہ

ادب کی دنیا میں حمیدہ معین رضوی کا نام نیا نہیں ہے۔ بہت جانا پہچانا اور رکھ رکھاؤ سے (میرا مطلب ہے سوجھ بوجھ سے) لکھنے والوں میں بھی اچھا خاصا منفرد نام ہے۔ وہ اس لحاظ سے کہ حمیدہ معین رضوی نے جب اپنی افسانہ نگاری کا آغاز کیا تو وہ پاکستان کے افسانہ نگاروں میں اس حیثیت سے منفرد اور نمایاں مقام اور مرتبہ رکھتی ہیں کہ وہ پاکستان کی پہلی افسانہ نگار خاتون ہیں جنہوں نے ایک پاکستانی تارک وطن کی حیثیت سے جب انگلستان میں رہائش اختیار کی تو وہاں کی زندگی، رویوں اور ذہنیتوں کے تناظر میں پاکستان کے ان باشعور پڑھے لکھے اور اپنی اقدار کو محبت، احترام اور عزت کی نگاہ سے دیکھنے والے لیکن وطن کے رویوں اور اجتماعی جذبوں کے ساتھ ساتھ فرد کی اپنی اپنی افتادِ طبع کے لحاظ سے زندگی گزارنے کی کوشش اور سعی میں بنے والی کہانیوں کو اپنے شعوری رو اور تجزیاتی انداز میں لکھا۔ نہ صرف لکھا بلکہ ان کی نفسیاتی کیفیتوں کی نشان دہی بھی کی جو کسی غیر ملک میں رہ کر ایک تارک وطن کے اندر ہی اندر نشوونما پاتی ہیں۔ اتنا معلوم انداز میں کہ خود اس فرد کو آگہی نہیں ہو پاتی کہ کس طرح اندر ہی اندر اس کی شخصیت کے بطن میں ایک نیا انسان نشوونما پا رہا ہے، پل بڑھ رہا ہے جو اپنے وطن سے آتے وقت ساتھ آنے والی شخصیت کے پیڑ کی جڑوں کو امر بیل کی طرح چاٹ چاٹ کر بودی اور بے رنگ کیے دے رہی ہے۔ ایک وقت ایسا تھا جب وہ تیزی سے اپنے افسانے لکھتی رہی تھیں۔ پھر ایسا بھی ہوا کہ وہ منظر سے باہر اور دور دور ہیں۔ ایسا کسی طرح بھی کسی ادیب کے لیے بد فال اور غیر مستحسن نہیں۔ بلکہ میرے خیال میں یہ ایک اچھی اور نیک فال ہی ہوتی ہے۔ ادیب کی زندگی بھی فرائض اور حقوق سے مستثنیٰ نہیں ہوتی اور چونکہ وہ کچھ زیادہ ہی حساس ہوتا ہے اس لیے ان کی نفی اور نظر انداز کرنے سے اس کا ضمیر اشتعال اور ملامت کے بوجھ سے گرانبار رہتا ہے۔ سو اس گرانی کے تحت زبردستی قلم گھسیٹ کر کی ہوئی تخلیق کا عمل یقیناً متاثر ہوتا ہے اور ایسی بھرتی کی اور نام چار کے لیے لکھی ہوئی تحریروں کو کچھ عرصے کے لیے تھام کر رکھنا ضروری ہوتا ہے تاکہ ضمیر کی آسودگی جب ذہن کو سلیس اور رواں کر دے تو اس وقت کی ہوئی تخلیق ہی مس خام کے لیے کندن کا اثر رکھتی ہے۔ ایسی ہی معروفیت اور مجبوریوں کے تحت اگر وہ کچھ عرصے ادبی منظر سے غیر حاضر رہیں تو ایسی کیا قیامت آ سکتی تھی۔ نہ خود ان کے لیے نہ ادب پر۔ تو خیر ہو سکتا ہے کہ ان کی معروفیات اور فرائض کی ایمانداری اور ادائیگی کے احساس نے انہیں پابند رکھا ہو پر وہ ادب کے خیال سے غافل نہیں اور سراسر غافل نہیں رہی ہیں۔ ان کا مطالعہ قابل رشک اور قابل تقلید ہوتا رہا۔ چشم بصیرت کے ساتھ چشم دل وا رہی ہے۔ دیکھتے ہی ایک سرسری واردات کے تحت قلم چلائیں تو وہ تبصرہ یا کالم سے بڑھ کر نہیں ہوتا۔ سو انہوں نے کالم نما چپ افسانہ لکھنے سے گریز کیا۔ ان دنوں بیرون ملک رہ کر اردو افسانہ نگاروں میں ایک رویہ چل نکلا ہے جس کی برداشت کی حدوں سے گزری ہوئی بیباک نگاری۔ ایک وقتی اور جذباتی جنسی خواہش (جس کو غالب نے خلل دماغ کا نام سے یاد کیا) کے تحت ہونے والے جنسی فعل کے بلیو پرنٹ کے انداز میں لکھے ہوئے افسانے ہی فیشن اور رواج کا حصہ بنے ہوئے ہیں۔ حمیدہ معین رضوی ایسی سطحی کاوشوں سے عمر کی ہر منزل میں تقویٰ کی حد تک گریزاں رہیں۔ ہاں بقدر ضرورت اس کے بارے میں لکھنے کی قسم بھی نہیں کھائی۔

سوچتی ہوں مجھے کیا پڑی ہے دماغ سے کھود کھود کر باتیں نکالنے کی۔ شیش محل میں خود حمیدہ معین رضوی کا پیش لفظ ہی ان کے رویوں، ان کی ایکسرے جیسی قوت رکھنے والی نگاہوں اور ان کے معیار کا شاہد اور امین ہے تو میں کاہے کو کھپ میں پڑوں کیوں نہ اس کا ہی حوالہ دوں:

"بات پھر کہیں سے کہیں پہ پہنچ گئی جب کہ مجھے کہنا یہ تھا کہ.....
زندگی صرف معاشی خوشحالی کا نام نہیں..... یورپ میں تو ان گندم کے ساتھ گھن کے پہاڑ بھی کھڑے ہیں۔ دودھ کی نہریں بہتی ہیں اور لوگ موٹاپے سے تنگ آ کر بے چکنائی کا پتلا دودھ پینے پر مجبور ہیں..... پھر لوگ نان جویں کھانے میں کیوں مصروف ہیں... جنسی عمل کی مکمل آزادی کے باوجود اس انتشار ذہنی پراگندگی..... اور باؤلے پن کے کیا معنی جس کے تحت گھروں میں گھس کر زنا بالجبر کیا جاتا ہے اور عورت سے تھک کر مردوں تک کو ریپ کیا جاتا ہے... کیوں باپ اپنی بیٹیوں تو بیٹیوں بیٹوں تک کے ساتھ جنسی فعل میں مصروف نظر آتے ہیں... اور کیا انسان کی یہ فسردگی..... یہ پژمردگی..... اس روحانی خلا کی نشان دہی نہیں کرتی جس کو حکیم نے خود دریں خودی کہا ہے..... کہ انسان مادی حیوان نہیں.....وہ جسم سے ماورا حقائق کا بھی ادراک چاہتا ہے"

حمیدہ معین رضوی کے اپنے تحریر کردہ پیش لفظ سے میں نے یہ قدرے طویل اقتباس اس خیال سے نقل کیا ہے کہ پڑھنے والے کو بخوبی معلوم ہو سکے کہ شیش محل کے اندر جو نظموں اور شاعری کے خالق نے یہ شاعری اور نظمیں بطور فیشن اور رواج شیش محل میں یکجا نہیں کر دی ہیں بلکہ ان کے پس منظر میں ایک خصوصی جذبہ، مقصدیت اور حساسیت کارفرما ہے۔ وہی حساسیت اور دروں بینی جو پہلے حمیدہ معین رضوی کے تجربے اور واردات سے گزر کر ان کے افسانوں کی

تخلیق کا باعث بنی تھی۔ اب ہوا اور زمانے کا رخ دیکھ کر ایک اور ہی صنف اور ہیئت کے قالب میں ڈھل گئی ہے اور انہوں نے ان کے طور پر اپنے نئے تخلیقی منشور کا اعلان کیا یوں کیا ہے، سو ہمیں اب ہمارا فن ٹھہرا بہر حال جذبہ ہی پرانا اور قدیم ہے البتہ فن کا چولا اور قبا نئی ہے پھر ان کا انتساب بھی قابل لحاظ ہے جو ان کی سوچ، ارادے اور شاعری کے پس پردہ عوامل کی نشان دہی کرتا ہے

"ان تمام خواتین کے نام جو حق کے اظہار، صاف گوئی اور فکری آزادی کے لئے مرد کے لئے گلوبند قربان کر سکتی ہیں۔"

ظاہر ہے کہ کسی شاعر یا شاعر کے فن کے تجزیے کے بعد بھی وہی ڈھاک کے تین پات حاصل ہوں گے جو اپنے پیش لفظ اور انتساب کے ذریعہ ہمیں دکھا چکی ہیں۔ سو ہمارے کہنے سننے کو اتنا کچھ نہیں جاتا۔ البتہ ان کی تخلیقی فکر کے مطالعے سے ایک بات واضح ہے حمیدہ معین جب کسی موضوع کو اپنی شاعری کا عنوان بناتی ہیں تو پوری صداقت اور شدید ترین جذبے ہی برتتی ہیں۔ وہ موضوع خواہ ماضی کے بکھرے بچے دنوں سے متعلق ہو یا وطن کی مٹی سے نسبت رکھتا ہو یا عملی زندگی کے کسی بھی پہلو سے تعلق رکھتا ہو، وہ اس کی تخلیقی خوبصورتی، پایا کوری کو یکساں طور پر صادق جذبوں اور شدت احساس کی سچائیوں کے تحت برتتی ہیں۔

ان کا ماحول اور گردوپیش یعنی انگلستان کی زندگی ایسی ہے کہ جسے خوابوں، خیالوں اور موضوعات کے تنوع سے مالا مال اور بہت زرخیز کہا جا سکتا ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے بیرون ملک کی تو بیشتر موضوعات کو اپنی شاعری کا عنوان بنایا اور بڑے جذبے اور سلیقے سے برتا ہے۔ سر نصیب، تھی دلاں، ہوا شمال، آبلہ پا، وہ کون تھا، فرعون کی صلیب، شتیلا کیمپ فلسطین میں قتل عام (1982) زندان کے روزن سے خطوط ڈھاکہ پر، کراچی کی ایک شام.... گولیوں کے درمیان... عنوانات کی تعداد تقریباً 35 یا 36 ہے جن میں سے ان چند عنوانات کو اس لیے منتخب کیا کہ شاعری آگہی کیا کچھ رکھتی ہے اور اس کا دل کس کس کے ساتھ دھڑکتا ہے ان عنوانات کا تنوع... ان کی اس خوش قسمتی کی دلیل ہے کہ ان کو زندگی کا بے حد وسیع اور بے حد جدید تجربہ میسر رہا ہے۔ انہوں نے یورپ کی ہمہ جہت زندگی کے درمیان عارضی یا وقتی طور پر وقت بسر نہیں کیا بلکہ اسی زندگی کا حصہ بن کر ایک طویل مدت گذاری۔ تاہم ان کا ذہنی اور ثقافتی خمیر، کسی ایسے مرکب سے ترکیب پایا ہے جو کان نمک کے اندر ہو کر بھی نمک بن جانے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اپنے وطن اور ملت سے رشتے استوار رکھنے میں ان کا ارادہ شامل نہیں ہوتا بلکہ از خود سے وہ ایسا کرنے پر مجبور ہے۔ تاہم وہ جس فضا اور ماحول میں رہ اور بس رہی ہیں اس کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتیں۔ وہاں کی فضاؤں میں بسی ہوئی سانسیں اور مہک بھی ان کے طرز احساس کا حصہ ہیں اور وہ ان کو جا بجا اپنے خیال و فکر میں شامل رکھتی ہیں۔

نیلے فلک پر چاند اگر ہمت کرتا ہے پھر سے پھر سے سر کرتا ہے
چڑھ کے کنوئیں پر نیلے سائے میں
الو شور مچاتے اور کتے بھونکنے لگتے ہیں
میں چار سو رونے کی آوازیں سنتا ہوں اور ڈرتا ہوں
میں بھی سسکنے لگتا ہوں
ننھا سا دل خوف سے دھک دھک کرتے ہوئے سمجھاتا ہے
کیوں ڈرتے ہو؟ یہ تو ہوا ہے
تم جیسی کوئی رہتا ہے... میری طرح
شاید آدھی رات کی یہ آواز گریہ و زاری سب کی ہے
جن کی ماؤں کو راتوں کی دہشتوں نے
اور اندھی کر دینے والی روشنیوں نے نگل لیا ہے
پھر میں دبک کر ماں کی باہوں اور سینے کی نرماہٹ کے لمس کی حسرت میں
کمبل کے کونے کو پکڑ اور اپنے تکیے سے لپٹ کر
گھنٹوں سسکا کرتا ہوں اور گھنٹوں ٹھٹھرا کرتا ہوں

فرعون کے صلیب کے نام سے لکھی ہوئی نظم کا یہ طویل اقتباس اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ شاعرہ اپنے گردوپیش اپنے ماحول اور اس معاشرے کے درد و کرب کو نہ صرف یہ کہ نظر انداز نہیں کر سکتی بلکہ اس کی شدت احساس کے تحت اس کی ترجمانی پر مجبور ہو جاتی ہے۔

اسی طرح ہوا شمال میں ان کے جذبے اور محسوسات رفتہ و حاضر کے درمیان پا بہ پا نظر آتے ہیں۔ ایک جانب ماضی کی بکھری اور کھوئی ہوئی یادیں۔ جہاں بچپن سے جوانی تک یعنی عمر کا ایک خوبصورت ترین حصہ گذرا۔ یعنی وطن کی گلیوں کی نرم آغوش۔ ساتھ کھیلنے والے ساتھیوں کی یادیں۔ شباب کی پر بہار راتیں۔ خواب میں گلستان کی باتیں کرتے کرتے ایک دم ہی ایسا ہوتا جاتا ہے کہ حال ماضی کو پیچھے دھکیل دیتا ہے اور پھر.....:

کسی نے چپکے سے مرگھٹوں سے
اکیلے پن میں جیسے پوچھا
کہاں ہیں وہ خواب؟
کیسی تعبیر نکلی ان کی...؟

آگے چل کر کہہ رہی ہیں:

حقیقتیں تو پہاڑ کی صورت کھڑی ہیں
کہ سارا کنبہ بکھر گیا ہے
بسے ہیں غیروں کے ملک میں جو
تو میرے بچے جوان ہو کر میری حفاظت کی نرم آغوش سے نکل کر
چہار سو جبر و قہر کا سامنا کریں گے

وہ اپنی پہچان کی یوں قیمت ادا کریں گے
وہ ان میں رہ کر سفید عفریت کے بدلتے
تعصبوں کے اثر کو آزار کو
نئے روپ میں بھی پہچان پائیں گے کیا؟

ان کے یہ خدشات مغرب کے حالات کے تناظر میں درحقیقت ایک بڑی تلخ حقیقت ہیں.... اور جس حقیقت کے حوالے سے

ہوا شمالی سندر سراتی ہے جنگلوں کا
ہوا جو خیمے میں جل رہی ہے

سفر نصیب ان کی ایسی نظم ہے جو قید مقام سے آزاد ہے کسی بھی خطے کی ارضی حدود سے بے نیاز احساس اور جذبے کی عالمی دنیا سے متعلق۔ ایک عورت کے خدشات اور درد و کرب کی انمٹی ہوئی تحریر کی ابھرتی دلی دلی کراہیں:

کھول رہی ہوں میں زخموں کے پرانے ٹانکے
جن سے رستا لہو درد ہوا ہے
یاد بھی نہیں رہتا کہ کسی عہد میں بھی
کتنا دشوار رہا ہے
ایک عورت کے لیے ذاتی مسرت کا حصول
اور خوشیوں کے جگنوؤں کا تعاقب ہے فضول
اے خدا آرزوئے دل پیدا ہی نہ ہو
مجھ میں اب تاب نہیں خوش نما منظر دیکھوں
یا سنوں ساز درون نغمہ اور نوا کوئی بھی صدا

شٹیلہ کیمپ:

بے حد بے حس تھے وہ شکل رہا تیرگی میں شمار کر کے
تلاش میں نیم مردہ جسموں کی آ رہے تھے
اور ان کے لشکر کا تھا نشانہ وہ چند خیمے
جو صبح کے وقت طفلوں کا تھا اک ٹھکانہ
وہ خیمے جن میں کہ عورتیں تھیں
ہاں یہ بھی سچ ہے کہ چند دہشت زدہ بوڑھے سسک رہے تھے

جہاں تک ان کی شدت احساس اور موضوعات کے انتخاب کا تعلق ہے اس کے حصہ نظم کی ہر ہر نظم ایک نئے درد آگہی اور آشوب فکر کی نشان دہی کرتی ہے۔ اب جہاں تک ان کے خیال، فکر، جذبے اور احساس کا تعلق ہے... میں اس کی تعریف کر سکتی ہوں۔ لیکن جہاں تک ان نظموں کی تکنیک، الفاظ کی اور ان کی فنی اور تکنیکی باریکیوں کی بات ہے وہ ایک نا شاعر کی حدود میں شامل نہیں۔ اس سلسلے میں محاکمہ شاعروں ہی کا منصب ہے۔ ہاں البتہ ان کی غزل کی بات دوسری ہے۔ یہ ایک ایسی صنف سخن ہے کہ جس سے مجھ جیسا نا شاعر بھی مانوس اور تھوڑی بہت آشنائی رکھتے ہیں اور اس کے خوب و ناخوب پر لب کشائی کی جرأت بھی کر سکتے ہیں۔ سو میں کہنے کی جرأت کر رہی ہوں کہ اس حصہ میں نیا دھنی رچاؤ اور ایک نکھرا ہوا انداز ہے۔

صحرا میں گلابوں کو لگانے کی تمنا
یہ خواب انوکھا سا میرے پیش نظر ہے

جن کرچیوں سے مرا بدن آج لہو ہے
وہ ٹوٹ کے بکھرا میرا ہی شیش نگر تھا

شام پھر پلکوں پہ موتی بھر دیے دل کے جلے
رت جگوں پہ پھر شبستان کے نکھار آ ہی گیا
تھی بشارت اس حریف معتبر کی آنکھ میں
اس کو بھی میرے ہنر کا اعتبار آ ہی گیا

بے شک غزل میں ان کا حرف معتبر ہے اور ان کے ہنر کا اعتراف نہ کرنا اپنے ذوق کی نفی کرنا ہے۔

لڑکیاں جو کتاب لکھ رہی ہیں
زندگی کے عذاب لکھ رہی ہیں
انگلیاں ہیں فگار زخموں سے
کاغذوں پر گلاب لکھ رہی ہیں
گردنوں میں صلیب قدروں کی
فاصلوں کے حساب لکھ رہی ہیں

چپکے سے گزر کر جب شام گزرتی ہے
ہر بار ہی سولی پہ لمحہ یہ گزارا ہے

شیش نگر کا حصہ غزل تقریباً اناسی (79) غزلیات پر مشتمل ہے۔ جستہ جستہ ہر غزل اچھے اور قابل توجہ اشعار سے مزین ہے۔ صرف چند مذکورہ اشعار پر ہی نہیں منحصر بلکہ ان کی کوئی غزل بھی ایسی نہیں جس میں کسی قسم کے رطب و یابس کی تلاش کی جا سکے۔ اور یہی بڑی بات ہے۔ توقع تو ہے کہ وہ غزل کی صنف میں مزید بلند و مزید مشق سخن جاری رکھیں گی۔

☆

گُہر میں ڈوبی چاندنی

منشا یاد

محترمہ حمیدہ معین رضوی کا شمار ایسے باکمال تخلیق کاروں میں ہوتا ہے جو بیک وقت کہانی اور شعر میں کامیابی سے اپنا اظہار کر سکنے پر قادر ہوتے ہیں۔ میں نے ان کا پہلا افسانوی مجموعہ نہیں دیکھا۔ البتہ دوسرے افسانوی مجموعے ''اجلی زمین میلا آسمان'' کی بہت سی کہانیاں اور شعری مجموعہ ''دشتِ نگر'' پڑھا ہے۔ اگرچہ ان کا نام ادبی رسائل میں نظر سے گزرتا رہا مگر ان کے فن کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا ان دو کتابوں کے مطالعے کے بعد ہی ممکن ہو سکا۔ جہاں تک ان کی کہانیوں کا تعلق ہے ان کا اسلوب اور موضوعات ہم عصر کہانی سے مختلف ذائقہ رکھتے ہیں۔ کیونکہ زیادہ تر کہانیاں پچیس تیس برس پہلے لکھی گئیں بلکہ ان ایک درجن کہانیوں میں جو ان کے دوسرے مجموعے میں شامل ہیں دو کہانیوں ''پاپا'' اور ''چوتھے کھونٹ'' کا لکھے جانے کا زمانہ 65ء/66ء کا ہے۔ اسی طرح ان کا اسلوب موضوعات اور ماحول بھی اسی زمانے بلکہ بعض کہانیوں میں جنگِ عظیم دوم اور پاکستان بننے کے فوراً پہلے یا بعد کے زمانے کا بھی ذکر ہے۔ جو 71ء کی پاک بھارت جنگ تک کے زمانے کی معاشرتی صورت حال کو پیش کرتا ہے۔ اور اگرچہ اس زمانے میں اردو کہانی میں جدیدیت اور علامت و تجرید کا بہت غلغلہ تھا اور فنی تجربات ہو رہے تھے یا انتہا حاصل کر رہے تھے مگر وہ یورپ کے تیز رفتار ماحول اور پاکستانی افسانے کی جدید کروٹوں سے بے نیاز سادگی اور مستقل مزاجی سے افسانے کے روایتی بیانیہ اسلوب سے جڑی رہیں۔ اور خود کو بکھرنے نہیں دیا۔ نہ ہی ان کی کہانیاں باسی معلوم ہوتی ہیں۔ اور یہی ایک کامیاب کہانی کی نشانی ہے کہ وہ کتنے عرصے تک خود کو relevant رکھتی اور تروتازہ نظر آتی ہے۔

محترمہ حمیدہ معین بنیادی طور پر کہانی کار ہیں اور پاک و ہند کے علاوہ مغربی معاشرے کے مشاہدے اور تجربے نے انھیں کہانیوں کا بہت مواد عطا کیا ہے اور ان کے پاس کہنے اور سنانے کے لئے اتنا کچھ ہے کہ افسانہ جیسی صنفِ ادب کا دامن تنگ محسوس ہونے لگتا ہے۔ عام طور پر ان کی کہانیاں طویل ہوتی ہیں مگر اپنے اسلوب اور دلچسپ مواد کی وجہ سے طوالت کہیں نہیں کھٹکتی۔ مثلاً سب سے طویل کہانی دریچہ ہے جو 72 صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اور ہر صفحے میں 23 سطریں یا اوسطاً چار سو الفاظ ہیں گویا یہ کہانی تقریباً تیس ہزار الفاظ پر مشتمل ہے لیکن آپ پڑھنا شروع کر دیں تو ختم کئے بغیر نہیں چھوڑ سکتے۔ اس کہانی کو پڑھ کر مجھے لگا جیسے کوئی دلچسپ فلم یا اسٹیج ڈرامہ دیکھا۔ محبت نفرت اور رشک و رقابت کے جذبوں کے اتار چڑھاؤ اور واقعات کے دلچسپ سلسلے پڑھنے والے کو پوری طرح اپنی گرفت میں لئے رکھتے ہیں۔ ان کی زیادہ تر کہانیاں ایسی ہی دلچسپ ہیں اور آسانی سے ٹی وی کی لانگ پلیز میں منتقل کی جا سکتی ہیں۔ ان کی ہر کہانی نہایت بھرپور ہوتی ہے کرداروں اور ماحول کی پوری تفصیل اور جزئیات نگاری کے ساتھ بیان کرتی ہیں اور ظاہر ہے کشتی میں بوجھ زیادہ ہو جائے تو اس کی رفتار سست پڑ جاتی ہے۔ ان کا اسلوبِ بیان بھی دھیمی رفتار کا حامل ہے۔ کہانی لکھتے ہوئے انھیں کوئی جلدی نہیں ہوتی۔ چنانچہ ان کی کہانی بھی ایسے قاری کا انتخاب کرتی ہے جو جلدی میں نہ ہو ہوائی جہاز کی بجائے ایکسپریس ٹرین میں سفر کرنا پسند کرتا ہو۔ زیادہ تر کہانیوں کا آغاز لندن یا کسی ایسے ہی یورپی شہر کے ایک اداس کر دینے والے ہجوم، احساسِ تنہائی یا منظر سے ہوتا ہے جس میں مرکزی کردار پر اداسی، پریشانی یا یادوں کا ہجوم یلغار کر رہا ہے۔ عموماً یہ کردار کسی مرد کا ہوتا ہے کہ اکثر خواتین ادیبوں کی طرح انھیں بھی مذکر اور متکلم کے حوالے سے کہانی کہنا مرغوب ہے۔ مشرقی ماحول خصوصاً پاکستان کے کراچی لاہور اور سیالکوٹ کی معاشرتی زندگی پس منظر کا کام دیتی ہے۔ پیش منظر میں لندن وغیرہ رہتے ہیں اور مرکزی کردار کی یادوں کا حوالہ اس کی کھوئی ہوئی محبت یا ٹوٹی ہوئی ازدواجی زندگی ہوتا ہے۔ بعض کہانیاں مغربی ماحول میں مشرقی کرداروں کو پیش آنے والی دکھوں، تعصبات اور مسائل کا احاطہ کرتی ہیں۔ اور آزادی، انسانی مساوات، انصاف اور رنگ و نسل کے امتیازات کے خلاف اٹھنے والی تحریکوں کے بعض کرداروں اور رویوں کا احوال بھی کہتی ہیں۔ جہاں تک ان کی زبان اور اظہاری طریقوں کا تعلق ہے وہ بہت اچھا اور معیاری ہے۔ کئی جگہوں پر خوبصورت جملوں اور اظہار کے پیرایوں کی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ چند مثالیں دیکھئے:

☆ یہ کیا ہے جیسے وقت کی گہرائی سے لمحوں میں مجسم واقعات قطرہ قطرہ ہو کر اس کے شعور کے تپتے جگر پر گر رہے ہیں۔

☆ زبیر صاحب ہوش میں آئیے۔ اگر ہضم نہ کر سکیں تو اتنی شراب چڑھانا ضروری نہیں۔ کیونکہ اس سے کوئی اسٹرلنگ کی قیمت نہیں بڑھے گی۔

☆ جسے وہ جنت سمجھ کر آیا تھا وہ بڑھاپے میں جہنم بن گئی تھی۔ جہاں بوڑھے تنہائی کا پہاڑ اٹھائے ماضی کے جزیروں میں سرگرداں رہتے ہیں۔

☆ باہر گہر میں ڈوبی چاندنی دیکھ کر اسے خیال آیا کہ غم کی مرئی شکل ہوتی تو کچھ اسی طرح کی ہوتی۔

اب آخر میں چند باتیں ان کی شاعری کے بارے میں عرض کرنا ہوں۔ ''دشتِ نگر'' جو ان کی نظموں اور غزلوں کا خوبصورت مجموعہ ہے 1998ء میں شائع ہوا اس لئے اس کے موضوعات اور اسالیب تر و تازہ ہیں۔ ان کا پیش لفظ اور خود نوشت سے چند اوراق نہایت خیال انگیز تحریریں ہیں جو کل اور آج کی زندگی کے چند دل دہلا دینے والے مناظر اور واقعات پیش کرتی ہیں۔ خصوصاً

پیش لفظ میں مغربی معاشرے کے بارے میں جو چند سطری رائے دی گئی ہے وہ سوچنے پر اکساتی ہے۔ ان کی نظموں میں خوبصورت اور چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہیں۔ ایک نظم کا تو عنوان ہی "ایک کہانی" ہے۔ ان نظموں میں سارے ہی قومی اور بین الاقوامی اہم موضوعات اور صورت حال پر نظمیں موجود ہیں۔ جیسے 23 مارچ 'شتیلہ کیمپ فلسطین میں' 'سقوط ڈھاکہ پر' 'کراچی میں ایک شام' 'گولیوں کے درمیان' 'وسطوے' 'ایک مکالمہ' 'نظریہ پاکستان کے قاتل' وغیرہ اور پھر کچھ ذاتی خوشیوں 'محرومیوں' اداسیوں اور جذبوں سے متعلق نظمیں ہیں جو فنی اور اسلوبی لحاظ سے بہت دلکش ہیں۔ جہاں تک غزلوں کا تعلق ہے میرا خیال ہے ان کے چند ایک اشعار سے آپ خود ہی ان کے معیار کا اندازہ لگا سکیں گے۔

لڑکیاں جو کتاب لکھ رہی ہیں
زندگی کے عذاب لکھ رہی ہیں

انگلیاں ہیں فگار زخموں سے
کاغذوں پر گلاب لکھ رہی ہیں

گردنوں میں صلیب قدروں کی
فاصلوں کے حساب لکھ رہی ہیں

قرض جو بھی وفا کے واجب تھے
اس کی آنکھیں جواب لکھ رہی ہیں

میری خواہش ہے کہ حمیدہ معین رضوی ناول لکھیں اور میری دعا ہے کہ اللہ ان کو ایسی ہی تخلیقی توانائی سے نوازے رکھے اور وہ مزید تخلیقات سے اردو ادب کا دامن مالا مال کریں۔

مغرب اور اُردو افسانہ

سید محمد عقیل

(صدر شعبہ اردو الٰہ آباد یونیورسٹی)

اردو افسانہ اب تقریباً اپنی ایک صدی پوری کر رہا ہے۔ اردو افسانہ سجاد حیدر یلدرم نے شروع کیا یا اس سے بھی پہلے اس کے کچھ نقوش سرسید کے یہاں چاہے کیوں نہ ملتے ہوں مگر اردو کا پہلا افسانوی مجموعہ سب سے پہلے پریم چند نے ہی 1908ء میں سوزِ وطن کے نام سے پیش کیا تھا اور پھر اردو افسانوں کی روایت میں ایک خوشگوار تبدیلی ہوئی اور جب 1932ء میں انگارے کی اشاعت ہوئی تو افسانوں کی دنیا میں انقلاب آ گیا۔ انگارے کے ساتھ ہی نئے افسانہ نگاروں کی جو کھیپ آئی اس نے اردو کی افسانوی دنیا میں موضوعات، کہانی کہنے کے طریقے اس میں امکانات کی توسیع برتاؤ (Treatment) زندگی کی حقیقتوں کی تلاش غرض کہ کیا کچھ نہ تھا جو ترقی پسند افسانہ نگاری کے ساتھ اردو کی افسانوی دنیا میں داخل نہیں ہوا؟ شاید ہی افسانے کا کینوس، کسی دوسری زبان میں اتنا وسیع ہوا ہو۔ اور یہ پھیلاؤ اپنے تاریخی حدود کے ساتھ اب بھی رواں دواں ہے۔

ادھر برصغیر اور مغربی ممالک میں بھی خواتین افسانہ نگاروں نے افسانے کے افق کو وسیع کرنے کی خاص کوشش کی ہے۔ عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر کے بعد جو نسل ابھر آئی ہے اس میں جیلانی بانو، ذکیہ مشہدی، صغریٰ مہدی، زاہدہ حنا، سائرہ ہاشمی، خالدہ حسین، اختر جمال اور مزید کئی خواتین ہیں جو افسانے کی روایت کو آگے بڑھا رہی ہیں۔ برطانیہ، امریکہ اور کینیڈا میں جو اردو دنیا بسی ہے اس میں بھی شعر و ادب کے ساتھ افسانہ نگاری کی طرف بھی خاص توجہ ہوئی ہے۔ اپنے سفر کے دوران مجھے لندن میں حمیدہ معین رضوی اور چاند کرن کے افسانے پڑھنے کو ملے تو معلوم ہوا کہ یہاں بھی افسانہ اپنی ایک نئی تاریخ اپنے موضوع کے اعتبار سے بنا رہا ہے۔ حمیدہ معین رضوی کا ایک افسانوی مجموعہ "مردہ لمحوں کے زندہ صنم" پہلی بار 1980ء میں شائع ہوا۔ اگرچہ وہ بہت دنوں سے افسانے لکھ رہی ہیں۔ مغرب میں اردو افسانے کو بہت سے نئے موضوعات بھی مل رہے ہیں اور نئے سماجی مسائل بھی۔ یہاں کی دنیا خصوصاً اردو والوں کی دنیا، مشرق اور خالص مغربی ادیبوں سے بہت مختلف ہے۔ ایک طرف تو خالص مغرب کی فضا ہے، مغرب کے اپنے سماجی مسائل ہیں، دوسری طرف ایشیائیوں کی آمد سے جو یہاں کے رہن سہن، رکھ رکھاؤ اور سماجی صورتوں میں ایک ملا جلا اثر پیدا ہو رہا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ ملواں تہذیب جنم لے رہی ہے ان میں زنگی، عرب، ایرانی بھی شامل ہیں اور دوسرے ایشیائی بھی خصوصاً ہندوستانی اور پاکستانی۔ اس طرح کا ملن بہت سے مسائل بھی پیدا کر رہا ہے اور تفہیم کی مختلف صورتیں بھی جن کا Protection کہانیوں کو ایک نئی فضا میں لے جاتا ہے جو برصغیر (ہندوستان و پاکستان اور بنگلہ دیش) کے افسانہ نگاروں سے مختلف ہے اردو دنیا کے لئے یہ ایک بالکل نیا افسانوی تجربہ ہے۔ مردوں میں اسکابرو کے مصطفیٰ کریم نے ان صورتوں کا تجربہ کیا ہے اور خواتین میں حمیدہ معین رضوی اس کوشش میں ہیں ان کے افسانوں میں برطانیہ کے اس نئے سماج کے مسائل کو جذب کرنے کی کوشش جا بجا ملتی ہے۔ "درد کا سایہ" اور "دلبرا اس گنبد کی" جیسے اچھے افسانے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان میں کردار اور واقعات پر خاص نظر ہے مغربی لہجہ، منظر اور پس منظر بھی دلچسپ ہے مگر مسائل کا تجزیہ بھی کم ہے۔ اگر ایک قدم انہوں نے آگے بڑھایا تو نفسیاتی اور ذہنی کیفیات کو شامل کر لیتی ہیں جیسے "بڑے بھیا" جو اپنی نوعیت کا ایک منفرد افسانہ ہے۔ اگرچہ سماجی مسائل اور پیچیدگیوں کی طرف انہیں مزید گہری نظر ڈالنی چاہئے۔ خود ایشیائیوں کے اپنے بھی بہت سے علیحدہ مسائل ہیں خصوصاً ازدواجی زندگی اور معاشی زندگی سے پیدا ہونے والے مسائل انہوں نے اپنے افسانوں میں ان صورتوں کی طرف اشارے تو کئے ہیں مگر یہ اشارے ضمنی ہیں اور ان میں حقیقت نگاری کی وہ صورت نہیں ابھرتی جس سے قاری ان کی حقیقتوں کا عرفان حاصل کر سکے۔ تاہم وہ اپنے افسانوں کی قدیم روش سے باہر نکل آئی ہیں وہ رومانی فضا جو ان کے ابتدائی افسانوں پر چھائی رہتی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے کم ہو رہی ہے اور اب وہ عریاں حقیقت نگاری اور زندگی کے جلتے سلگتے مسائل سے قریب ہوتی جاتی ہیں۔ زندگی خود ایک بہت دلچسپ اور مختلف الجہات داستان ہے۔ اسے لطیف بنانے کے لئے اچھے فن کی تو ضرورت ہوتی ہے مگر خالی خولی رنگ آمیزی سے اس کا چہرہ مسخ ہو جاتا ہے اور بدنما بھی۔ حمیدہ معین رضوی کی یہ کوشش کہ وہ افسانوں میں مغربی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو گرفت میں لے سکیں ایک اچھا اقدام ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ وہ بجائے صرف رومانوی رنگ آمیزی، متوسط مڈل کلاس کی عام دلچسپیوں کو مطمئن کرنے کی خواہش اور بے جان کردار سازی کی کھائیوں سے باہر رہیں تا کہ اپنی تخلیقات کو زیادہ سے زیادہ اصلی روپ میں پیش کر سکیں۔ ایسی صورت میں ان کی کچھ کہانیاں شاید اردو کے افسانوی ادب کی تاریخ میں زندہ رہ سکیں گی۔ مجھے امید ہے کہ ان کے اس نئے مزاج کے افسانوں کا اردو دنیا میں خیر مقدم کیا جائے گا۔

کہانی کا سحر

ڈاکٹر طاہر تونسوی

اردو افسانے نے حقیقت نگاری سے علامت نگاری اور پھر تجریدیت تک ایک طویل تجرباتی سفر طے کیا ہے اور یوں کئی نشیب و فراز سے گزرا ہے موضوع کے اعتبار سے بھی اور ہیئت کے حوالے سے بھی۔ آج کا افسانہ کیا ہے اور کیسا ہے اس کے بارے میں گفتگو کرنے کا یہ موقع نہیں بس اتنا کہا جا سکتا ہے کہ نیا افسانہ قاری کے لئے ایک معمہ اور مطالعہ کرنے والے کے لئے ایک بھول بھلیاں ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ نئے افسانہ نگار نے قاری سے ابلاغ کا رشتہ قائم کرنے کی جانب توجہ ہی نہیں کی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ نیا افسانہ کچھ نہیں' ہے تو سہی مگر نیا افسانہ یا ایسی کہانی جس سے کہانی پن غائب ہے اس ساری صورت حال میں اب بھی کہانی لکھی جا رہی ہے اور کہانی کہی جا رہی ہے مرد افسانہ نگاروں کے مقابلے میں خواتین افسانہ نگاروں نے کہانی میں کہانی پن کو نسبتاً زیادہ برقرار رکھا ہے۔ خالدہ حسین اس کی بڑی مثال ہیں وہ خود کہتی ہیں۔ "کہانی کا سحر وہ سحر ہے جو ازل سے انسان کو مسحور کرتا چلا آ رہا ہے اور کرتا رہے گا خواہ اس میں راستہ بھول جانے ہی کا خطرہ کیوں نہ ہو" حمیدہ معین رضوی بھی ایک ایسی افسانہ نگار ہیں جنہوں نے کہانی پن کو تسلسل کے ساتھ برقرار رکھا ہے۔ حمیدہ معین رضوی کے افسانوں کے مطالعے سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ وہ ایک ترقی پسند افسانہ نگار ہیں اور خاص طور پر ترقی پسند تحریک سے متاثر ہیں اور ان کے افسانوں کے موضوعات بھی ترقی پسند تحریک کے مقاصد کے قریب تر ہیں۔ یوں وہ کرشن چندر اور ندیم قاسمی' عصمت چغتائی' ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کی اختیار کی ہوئی افسانوی شاہراہ پر چل رہی ہیں۔ مگر اسی شان کے ساتھ کہ ان کا اپنا الگ تشخص واضح طور پر نمایاں ہے اور انہوں نے موضوعات اور ہیئت ہر دو کے حوالے سے اپنا ایک الگ اور منفرد اسلوب پیدا کیا ہے۔ ان کے افسانوں کے مجموعے "مردہ لمحوں کے زندہ منظر" میں طویل کہانیاں ہیں جو بیانیہ انداز لئے ہوئے ہیں۔ حمیدہ معین رضوی نے اپنے کرداروں کو اس طرح پینٹ کیا ہے کہ وہ فلسفہ بگھارتے ہوئے بھی قاری کی دلچسپی کو برقرار رکھتے ہیں۔ اور پھر وہ اپنے مقصد اور نظریے کو چند جملوں میں اس طرح بیان کر دیتی ہیں کہ ان کے نقطہ نظر کو سمجھنے میں نہ تو دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور نہ ہی قاری ابہام کے کنویں میں گرتا ہے۔ بلکہ کہانی کے متوازن بہاؤ کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے اور کہانی کے کرداروں کے یادوں کے سلسلوں کے ساتھ ساتھ خود قاری کی اپنی یادوں کا سلسلہ بھی چل نکلتا ہے۔

حمیدہ معین رضوی نے اپنی مقصدیت کے لئے نعرہ بازی سے کام نہیں لیا بلکہ سمجھنے اور سمجھانے کا انداز اختیار کیا ہے۔ انہوں نے طبقاتی کشمکش، سماجی ناانصافی، جبر و استحصال اور معاشرے کی حق تلفی اقدار کے خلاف قلم اٹھایا ہے اور بورژوا طبقے کے چہرے سے نقاب اتار کر اس کا اصلی چہرہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔

حمیدہ معین رضوی نے مغربی ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور ان کے افسانوں پر ان کے مطالعے کی گہری چھاپ بھی نظر آتی ہے مگر انہوں نے کہانی کو مغربی رنگ میں نہیں رنگا اور اسے مشرقی ہی رہنے دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیوں کا تانا بانا' رد و پود' ماحول' کردار' واقعات' سوچ کے زاویے' فکری لہریں اور رومانی طرز احساس سب کچھ مشرق کا ہے۔ اس تناظر میں ان کے بیشتر افسانے اگرچہ المیاتی صورت حال پر ختم ہوتے ہیں۔ پڑھنے والے کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں حمیدہ معین رضوی قدیم افسانہ نگاروں سے الگ ہو جاتی ہیں۔ ان کا یہ مجموعہ افسانوی ادب میں ایک ایسے خوشگوار جھونکے کی طرح در آیا ہے جس میں کہانی پن کو شعوری طور پر برقرار رکھا گیا ہے۔ جو اردو افسانے کو اعتبار بخشتا ہے۔ شمیم احمد نے جو ایک بار یہ نعرہ لگایا تھا کہ "اردو افسانہ مر چکا ہے" تو حمیدہ معین رضوی کے افسانوں کا یہ مجموعہ "مردہ لمحوں کے زندہ منظر" اس بات کا واضح اعلان ہے کہ اردو افسانہ ابھی زندہ ہے۔

فیمنزم کے مختلف پہلو

امین مُغل (لندن)

حمیدہ معین رضوی کے افسانوں کو دو قسموں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ ایک تو وہ ہیں جن میں خاندان اور فرد کے مسائل سے ہٹ کر دنیائی موضوعات پر زور دیا گیا ہے مثلاً "سرکل لائن کی ٹرین" جس میں بے گھری کا آشوب ہے "دو بدری" میں بے روزگاری اور اس کے ساتھ ویسٹ انڈین ایشیائی اور سفید فام کمیونٹیوں کی گلیوں کے فاصلوں کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ "اجلی زمین نیلا آسمان" کی کہانی میں نسل پرستی کے خلاف احتجاج ہے۔ اور پھر "دور کا سایہ" جو ایک فلسطینی مجاہد کا شہادت نامہ ہے۔ باقی افسانے برِصغیر جنوبی ایشیا کی معاشرتی اقدار کا مطالعہ پیش کرتے ہیں۔ ان میں بنیادی کردار متوسط طبقہ کی لڑکیاں ہیں جو جنسی نابرابری، محبت، نامحرم، خاندان، شادی کرانے نہ کرانے، "کس سے کرانے" کیوں کر کرانے" کے چکروں میں پھنسی ہوئی ہیں۔ لیکن یہ افسانے سیدھے سادے معاشرتی قصے نہیں جنہیں اس دور کے مصورِ غم راشد الخیری نے ترتیب دیا ہو۔ ان میں خالائیں، پھوپھیاں، ماموں، ممانیاں، بھائی، بہنیں، کزن آنکھ مچولی کھیلتے ہیں۔ شادیاں ہوتی ہیں اور بگڑتی ہیں، کہیں بنتی نظر آتی ہیں، کہیں بگڑ کر بنتی ہیں اور کہیں بن کر بگڑتی ہیں۔ یہ سب کچھ ان میں ہوتا ہے لیکن ایسے روایتی انداز میں نہیں جیسے اصلاحِ معاشرہ کے علمبردار افسانوں میں یا "نیک پروین" یا "گھر کی عزت" ایسی فلموں میں ہوتا ہے۔ اور یوں بھی نہیں کہ ۴۰ء اور بعد کے ترقی پسند ادب کی طرح آنچل پرچم بن جائے، پرانی قدروں کا جنگل دکھایا جائے اور پھر روشنی کی کرنیں کہیں سے چھن کر آنی شروع ہو جائیں۔
آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش اور ظلمت شب کی سیماب پا ہو جائے گی۔
حمیدہ معین رضوی کے ہاں معاملہ کچھ پیچیدہ ہے۔ روشنی روشنی نہیں، روشنی اور ظلمت کا مغلوبہ ہے اور ظلمت محض ظلمت نہیں ہے اس میں روشنی کی کرن کہیں ہوتی ہے یعنی واضح حل کوئی نہیں ہیں اور اگر ہیں بھی تو وہ جچے نہیں۔ دل میں خلش چھوڑ جاتے ہیں کچھ سوال رہ جاتے ہیں، کچھ جواب اکھڑے اکھڑے رہتے ہیں۔ "میں بجھی بجھی آنکھوں سے ان تینوں راستوں کو دیکھتی ہوں جن میں سے ایک کو مجھے منتخب کرنا ہے۔"

وہ کردار جو روایتی قدروں سے باہر نکلنے کی امید دلاتے ہیں، وہ خود بھی تو پوری طرح آزاد نہیں ہوتے اور حمیدہ معین دکھاتی ہیں کہ کس طرح وہ خود ابھی تک مرد کی روایتی بالادستی میں رنگے ہوئے ہیں، اور خود جنسی برابری اور برابری کی سطح پر محبت اور احترام کا رشتہ پیدا کرنے کے اہل نہیں ہوتے۔ یعنی صحیح ترقی پسند سوچ کا کوئی کردار بھی حاوی نظر نہیں آتا۔ دنیا کے پاؤں مٹی کے ہیں اور اس مٹی کے سوا بننے کے امکان کچھ کم ہی ہیں۔

"شیشوں کا مسیحا" میں چیف کردار کا محبوب نعمان اس کے بڑے بھائی کا دوست تھا۔ وہ کہتی ہے "مجھے یہ شخص اس وقت پسند تھا جب وہ صرف بڑے بھیا کا دوست تھا۔ محبوب کی حیثیت سے نہیں.... ایک ہیرو کی حیثیت سے... ایک ایسا شخص جو آئیڈیالوجیکل باتیں کرتا تھا۔ جس کے پاس آئیڈیل تھے، جو انقلابی تھا۔ جو سٹوڈنٹس یونین کا صدر تھا۔ ہڑتالیں کراتا تھا۔ جلوس نکالتا تھا۔ جیل بھی جا چکا تھا۔ اور پولیس اس سے خوف کھاتی تھی۔ کتنے سارے رومانس تھے اس کی ذات میں۔ ایک چودہ سالہ لڑکی کے لئے.... اور..... تو اور.... انگلینڈ میں بھی وہ بڑا Radical مشہور ہوا تھا۔" تو یہ نعمان مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بنتے وقت بھی فعال تھا۔ بنگالی النسل نہ ہوتے ہوئے بھی اس نے بنگالیوں سے محبت کی۔ وہ عورت کی حق تلفیوں اور استحصال کے سخت خلاف ہے۔ بڑی عمر کا نعمان اس کو براہِ راست شادی کی تجویز پیش کرتا ہے۔ بعد میں وہ سوچتی ہے "اُسے اس عمر میں.... اس کا سٹائل کچھ ان رومانٹک لگا۔ کچھ چلو ہوا سٹائل۔ مگر اس نے خود کو یہ دلیل پیش کی ہو تو پھر بھی نئے نظریات کا حامل ہے اس لئے اس سے پوچھ بھی لیا۔ ورنہ اپنے گھروں میں بھی.... تو ایسا کوئی رواج بھی نہیں۔"

لیکن یہ کیسا انقلابی ہے جس کی "مسکراہٹ ایک طرح کی.... دعوت سی تھی.." لیکن یہ لڑکی جو اس نعمان کی انقلابی قد آوری کے تحفے گئی ہوئی ہے اس سے محبت چاہتی ہے، ایک مرد اور عورت کے درمیان ہونے والے حسّی رشتہ کی نرمی اور آنچ محسوس کرنا چاہتی ہے۔ لیکن یہ اس سے نہیں ملتی۔ پتہ چلتا ہے کہ انقلاب کے خیالات اور اس کی سیاست نے اس کی شخصیت کو نہیں بدلا۔ شب عروسی میں "نعمان کا سارا انداز matter of fact سا تھا۔" انگلستان میں آنے کے بعد نعمان کی انقلاب پسندی تیزی سے ڈھیلی پڑتی گئی۔ برطانیہ میں جب نعمان کو "زندگی کی ابتدا بر کام سے کرنی پڑی تو وہ بورژوا حرکتیں کرنے لگے... اچھا گھر... اچھی کار.... ہر سال تفریحی مقام کی چھٹیاں۔ ہفتے میں کسی اچھے ہوٹل میں طعام" وغیرہ وغیرہ اور ادھر ہیروئن نے سوچنا شروع کیا: "عورت کو بچپن سے گھر میں بھی بیٹھنے نہیں دیتا کہ یہ جہالت کی علامت ہے۔ وہ عورت کو

تعلیم .... آزادی اور خودمختاری کے راستے سے باہر گھسیٹ لاتا ہے مگر اس کے ساتھ یہ توقع بھی ہے ... کہ وہ تقیہ، معقولیت اور منطق کا کوئی استعمال نہ کرے"

اور ان حالات میں اُس ہیروئن کو ملتا ہے آرٹ کرشین، جو اس کے سامنے انسانی رشتوں خاص طور پر مرد اور عورت کے رشتے میں مغربی انداز فکر کی نمائندگی کرتا ہے۔ جو اس عورت کے نعمان کے ساتھ رشتے کو کچھ نہیں پاتا۔ وہ نہیں سمجھ پاتا کہ وہ نعمان سے مطمئن اور آسودہ نہ ہونے کے باوجود اس کے ساتھ کیوں چپکی ہوئی ہے۔ وہ ان کے تعلق کو مجبوری کہتا ہے "جیسے غلاموں کو آقا سے ہوتی ہے"۔ لیکن وہ کہتی ہے: "آرٹ کرشین، تم چاہے جتنی کوشش کرو... تم میری وفاداری کی دیوار میں شگاف نہیں ڈال سکتے" اور آرٹ کرشین کو وفاداری کی اصطلاح کی سمجھ نہیں۔ وہ اس سے عشق جتانے کی کوشش کرتا ہے اور منہ کی کھاتا ہے وہ بار بار ہے۔ لیکن شرافت میں مستغنی ہو جاتا ہے لیکن اس سے پیشتر یہ ہوتا ہے کہ وہ عورت آرٹ کرشین کے اظہار عشق کے جملے کے بعد احساس جرم میں مبتلا ہوتی ہے تو پھر نماز کے ذریعہ اس کو سکون ملتا ہے۔ نعمان سے نا آسودہ ہونے کے باوجود اس کی وفاداری قائم رہتی ہے اور کچھ کچھ نعمان بھی اس کے قریب آ جاتا ہے تو گویا حمیدہ معین رضوی کے اس افسانے میں انقلابی فرسے باز ایک لمبے سفر کے بعد، صحیح معنوں میں عملی سطح پر عورت کے ساتھ برابری کے راستے پر چلنا شروع کرتا ہے۔ لیکن یہ تبدیلی کیوں اور کیسے؟ وہ یوں کہ آرٹ کرشین کے عشق کے چیلنج سے زیادہ مضبوط اور پائیدار اس ہیروئن کے اندر کے مشرقی وفاداری، یعنی نکاح کے رشتے کا تقدس اور شوہر سے وفاداری ثابت ہوتی ہے۔ لیکن کیوں اور کیسے اور یہ کس طرح نعمان کو بدل لیتی ہے جب کہ نعمان کو یہ بھی پتا نہیں کہ آرٹ کرشین نے اس کی بیوی سے محبت کرنے کی کوشش کی تھی۔

حمیدہ معین رضوی نے اس افسانے میں کالا کلب کی منطق اور اس کے عمل کو دکھایا نہیں۔ قاری ہوا میں معلق ہو جاتا ہے۔ کچھ اسی طرح کے مسائل کہانی "دوپٹے" میں ہیں۔ حیدرآباد دکن کے روایتی جاگیردارانہ ماحول کے ایک گھرانے کی اس کہانی میں سیلا اپنی بڑی بہن رحیلہ سے بے وفائی کر کے اس کے منگیتر فاروق سے محبت کرتی ہے اور وہ رحیلہ سے بے وفائی کر کے اس کے لئے رشتہ کا پیغام بھیج دیتا ہے۔ شادی ہو جاتی ہے اچھا کام رہتی ہے۔ جنوں کی امی کا انتقال ہوتا ہے اور ایک خط کے ذریعہ پتا چلتا ہے کہ سیلا دراصل ابو کی ایک مغنیہ سے دوستی کا پھل تھی جسے ابو اور امی نے اپنی بچی کے طور پر پالا اور اسے کبھی نہیں بتایا کہ وہ ایک مغنیہ کی بچی ہے۔

یہاں بھی شادی کا تقدس اور شادی سے باہر بچے کی پیدائش کو گناہ سمجھنے کی قدریں بن کر ابھرتی ہیں۔ لیکن بچے کی پیدائش کے بعد فوراً نے امی لکھتی ہیں: "سیلا، مرد عورت سے بہت قوی ہوتا ہے لیکن بعض ایسے نازک مقام بھی آتے ہیں جہاں وہ عورت کا محتاج ہو جاتا ہے اُسے عورت کی آغوش میں پناہ ملتی ہے۔ عورت جو دھرتی کی ماں ہوتی ہے۔ اگر زندگی میں یہ لمحے آئے تو اسے ضرور گرفت میں لے لینا۔ اسے مت کھونا" ماں کی یہ نصیحت سیلا سے کہتی ہے کہ اگر کبھی فاروق نے اس کی طرف رجوع کیا تو وہ دریچہ ضرور کھول دینا جو تم نے اس پر بند کر دیا تھا۔

سوال ہے: عورت ہی کو یہ نصیحت کیوں کہ وہ مرد کو معاف کر دے؟

اور .... فاروق اور ان دو لڑکیوں کی تثلیث کے سامنے ایک اور کردار ہے: ضیاء جو کمیونسٹ ہے اور سیلا سے عشق کرتا ہے اور شادی بھی کرتا ہے۔ وہ نارسائی کا شکار ہے اور ویتنام وار میں مر جاتا ہے۔ اس افسانے میں وہ پیار اور نئے آدرشوں کا علمبردار ہے۔ وہ پرچھائیں کی طرح ہے۔ اگر سیلا اس سے شادی کر لیتی ہے تو کیا اس کے جذباتی مسائل حل ہو جاتے؟ کون جانے؟ لیکن حمیدہ معین نے اسے پیدا کر کے ایک سوال اور ایک ممکنہ جواب کی طرف اشارہ کر دیا۔ ایک خلش پیدا کر دی۔ لیکن جو کل افسانے میں ابھارا وہ شاید روایتی تھا: عورت کو نصیحت کہ وہ مرد کو معاف کر دے۔

یوں تو حمیدہ معین رضوی کے تمام افسانوں میں فیمنزم کے مختلف پہلوؤں کو کھنگالا گیا ہے لیکن ایک افسانہ خاص طور پر چونکا دینے والا ہے: "اور برف گرتی رہی"۔ ایک عورت ہے جو مرد سے بیزار ہے اور وہ کہانی کے بنیادی کردار سے عشق کرتی ہے (یوں کہیے دلچسپی رکھتی ہے)۔ ایک مقام پر "اس نے سگریٹ کا ٹکڑا بے احتیاطی سے پھینک دیا۔ اور جھک کر میری پیشانی پر بے ساختہ پیار کر لیا۔ میں حیران حیران سی جلدی سے ٹیکسی میں بیٹھ گئی"

مرد بیزار خاتون بالآخر اس درد سے خالی ہو جاتی ہے اور بنیادی کردار کی گھریلو زندگی، میاں بیوی کے پیار اور بچوں سے پیار سے متاثر ہو کر واپس پاکستان چلی جاتی ہے اور کہتی ہے: "اپنے طبقہ کی عورتوں کے لئے وہاں شاید رہ کر میں زیادہ کام کر سکتی ہوں۔"

لیکن یہ بنیادی کردار کون ہے؟ "میں خود کو لفظوں میں تین نسلوں کے برابر سمجھتی ہوں۔ میں اتنی بوڑھی ہو گئی ہوں۔ اصول تو صرف خوبصورت سکون کی چار دیواری میں کتنے آسان الفاظ ہیں۔ مگر اصلاح کے دکھ ہیں۔ میرے دل میں اس کی بے پناہ عزت ہے کہ میں اس ہجوم اور اس کیچڑ میں چلنے سے ڈر رہی ہوں۔ میں اپنے شوہر کا انتظار کر رہی ہوں۔ ساری بات سمتوں کے تعین کی ہے۔ کون جانے۔ کون جانے۔"

سوال یہ ہے کہ کیا گھر گرہستی مسئلہ کا حل ہے۔ مانا کہ بنیادی کردار کو گھر میں کسی حد تک سکون مل جاتا ہے لیکن فیمنسٹ لڑکی فیمنسٹ کیوں بنی؟ غریب گھرانے کی عورتوں کے مسئلوں کا کیا حل ہے؟ جنھوں نے شادیاں کیں، لیکن وہ شادیاں ناکام رہیں۔ تو پتا چلا کہ مسئلہ سراسر جنسی بھی نہیں ہے اور معاشی

بھی نہیں ہے ان کا حل تو ایسا ہونا چاہئے جو ان دونوں کا احاطہ کرے۔

فیمنسٹ کردار گھریلو زندگی کو اجتماعی جدوجہد سے جوڑنے والی ہوتا ہے اور یہ عورت ہے جو شوہر اور اس سے متعلق تحفظ کی امان میں ہے ہجوم سے اور کچھ سے بھی اجتماعی جدوجہد اور اس کی آلودگیوں سے ڈرتی ہے اس کا سکون بھی تو بچا (یا مکمل) سکون نہیں ہے وہ اس کا اپنا سکون ہے ایک گھر نے کا سکون ہے جب کہ یہ خواہش پوری نہیں ہوتی کہ غم دوراں بھی ہو جائے غم جاناں تو کرلیا اس نے۔

مجھے معلوم ہے کہ میں حمیدہ معین رضوی کے افسانوں کے ساتھ بے تکی برت رہا ہوں۔ معاملہ شاید اتنا آسان نہیں ہے جتنا میں نے بنا دیا۔ کل خود کچھ ہوں اور میرے ان کے بارے میں تحفظات کچھ ہوں افسانوں کی توانائی کو محض قدروں کے معیار پر نہیں پرکھنا چاہئے۔ (اور پھر یہ اصرار کہ میری قدریں ہی درست ہیں ایک غیر محتاط دعویٰ ہے)۔ اس کے برعکس ان کے افسانوں کی ایک بڑی خوبی یہ ہے بلکہ خوبی ہی یہ ہے کہ ان میں واضح طور پر ملتا ہے کہ معاملات اتنے آسان نہیں ہیں۔ مختلف نظریات اور افکار کی کئی پرتیں ہوتی ہیں اور وہ ان پرتوں کو دکھاتی چلی جاتی ہیں۔ ان افسانوں میں آپ کو ہر وقت خود کلامی اور مکالمے سنائی دیں گے۔ خیالات کی اچھائیاں اور برائیاں مسلسل خود ذہن کے تلے پڑی رہتی ہیں۔ کردار ہر وقت محسوس کرتے دکھائی دیتے ہیں اور ہر وقت سوچتے دکھائی دیتے ہیں اور افسانہ نگار مسلسل اس عمل مسلسل کو ہمارے ذہن کے پردۂ سکرین پر چلتے دکھاتا چلا جاتا ہے۔

ان افسانوں میں مسلسل خود احتسابی کی کیفیت ہے تکنیک کے بیانوں پر بھی چھائی پائی جاتی ہے اس لئے نہ تو سطحی قسم کی یاسیت ملتی ہے اور نہ رجائیت۔ زندگی کے اسرار کی پیچیدگیوں کو سمجھنے کی کوشش ملتی ہے اور جو بھی حل ملتے ہیں وہ جزوی ہوتے ہیں۔

ایک خصوصیت ان افسانوں کی یہ ہے کہ ان کا فوکس متوسط طبقہ کے لڑکے لڑکیاں ہیں جو انٹلکچوئل ہیں۔ اور یہاں قرۃ العین حیدر کا ذکر ناگزیر ہو جائے گا۔ اس لئے کہ حمیدہ معین ان سے بے پناہ متاثر ہیں۔ وہ دور بھی تو قرۃ العین حیدر کا دور تھا۔ جب ایک خاص رومانویت کو فروغ ملا۔ جب کردار خوابوں کے تانے بانے میں مغرب مشرق کے فلسفوں کو ملا دیتے تھے خواہشوں کے سراپا تراشنے میں مغرب کے امیج اور سوچ کے سانچے استعمال میں لائے جاتے تھے۔ لیکن حمیدہ کے کردار پاپ اور پوم پوم نہیں ہیں اور نہ بالکل اپنے مشرقی ماحول سے کٹے ہوئے ہیں بلکہ وہ اس میں پیوست ہیں۔ لیکن ان کی فکر کے زاویوں کی ساخت میں مغربی علوم کی کارفرمائی نظر آتی ہے اور بعض افسانوں کا ماحول اور امیجری تو بالکل ہی قرۃ العین حیدر کی یاد دلاتی ہے ایک خاص تلذذ ایک خاص رومانوی ذہن خاص رومانوی برف پوش چوٹیاں خیالوں کی سوچیں کی اساسوں کی۔

لیکن حمیدہ کے کردار معاشرتی اعتبار سے گھمبیر ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی شعور بھی رکھتے ہیں نہ تو وہ آئیڈیل کردار ہیں اور نہ ان کا مذاق اڑایا گیا ہے۔

"اجلی زمین میلا آسمان" کے بیشتر کرداروں کا تعلق ایشیائی تارکین وطن کی پہلی پیڑھی سے ہے دوسری پیڑھی کے کردار بھی ملتے ہیں لیکن کم کم۔ مثلاً "شناخت کی جستجو" میں چودہ پندرہ سال کا بل ہے جو ایک مالدار عورت اور ایک مغربی تہذیب سے مرعوب غریب پس منظر سے آنے والے شخص کا لڑکا ہے۔ افسانہ ماں باپ کی ناچاقی زندگی کے کھوکھلے پن سے بیٹے پر مرتب ہونے والے اثرات کی کہانی ہے بل کی خودکشی کی کوشش پر مرکوز اس کہانی میں ماں کی ممتا جاگتی ہے بیٹا اور ماں پاکستان کے سفر پر روانہ ہوتے ہیں اور سفر عقل و ہوش کی طرف مراجعت کی نشاندہی کرتا ہے۔

یقیناً حمیدہ معین رضوی نے پہلی پیڑھی کے مسائل کو خوب کھنگالا ہے لیکن ہماری دوسری اور تیسری پیڑھیاں کہاں ہیں؟ تارکین وطن کی گھریلو زندگی کا تانا بانا بکھرتا جا رہا ہے مغرب کی انفرادیت پسندی نے ہر فرد کو فکری آزادی بخشی ہے وہ کس طرح ہمارے خاندانی نظام کو درہم برہم کر رہی ہے... کس طرح ہماری لڑکیاں غیر ایشیائی لڑکیوں کی طرح طوائفوں کی منڈی میں داخل ہو رہی ہیں کس طرح ہمارے لڑکوں کے لئے معاشرتی معیار اور ہیں اور ہماری لڑکیوں کے لئے اور۔ کس طرح پاکستان اور ہندوستان سے لڑکے برآمد کر کے یہاں کی پڑھی ہوئی لڑکیوں کو زبردستی ان کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے اور پھر ماں اور باپ کے رشتے اور گھر سے باہر بڑے مسائل ہیں نسل پرستی کے اور معاشرتی نابرابری کے۔ ان سب کا گھریلو اور اجتماعی زندگی اور فرد کی ذات پر کیا اثر پڑ رہا ہے حمیدہ معین رضوی! آپ کے لئے بہت بڑا میدان کھلا پڑا ہے ایک گہرائی کا آپ سے تقاضا ہے تو بڑا لیکن آپ پورا کر سکتی ہیں!

دہشت گرد اور دہشت گرد

حمیدہ معین رضوی

ملیحہ شہاب نے ایک اجنبی دروازے کی دہلیز پر پاؤں ٹکا کر غور سے دیکھا۔ پنجے میں چھالے پڑ گئے تھے۔ اس نے پھر پاؤں سڑک پر ٹکایا اور بڑبڑائی۔

دل چاہتا ہے ادبی جلسے کے منتظمین کا سر پھوڑ دوں یا اپنا نہیں تو مہمان شعرا کو بم سے اڑا دوں۔ جو پیسے اور شراب کی لالچ میں بھاگے چلے آتے ہیں اور لندن پہنچتے ہی عجیب و غریب حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ خوب خوب فرمائشیں ہوتی ہیں۔ خوب فائدہ اٹھاتے ہیں مگر ..... بقول فریحہ ہاشمی پاکستان واپس جا کر آنکھیں ماتھے پر رکھ لیتے ہیں اور یہاں والوں کو پہچانتے بھی نہیں۔

اس نے پھر اپنے پنجوں کو دیکھا۔ شاید چھالا پھوٹ گیا تھا اور..... وہ لمحہ بھر کو رکی۔ برا ہوا ہے ادبی ذوق کا۔ سنا تھا کچھ بہت اچھے اردو کے شعراء آئے ہیں اس لئے اکیلے ہی آنے کی ہمت کر لی مگر ..... شعراء کی شراب نوشی کے ہنگامے نے محفل درہم برہم کر دی... اور اسے بے نیل و مرام آنا پڑا۔

سات سمندر کی سات ٹرینوں کے رد و بدل کے بعد یہاں پہنچنا خالہ جی کا گھر نہیں اوپر سے جب جلسہ بھی ملتوی ہو جائے اور ہنگامہ پولیس میں ملے۔

اس نے رک کر سامنے دور تک دیکھا۔ پھر ادھر ادھر دیکھا۔ شام ڈھل چکی تھی اور سائے لمبے ہو رہے تھے... اور... ابھی ریلوے اسٹیشن کا اشارہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اب اسے تھوڑی گھبراہٹ بھی ہونے لگی۔ یہ علاقہ ٹاور ہیملٹس اور بدنام زمانہ تعصب پرست جماعت نیشنل فرنٹ کا گڑھ تھا۔ جب کہ یہاں کے لوگوں کی اکثریت مسلمانوں کی ہے پہلے یہاں یہودی آئے وہ غربت سے دولت کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے کھاتے پیتے علاقوں کی طرف جا بسے۔ پھر پوش لوگ آئے فلسطینی آئے۔ پاکستانی اور بنگالی آئے۔ سب ہی معاشی ترقی کی دوڑ میں تھے۔ سب ہی آگے بڑھ گئے سوائے... پاکستانیوں اور زیادہ تر بنگالیوں کے۔ یہ لوگ غربت کے جھنڈے گاڑے جہالت کے پرے اڑاتے بچوں کی فوج ظفر موج لئے دندناتے..... ٹھیلیں بجاتے پھرتے ہیں۔ بلکہ انہیں نیشنل فرنٹ کے جاہل گورے باکسنگ کے بیگ بھی بناتے ہیں اور اس عمل کو "پیکی بیشنگ" کہا جاتا ہے جب کہ پٹنے والے بنگالی ہوتے ہیں اور انہیں پاکستان سے بچھڑے تیس برس ہو چکے ہیں مگر مجھے فکر جہاں کیوں ہو... جہاں....

یہ امر واقعہ ہے کہ مجھے فکر جہاں ہونا چاہئے۔ میرے چھالے ٹھنک کر رہے ہیں۔ سڑک سنسان ہے۔ شام ڈھل رہی ہے۔ ٹیکسی نظر نہیں آ رہی ہے اور اسی سڑک کے ایک بس سٹاپ پر ایک ایشیائی عورت کے کپڑوں میں چند گورے لڑکوں نے آگ بھی لگائی تھی اور اسے اس وقت پتا چلا جب آگ کی لپٹیں اسے لپیٹ چکی تھیں.... یہ بھی ایک واقعیت ہے کہ ایک گوری عورت نے اپنی کھڑکی سے دیکھ کر پولیس کو فون کیا تھا۔ یوں اس عورت کو ہیلی کوپٹر میں ہسپتال لے جایا گیا اور اس کی زندگی بچائی گئی۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کے بعد میں ملیحہ شہاب اس واقعے کے بعد سے یہاں نہیں آئی۔ تیرہ برس گزر چکے۔ یعنی تنہا نہیں آئی۔

اور جہاں تک تنہائی کا تعلق ہے تو وہ ابھی نہیں کہ اکیلے سفر نہیں کرتی تھی وہ پاکستان کے ایک چھوٹے سے شہر کے ایک بہت بڑے مشہور زمانہ کالج سے ایم اے کر کے آئی تھی اور جلد ہی نوکری کے لئے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ یہ انیس سو ستتر اٹھتر کا زمانہ تھا اور اب سے کافی مختلف یہاں پر مشرقی لندن جو شہر کے قریب ہے انتہائی غلیظ ہوتا تھا۔ برک لین اور پیٹی کوٹ لین میں پاکستان کی طرح کے کھوکھے تھے۔ اور گندگی کے ڈھیر تھے اور ٹوٹی پھوٹی عمارتیں تھیں اور گرینچ کا قبرستان تھا اور ویسٹ انڈیا ڈاک کا کیچڑ علاقہ تھا وہ صبح سات بجے گھر سے نکلتی تو چھ بجے تک واپس گھر پہنچتی۔ سردیوں میں نو بجے سورج نکلتا اور ساڑھے تین غروب ہو جاتا زیادہ سفر اندھیروں میں کٹتا مگر ڈر نہیں لگتا تھا۔ ٹرینیں کم تھیں سرنگ میں رک جاتیں مگر لوگوں کے رویے مہذب تھے خصوصاً مغربی لندن والوں کے۔ پولیس والوں سے کچھ پوچھو تو بہت مسکرا کر جواب دیتے اگرچہ لوگوں کا خیال تھا کہ صرف خوبصورت ایشیائی عورتوں کو مہذب جواب ملتا۔ وہ ہنس پڑی۔ اس حوالے سے لوگ شاید ٹھیک تھے.... مگر کوئی مادہ خوبصورتی کو... اس نے سامنے سے آتے ہوئے پولیس والے کو روکا۔

جناب ریلوے اسٹیشن کتنی دور ہے؟

کوئی تین سو گز چل کر دائیں طرف مڑ جائیے... اس نے ٹھیک سے مسکرا کر جواب دیا۔ جواب تو ٹھیک دیا ہو گا نہ۔

اور.... اب جرائم کس قدر بڑھ گئے... یہی وجہ ہے کہ ایک ہراس سانپ کی پھنکار کی طرح سرسراتا محسوس ہوتا ہے۔ وہ لڑکی جو ویمبلڈن پارک میں اپنے بچے کو پرام میں لے کر گھمانے نکلی تھی۔ دن دہاڑے ایک آدمی نے اس سے جبری بدکاری کی اور گلا گھونٹ کر چلا گیا۔ دوسرے لوگوں نے عورت کو گھاس پر لیٹے دیکھا اور بچے کو مسلسل روتے سنا تو پولیس کو فون کیا تب معلوم ہوا لڑکی مر چکی ہے۔ فریحہ نے سچ کہا تھا لوگوں نے دیکھا بھی ہو گا تو سمجھے ہوں گے عاشق و معشوق ہیں۔ یا کوئی بازاری عورت ہے یہاں ان چیزوں پر اخلاقی پابندی تو ہے نہیں۔ قانون ہو تو شاید احترام کر لیں مگر انسانی حقوق والے چڑھائی کر دیں

گئے۔ یہ دکھ کی بات پہلے ایسا شاذ و نادر ہوتا تھا۔ اب .... اس نے جھرجھری لی۔

ہاں کراس کے قریب آئرش انتہا پسند کبھی کبھی دھماکے کروا دیتے مگر زندگی کا کاروبار رواں دواں رہتا۔ اب سی آئی اے کی پیدا کردہ القاعدہ کی دہشت پھیلائی جا رہی ہے اور کچھ بھی نہیں ہوتا تو بھی ٹرین میں آئے دن حادثے ہو جاتے ہیں۔ لوگ مرتے ہیں ان حادثوں میں سے کسی میں کسی دہشت گرد کا ہاتھ نہیں تھا۔

اسے وہ زمانہ ایک دم سے یاد آ گیا۔ جب وہ پہلے مغربی لندن کے اسٹیشن سے ٹرین میں بیٹھی تو تمام وقت پاکستان کو اور اس کی ہواؤں کو اس کے پھولوں اور موسموں کو کوئل کی کوک اور والدین کی محبتوں کو یاد کرتی۔ آج پچیس برس بعد وہ سب دھند میں گم ہوا محسوس ہوتا ہے آج جو ماضی میرے کاندھوں پر ایک ردا کی طرح لپٹ گیا ہے وہ لندن ہے پاکستان نہیں ہے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ یوں بھی ہوگا۔ برطانیہ کی مٹی اور ہواؤں میں رچ بس جائیں گے۔ پھر ایک دن اسی مٹی میں سو جائیں گے۔

وہ زمانہ تھا جب انگریزوں پر جنگ عظیم کے اثرات باقی تھے۔ لوگ غربت میں گزر کرتے تھے۔ گھروں میں قالین اور سنٹرل ہیٹنگ ہونا بڑی چیز تھی۔ لندن میں پاکستان اور ہندوستان کے پڑھے لکھے متوسط طبقے کے لوگ تھے مگر معمولی نوکریاں کرتے تھے۔ کیونکہ اعتماد کی کمی تھی۔ انگریزوں سے ویسے ہی رویہ رکھتے تھے جیسے مثلاً پاکستان میں غلامی کے دور میں کرتے تھے۔ ہاں میری عمر کے لوگ اتنی پروا نہیں کرتے تھے یعنی پاکستان کی پہلی نسل۔ لوگ ہر بات میں انگریزوں کی نقل کرنے کی کوشش کرتے۔ اسے اب بھی یاد ہے اسی مشرقی لندن کے ایک اسکول میں وہ پڑھاتی تھی۔ تو انگریز اساتذہ اس کے سامنے ہندوستانی پاکستانی خصوصاً اور باقی تارکین وطن کی جہالت کا خوب مذاق اڑاتے۔ پاکستانی ہندوستانی ڈاکٹروں نرسوں اساتذہ اور مزدوروں نے ان کی معاشیات کو سنبھالا تھا مگر ..... ان سے تضحیک و تذلیل برتی جاتی۔ طبقاتی تفریق کا احساس بہت نمایاں تھا حقیقت تو یہ ہے کہ مزدور طبقے کے انگریزوں کو بھی تضحیک کا نشانہ بنایا جاتا۔ اس وقت تک ایجوکیشن کالجوں میں برن سٹائن کی زبان کے کلیوں کو متعارف نہیں کرایا گیا تھا طبقاتی استعماری کا رویہ عام تھا اور اسی پر عمل کیا جاتا۔

اسے تھوڑی ہنسی آئی... ایک اور یہودی تھی برن سٹائن۔ مغرور یہودیوں میں کوئی خاص بات ہے تعداد کم عقل زیادہ۔ کونسا میدان ہے جس میں ان کا سکہ نہیں چل رہا ہے۔ ہم مسلمان ان کا کیا مقابلہ کریں گے جو عورتوں کے پیچھے بھاگتے ہوئے عمر گزار دیتے ہیں۔ رسول ﷺ بلاوجہ ہی نہیں اپنی امت کے لئے پریشان تھے۔ حدیث "میری امت کے لئے سب سے بڑا امتحان عورت ہے" یہ انتہا تھا کہ ایسا نہ کیا مسلمان کو شاید سمجھ میں نہیں آیا اس لئے وہ ماتم کرنے لگے۔ اور عورت اور جنس ان کی زندگی ہو گئی۔ کیا کسی محبوب کو دیکھ کر مسرت ہوتی ہوگی جو اس وقت ٹرین کا اسٹیشن دیکھ کر اسے ہوتی۔ وہ اسٹیشن میں داخل ہو کر سیڑھیوں کے قریب پہنچی ہی تھی کہ دیکھا لندن کی ٹرین اسی وقت چھوٹی تھی۔ اسٹیشن بالکل خالی ہو چکا تھا وہ تھوڑی دیر کھڑی سوچتی رہی۔ بالکل خالی اسٹیشن پر جاتے ہوئے اسے خوف محسوس ہوا۔ اس لئے وہ سیڑھیوں کے اوپر ٹکٹ گھر کے پاس کھڑی رہی۔ پھر کوئی ٹکٹ گھر کی عمارت میں داخل ہوئے زور زور اردو میں باتیں کرتا ہوا ایک گروہ آ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ سب مہمان شعراء اور ادیب تھے اور اسی کانفرنس سے واپس آئے تھے جس سے ابھی وہ خود آئی تھی۔ ان میں سے ایک دو پاکستان کے اچھے شعراء بھی تھے مگر اس وقت نشے میں دھت طلبہ دیکھ کر اسے کراہت محسوس ہوئی پھر جہالت میں اتنی زور زور سے باتیں کر رہے تھے چند بوڑھی عورتیں اور مرد ناک بھوں چڑھا رہے تھے۔ آج اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس نے خود کو برطانوی محسوس کیا اور اسے بھی ان کے اطوار بے انتہا قابل اعتراض محسوس ہوئے۔ انہیں کی بیہودگیوں کی وجہ سے کانفرنس نہ ہو سکی۔ ادب و شعر کے میدان میں کارگزاری دکھانے کے بجائے جہالت کے میدان میں لیاقت دکھائی۔ ادب و شعر کے تبادلوں کی جگہ گالیوں کے تبادلے ہو رہے تھے۔ شکر ہے میں نے مغربی لباس پہن رکھا ہے کہ لوگ پاکستانی نہیں سمجھ رہے ہوں گے مگر اسکارف۔ وہ ہنسی معلوم ہوا کہ لوگ فلسطینی دہشت گرد سمجھ رہے ہوں گے۔ بہت ممکن ہے۔

چند یوم قبل میڈرڈ میں دھماکہ ہوا تھا اس لئے ہر شخص ایک دوسرے کو شک کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ لوگوں کے اندر کا آسیب باہر آ گیا تھا۔ سرمایہ داری کا بھیڑیا جمہوریت کا مصنوعی لباس پہن کر کمزوروں کو چیرتا پھاڑتا پھر رہا ہے۔ سیاست کی قربان گاہ پر بھائی چارے اور دوستی کو ذبح کیا جا رہا ہے ابھی کل ہی کی قیامت ہے۔ وہ خود وہاں جانے والی ٹرین میں بیٹھی تھی دو انگریز عورتیں بھی تھیں پھر ایک نوجوان سیاح نما چڑھا۔ ان عورتوں نے اس سے سوال جواب شروع کر دیا۔ معلوم ہوا وہ یہودی ہے اور اسرائیل سے ہے۔ بس انگریز خواتین نے اس کے لتے لے ڈالے۔

تم لوگوں کو شرم نہیں آتی بش کے ظلم کا اتنا چرچا کرتے ہو اور خود ہی کر رہے ہو تمہارا کوئی ضمیر نہیں؟ تمہارے ملک میں کوئی انسانی قدر باقی نہیں؟ وہ واقعی شرمندہ نظر آنے لگا پھر اس نے جھجکتے ہوئے کہا "اصل میں اتنا کچھ نہیں ہو رہا یہ سب ذرائع ابلاغ کی بدمعاشی ہے"

کیا بات کرتے ہو تمہارے ملک میں برین واشنگ ہوتی ہے۔ اب تم بتاؤ وہ جو تھا بوڑھا مفلوج آدمی اس کو تم نے راکٹ سے مارا... کیا یہ صحیح تھا؟ توہین ہے بہادری کی۔ کیا اما اس کا یقین۔

بیوی لڑکا اگلے اسٹیشن پر اتر گیا۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ تم نے خواہ خفا کر دیا۔ وہ منہ بنا کر کہنے لگی۔ میں تو شرمندہ ہوں کوئی یہ سب کہہ رہی ہوں میں کوئی ٹوٹی بلیئر تھوڑی ہوں کہ مجھے وزارت عظمیٰ کی فکر ہو میں تو سچ ہی کہوں گی۔

میں ان عورتوں سے متاثر ہوئی تھی۔ انگریزوں کی کامیابی کا راز۔

”اب دیکھو بلا وجہ دہشت گردی کا ہوا دکھا رہے ہیں ان سے رہنے والوں کی زندگی تلخ کر رہے ہیں برطانیہ میں ٹرین کا کوئی حادثہ کسی دہشت گردی کی وجہ سے نہیں ہوا۔ ہاں ڈرائیور کے نشے میں ہونے کی وجہ سے یا... سگریٹ کی وجہ سے ضرور ہوا ہے؟... ان عورتوں نے اس سے سوال کر ڈالا۔

اس نے غور کیا آج بھی اسٹیشن پر پولیس والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ چند لوگ مریں یا چند ہزار مریں۔ سی آئی اے کے لئے تو بیہودہ ہیں امریکہ کی حکومت کے مفاد کے لئے اتنے لوگوں کو قربان کیا جا سکتا ہے۔ نیویارک کی جڑواں عمارت ہو یا.... ان عورتوں نے کہا اور ٹرین سے اتر گئیں۔

گڑگڑاہٹ کی آواز سن کر وہ سیڑھیوں کے قریب آئی لندن سے ابھی ایک ٹرین آئی تھی اور چند منٹ بعد اسے یہیں سے واپس جانا تھا لوگ ٹرین سے اتر رہے تھے ...وہ سیڑھیوں سے اتر کر پلیٹ فارم پر آ گئی کہ ٹرین میں اپنی پسندیدہ جگہ اور ڈبے میں بیٹھ سکے۔ اسے ڈرائیور کے پیچھے والے ڈبے میں بیٹھنا کچھ حفاظت کا احساس دیتا تھا۔

پھر لوگ ڈبے میں بھرنے لگے۔ وہ پیچھے گھوم کر دلچسپی سے ڈبے کے لوگوں کو دیکھنے لگی۔ ٹرین کا ڈبہ تقریباً بھر گیا تھا آدھے گورے تھے اور آدھے بنگلہ دیشی اور پاکستانی۔ اس کی سیٹ سے چند سیٹوں کے فاصلے پر شاعر اور ادیبوں کی ٹولی بیٹھ گئی تھی۔ ان میں ایک پاکستان کا مشہور شاعر بھی تھا وہ سب سے زیادہ نشے میں تھا۔ باقی لوگوں کو... کچھ کہہ نہیں سکتی۔ شاید شباب ہے یہ کچھ کی چیز ہے بار بار دیکھو... اس نے خود سے کہا ویسے تو سب ہی ایک ساتھ بول رہے تھے مگر ایک نے ذرا زور سے کہا ”میں نے تو مسکین (گالی) سے کہہ دیا ایسے بھوکے ننگے ہو تو مہمانوں کو باہر سے بلاتے کیوں ہو؟ ٹھیک ہے سارے لاجواب ہو گئے تھے“۔

”ہاں کوئی لاجواب نہیں تھے۔ اور میں نے سنا تھا اس نے کہا تھا ’تم خود بھوکے ننگے ہو جو لندن آنے کے لئے ادھار کھائے بیٹھے ہوتے ہو بلانے کے لئے منت خوشامد کرتے ہو اور... ہم وہاں جا کر الٹا تو ذم دبا کر پھرتے پھرتے ہو“

پھر وہ آپس میں گتھ گئے۔ یعنی جسمانی طور پر نہیں۔ بدکلامی کے ذریعے اس دوران تیسرے نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تو وہ اور بھی گئے۔ شاید سمجھانے والوں کو اپنی جورو یاد نہیں رہی تھی۔ یہ شراب کے رسیا ایشیائی... جو نشے میں صرف بیویوں کو مارتے ہیں یعنی ماں اور بہن کو نہیں مارتے۔ اب ان کی آواز مزید اونچی ہو گئی تھی اور اس کے اوپر قہقہے بہت سارے تھے۔ جانے کیا ہو جائے؟ اس نے سامنے کی طرف کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔ اس کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ہندو لڑکی بھی شرمندہ سی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ شام کی سرمئی چادر شہر کی دیواروں کو ڈھانک رہی تھی... پھر کسی آواز سے وہ چونک پڑی۔ مجبوراً اس نے پھر پیچھے دیکھا۔ ایک چھوٹا مضبوط اعصاب کا گنجا انگریز ان پر دھاڑ رہا تھا ”شٹ اپ اب شور کیا تو گلی سے باہر پھینک دوں گا۔ شراب پینے کی تمیز نہیں تو پیتے کیوں ہو؟ ادب کی ٹولی کو سانپ سونگھ گیا۔ جانے نشہ خوف سے ہرن ہو گیا۔ یا کیوں۔ ایک دم خاموشی چھا گئی۔ عین اسی وقت ٹرین میں زور زور اعلان ہونے لگا۔

اگلے اسٹیشن پر جیسے ہی ٹرین رکے سب مسافر اتر جائیں اس ٹرین پر بم کا خطرہ ہے۔ خوف اور دہشت کے باوجود ایک شعر یاد آ گیا۔ شاید خود کا ہے

جبیں شوق پر رنگ ادا کب سے ہے
کہ ذہن بھی جا کر ترا انتظار کب سے ہے

ٹولی ملنگ بم پھٹوانے پر تلے بیٹھے ہیں یہ دوسری بات کہ قرعہ فال بنام من دیوانہ زدن۔ میں انجن سے پیچھے ہوں۔ اس نے جلدی سے جو کلمے یاد آئے پڑھ ڈالے۔ کلمے ختم ہونے سے پہلے ٹرین رک گئی۔ دروازے کھلے۔ لیکن خاموشی اور نظم کے ساتھ سب دروازے سے باہر نکلنے لگے۔ دروازے سے باہر نکلنے سے پہلے اس نے بائیں طرف دیکھا وہ سب ٹولی ڈانٹ کھانے کے بعد ایسی بھیگی بلی بنی تھی کہ سو گئی۔ ایک بیرا اٹھائے اس نے زور سے کہا... بھائیو باہر نکلو خطرہ ہے

کا ہے کا خطرہ ہے؟ انہوں نے شاید اعلان سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

دہشت گردی کا بم پھٹنے کا۔ پھر وہ اسٹیشن پر اتر گئی۔ اس کی اقتدا میں وہ سب بھی اتر گئے دوسرے دروازے سے پولیس والے داخل ہوئے ان کے ہاتھوں میں کتوں کی زنجیریں تھیں۔ پلیٹ فارم پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ مخالف پلیٹ فارم پر لندن سے آنے والی ٹرین بھی خالی کروالی گئی تھی۔ اسٹیشن پر ہجوم تھا خاموشی میں پولیس والوں کے بوٹوں کی آواز کچھ زیادہ ہی سنائی دے رہی تھی باہر جانے والے دروازے سیل کر دیئے گئے تھے۔ لوگوں کے چہروں پر ہراس تھا اور ہر شخص دوسرے کو مشکوک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ خاص کر ایک لڑکا جس کی عمر بیس سال ہوگی۔ خوش شکل چھوٹی چھوٹی داڑھی۔ لمبے سیاہ چغے میں ملبوس سر پر عربوں کا جیسا۔ بنچ پر بیٹھا tnight of the jackal ناول پڑھ رہا تھا۔ کتے لئے ایک پولیس والا دو تین بار کتا لے کر اس کے قریب سے گزرا اس کی آنکھوں میں شک کے سائے واضح تھے۔ وہ ایک لمحے کے توقف کے بعد اس کے پاس گئی۔

بیٹا تمہاری عمر کا میرا بھی بیٹا ہے اس حوالے سے میرا حق ہے تمہیں
تنبیہ کروں۔ برا نہ ماننا۔

جی فرمایئے؟ اس نے کتاب سے نظریں اٹھا کر پوچھا۔

تم مشرقی لندن کے رہنے والے ہو؟

جی نہیں میں آکسفورڈ میں ڈگری کر رہا ہوں۔ یہاں ایک اسلامی اجتماع میں آیا تھا۔ اس لئے یہ لباس پہنا ہے۔

جی..... تمہیں اندازہ ہے کہ لوگ تمہیں مشکوک نظروں سے دیکھ رہے ہیں؟

آپ کا مطلب ہے میرے لباس کی وجہ سے؟ اور یہ کہ میرا نام شاہد زبیر ہے۔ اس نے شستہ لہجے میں کہا۔

جی۔ اور میں ملیحہ شہاب۔

اور وہ اپنے پورے پیچھے سے ہنسنے لگا۔ پھر ایک دم ہنسی روک کر کہنے لگا معاف کیجئے گا۔ میں میرا مطلب ہے آپ صحیح کہہ رہی ہیں۔ مگر اب میں کیا کروں؟ تم میرے ساتھ بیٹھ جانا۔ لوگ سمجھیں گے بیٹے بھانجے ہو۔ وہ پھر ہنستے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ آپ میری بینچ پر بیٹھ جائیں۔ وہ وہیں کھڑا رہا۔ ملیحہ نے اسٹیشن کا جائزہ لیا۔ لوگ پریشان نظر آ رہے تھے اور اس پریشانی کو دور کرنے کے لئے مختلف نسخے آزما رہے تھے۔

ایک گورا لڑکا اور لڑکی..... یوں کھڑے تھے گویا۔

تو من شدی من تو شدم	تو تن شدی من جان شدم
تا کس نگوید بعد ازیں	من دیگرم تو دیگری

ایک اٹیلین جوڑے نے ایک دوسرے کو زوروں میں پکڑے تھا گویا چھوڑا تو زندگی کے میلے میں کھو جانے کا خدشہ ہو۔ ایک کالا لڑکا ایک گوری لڑکی کو گلے لگائے کھڑا تھا۔ ایک بوڑھا ہندوستانی جوڑا فکرمند کھڑا تھا۔ ہاتھوں میں ہاتھ اور ایک درمیانی عمر کا ایک جوڑا جو اس کی قریب والی بینچ پر بیٹھا تھا۔ ہوں۔ ان کے چار بہت چھوٹے چھوٹے بچے تھے اور چاروں رو رہے تھے۔ مرد عورت کو ڈانٹے چلا جا رہا تھا جانے وہ ڈانٹ رہا تھا ماں کو اس لئے بچے رو رہے تھے یا بچے رو رہے تھے اس لئے اسے ڈانٹ رہا تھا۔ عورت گھبرائی گھبرائی چاروں کو تسلی دے رہی تھی۔ بچوں کا رونا دھونا اسٹیشن کے سناٹے میں ارتعاش سا پیدا کر رہا تھا۔

قریب کھڑی ایک عورت نے بہت ہی شستہ انداز میں اپنی دوست سے کہا۔

دل چاہتا ہے کہ اس مرد کو اٹھا کر ریل کی پٹڑیوں پر پھینک دوں۔
شور کر کے بچوں کو رلا رہا ہے۔ بچوں کو ٹہلانے کو دوسری طرف لے جائے۔ اس کی ساتھی نے ہنس کر کہا۔ بخدا تم اسے پھینک بھی سکتی ہو۔ غریب جنگل پانچ فٹ کا ہوگا گھر چھوڑو۔ وہ دونوں ہنستی دوسری طرف نکل گئیں۔ یہ خواتین انگریز تھیں۔
تبھی ایک اعلان ہونے لگا۔ لندن جانے والی ٹرین چند منٹ میں آنے والی ہے۔
"مسافروں سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اپنا کوئی سامان کہیں نہ چھوڑیں ورنہ پولیس سامان ضبط کر لے گی۔"

پھر ٹرین واقعی آ گئی۔ ملیحہ شاہد زبیر کے ساتھ انجن کے قریب والے ڈبے میں چڑھ گئی۔ اگرچہ اس ڈبے میں ان دونوں کو سیٹیں مل گئیں مگر ٹرین پچھلے اسٹیشن سے بھر کر آئی تھی اور کھچا کھچ بھر چکی تھی۔ اس ٹرین میں آمنے سامنے چار چار کرسیوں کی قطاریں تھیں۔ بیچ بیچ میں چلنے کا دو فٹ کا راستہ تھا آمنے سامنے کی سیٹوں میں بھی دو فٹ کا فاصلہ تھا۔ ملیحہ اور شاہد آمنے سامنے بیٹھ گئے تھے۔ ملیحہ کے ساتھ ایک انگریز لڑکی بیٹھی تھی جو شاہد زبیر کو تاڑ رہی تھی مگر وہ معصوم Night of the Jackal پڑھنے میں مصروف تھا اس کی بائیں طرف کھڑکی تھی اور دائیں طرف کی سیٹ پر اس نے اپنا بریف کیس رکھا تھا۔ ملیحہ کی دائیں طرف کھڑکی تھی۔ باہر اندھیرے کا سکوت تھا۔ اس کی بائیں جانب وہ لڑکی تھی اس کی بائیں طرف چلنے کا راستہ تھا پھر دوسری طرف چار سیٹوں پر ایک عورت ایک مرد دو بچے تھے۔ بچے نے انگلی اٹھا کر شاہد کو دکھایا ممی وہ دیوتا آ گیا ہے۔ ماں نے گھوری سے اسے ڈانٹا۔ باپ مسکرا کر باہر دیکھنے لگا۔ لڑکی مزید پیار بھری نظروں سے شاہد زبیر کو دیکھنے لگی۔ پھر ملیحہ کی طرف متوجہ ہوئی۔ آپ کا بیٹا ہے۔

نہیں بھتیجا۔ شاہد زبیر اب بھی پڑھنے میں مصروف تھا اسے کہنا پڑا "شاہد تمہیں کس اسٹیشن پر اترنا ہے؟"

اگر آپ کہیں تو میں آپ کے ساتھ اسٹیشن تک چلوں پھر کسی اسٹیشن سے آکسفورڈ کی ٹرین لے لوں گا نہیں ایسی بات نہیں۔ دیکھو ڈبے میں پیچھے کی طرف غسل خانہ ہے۔ چینج کر جانا بلکہ ابھی تین اسٹیشن باقی ہیں۔ ابھی چلے جاؤ میں اندر پوری طرح حلیہ بدل لوں۔ وہ مسکرایا۔

تو ٹھیک ہے دو منٹ لگیں گے۔

پھر اسٹیشن آ گیا۔ بہت سے لوگ اترے بہت سے چڑھے۔ شاہد کپڑے بدل کر آیا اور دروازہ پر کھڑا ہو گیا۔ اگلا اسٹیشن اس کا تھا۔ تبھی ایک میرے ساتھ والی انگریز لڑکی بھی فوراً اٹھ کر اس کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔ پھر اسٹیشن آ گیا ملیحہ نے ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہا۔ شاہد کے پیچھے لڑکی بھی اتر گئی۔ وہ کیوپڈ کے تیر سے گھائل ہو چکی تھی۔

گئی کام سے لگتا ہے وہ تیر محبت سے گھائل ہو چکی ہے۔ ٹرین کے دروازے بند ہوتے دیکھ کر ملیحہ نے ہنس کر سوچا اور بیگ سے ایک کتاب نکال کر پڑھنے لگی۔ ٹرین مرکزی لندن سے گزر چکی تھی اس لئے تقریباً خالی ہو چکی تھی۔ یوسٹن کا حوالہ بھی جا چکا تھا۔ اور بھی بہت لوگ۔ مگر جانے کب اور کہاں سے ایک شخص اس کی بالکل سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ یعنی جس سیٹ پر شاہد بیٹھا تھا۔ کوئی ریچھ نما حبشی۔ اس کے کپڑوں سے ایک ناگوار سی بو آ رہی تھی۔ جیسے اصطبل وغیرہ سے آئی ہے۔ اس نے جینز کی پتلون اور جیکٹ پہن رکھی تھی۔ دونوں چیزیں بے جان رنگ تھیں۔ میلی..... جانے تھی بھی کہ نہیں جیکٹ کے اندر سینے کے بال نظر آ رہے تھے۔ سر پر بڑے بڑے بالوں کی باریک چٹیاں

تھیں بہت لمبی لمبی۔ بالوں کا رنگ رسّی کی طرح تھا اس کے سر پر کلاڑیوں والی ٹوپی تھی جس سے ماتھا چھپا ہوا تھا۔ پھر رنگین عینک لگا رکھی تھی۔ اپنے پیٹ کے ساتھ ایک غیر ضروری طور پر بڑا بیگ چپٹا رکھا تھا۔ جوتے افوجی قسم کے بوٹ تھے۔ وہ میرے سامنے شاید والی سیٹ پر بیٹھا ہے مگر دونوں یعنی ساتھ والی سیٹ پر پھیلا ہوا ہے۔ میں کتاب کے صفحے پر نظریں گاڑے اس کا جائزہ لے رہی ہوں۔ اور وہ مستقل مجھے گھور رہا ہے۔ اس کا شاید ایک ہاتھ نہیں ہے بازو ایک نہیں ہے۔ بایاں ہاتھ جس سے اس نے غیر معمولی بڑا بیگ پکڑ رکھا ہے یا دبوچ رکھا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ کوئی دہشت گرد ہے اس کی ہر حرکت مشتبہ ہے شاید اس کے بیگ میں ٹائم بم ہے جسے وہ چیک کر رہا ہے۔ میں آنکھوں سے بائیں جانب دیکھتی ہوں چاروں سیٹیں خالی ہیں اس کے پیچھے والی چاروں سیٹیں خالی ہیں۔ میں اس ڈبے میں سب سے اگلی سیٹ پر بیٹھی ہوں میرا منہ انجن کی طرف ہے میرے سامنے والی سیٹ کا منہ ڈبے کی طرف ہے مگر میں اس کے سامنے بیٹھی ہوں اس لئے اسے شاید ہی کوئی دیکھ پا رہا ہو۔ خصوصاً اس لئے بھی کہ اب وہ ذرا اور نیچے کھسک چکا ہے اس کی ٹانگیں میری سیٹ تک پہنچ رہی ہیں۔ میں پر امید نظروں سے ڈرائیور کے دروازے کی طرف دیکھ رہی ہوں کبھی کبھی ٹکٹ چیکر بھی اس دروازے سے ظاہر ہوتا ہے میں خوفزدہ ہوں۔

میں بری طرح نروس ہو رہی ہوں۔ اس کو بھی اندازہ ہو گیا ہے اس کے چہرے پر کچھ ایسی ہنسی اور کرختگی کا تاثر ہے جیسے درندہ شکار سے کھیلنے سے پہلے پیدا ہو جاتی ہے میں بہت کنفیوز ہوں ایک برقی لہر میرے ذہن میں دوڑ جاتی میں اب تک اس مغالطہ میں تھی کہ یہ دہشت گرد ہے بم والا تھیلا یہاں چھپا کر بھاگ لے گا مگر.... اب اس کی جسمانی زبان سے جو اظہار ہو رہا ہے وہ ایک.... جنسی جنون کا انداز ہے میں کتاب میں نظریں گاڑے بہانے سے تاثر دیکھتی ہوں۔ میں اپنے اندر کیوبڑ کی سی بے چارگی محسوس کر رہی ہوں۔ اسے یہاں بیٹھے ہیں منٹ ہو چکے ہیں۔ جانے کتنے اسٹیشن نکل گئے ہیں۔

پھر تین چار بار تیں ایک ساتھ ہوئیں۔

اس کا بیگ متحرک ہو گیا۔ اور بیگ کے نیچے سے اس کا دوسرا ہاتھ نکل آیا۔ ہاتھ سے وہ بیگ کے اندر نہیں بیگ کے نیچے کسی کام میں مصروف ہے۔

میری نگاہ اس کے ہاتھ کے الٹی طرف پڑتی ہے.... اور ایک خطرناک چیز پر۔

میں پاؤں کے چھالوں کی وجہ سے سینڈل اتار کر بیٹھی تھی میں نے جھک کر اپنی سینڈل اٹھائی..... بہت کچھ نظر آیا بیگ کے نیچے۔

ٹرین اسٹیشن پر رکی۔

میں نے دونوں ہاتھوں میں سینڈل اٹھائی پلٹ کر ڈبے میں دیکھا پورا ڈبہ خالی ہو چکا تھا دوسرے سرے پر ایک بوڑھا آخری ٹرے لے رہا تھا۔ دہشت کی انتہا کے ساتھ میں نے پوری قوت جمع کی اور چھلانگ مار کر خود کار بند ہوتے ہوئے آدھے دروازے سے ننگے پیر اسٹیشن پر کود گئی۔ اور پھر ٹرین چلی گئی۔ وہ دیکھ وہاں نہیں اترا تھا۔ اس نے دو تین گھنٹوں کے بل اسٹیشن پر بیٹھے ذہن میں سارا منظر دہرایا۔ وہ ابھی تک کانپ رہی تھی۔

کیا بات خیریت چوٹ تو نہیں لگی؟

لگی ہے مگر چوٹ اہم نہیں۔ یہ جو ٹرین ابھی لندن کی طرف گئی ہے اس میں ایک بڑا خطرناک آدمی ہے میں اسے دہشت گرد سمجھ کر اس کا مطالعہ کر رہی تھی مگر پھر.... پتہ چلا کہ....

پھر کیا؟ پولیس والے نے پوچھا کیسے پتا خطرناک ہے؟

وہ He was exposing himself۔ اسی وقت میں نے اس کے ہاتھ کودنے کا نشان دیکھا مجھے یقین ہے اس نے مصنوعی چھپایاں یعنی وگ لگا رکھی تھی۔ انہوں نے ہم والوں نے ٹی وی پر خاص طور پر ہاتھ کے گودنے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

تمہارا مطلب ہے؟.....

جی ہر بالکل وہی ٹرین اگلے اسٹیشن پر رکوا دیں اور ڈرائیور سے کہیں دروازے نہ کھولے۔ ظاہر کریں کوئی خرابی ہو گئی ہے۔ پولیس والا مسکرایا۔

پولیس والے نے بڑی سعادت مندی سے اس کی تجویز پر عمل کیا۔

ہاں ہاں اسٹیشن سے پہلے ہی گاڑی روک لو۔ مزید اطلاع دی جائے گی ٹرین میں تین عورتوں کا قاتل اور.... بارہ عورتوں کی عصمت دری کرنے والا مجرم بیٹھا ہے۔

پھر اس کا شوہر اسٹیشن پہنچ گیا تو انہیں بیان دینے کے لئے پولیس اسٹیشن جانا پڑا۔ اور ابھی وہ وہیں بیٹھی تھی کہ خبر آئی اس کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔

آخر میں عدالت میں ہرگز نہیں جاؤں گی اس نے قطعیت سے کہا۔

شاید ضرورت بھی نہ پڑے۔ ابھی تو اسے ناشائستہ حرکات کے جرم میں پکڑا گیا ہے مگر ڈی این اے مل گیا تو.... وہ زندگی بھر کے لئے جائے گا۔

وہ دو دن خوف کی وجہ سے گھر سے باہر نہ نکل سکی۔ اسے ڈراؤنے خواب نظر آتے رہے۔ پھر تیلی ویژن کی خبر کی ایک سرخی نے..... سارا سسپنس ختم کر دیا۔

گینڈے کی طرح ڈرپوک لومڑی کی طرح عیار بھیڑیے کی طرح ظالم تیرہ عورتوں کی جبری عصمت دری کرنے والا درندہ... گناہ بے لذت قسم کے جرم کی وجہ سے پکڑا گیا۔ اس کا ڈی این اے اس سے مل گیا تھا۔

اپنے خوف کی گرد جھاڑی اور یہ سوچ کر خوش ہوئی۔ چنانچہ میں نے تاج برطانیہ کے لیے ایک اہم کام کیا ہے پندرہ سال سے مختلف علاقوں میں دہشت پھیلانے والے مجرم کو گرفتار کروا دیا۔ مگر اب "کھودا پہاڑ اور.... نکلا پہاڑ"

جوتا

حمیدہ معین رضوی

جوتا... بیچارہ جوتا... جوتے اور انسانی تہذیب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اور انسان کے مہذب ہونے کا ثبوت ہے مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ جوتے کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ مثلاً آپ کو رتی بھر کسی چیز کی پرواہ نہ ہو تو آپ کہیں گے میری جوتی بھی نہیں پوچھتی۔

حد تو یہ ہے کہ بزرگوں نے بتلایا کہ کوئی نیا جوتا پہنے تو خوش ہو کر کہتے ہیں مبارک ہو تم وزیر ہو۔ یہ نہیں کہتے کہ جوتا مبارک ہو ورنہ خطرہ ہے کہ جوتا مبارک باد کہنے والے کے لئے نیک شگون نہ ہوگا۔ حد ہو گئی نہ کہ جوتا لباس کا ضروری جزو ہونے کے باوجود تحقیر کہلایا۔

جوتے۔ جن میں سینڈل اور جوتیاں بھی شامل ہیں۔ اگر نہ شامل کریں تو (Discrimination law) "یعنی غیر مساوی سلوک کا برطانوی قانون ہمیں عدالت کے کٹہرے تک پہنچا دے گا۔" قارئین یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ اور یہ بتانا مقصود تھا کہ ہم کالے انگریز قانون کا بہت احترام کرتے ہیں کیونکہ ہم شریف لوگ ہیں۔ کچھ لوگ اور کچھ ڈرپوک بھی ہیں۔ خرافات کا سرا ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے تو میں کہہ رہی تھی کہ جوتے انسانی شخصیت کو چار چاند لگانے میں بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اگرچہ Addidas اور نائیکے نے روایتی سوٹ بوٹ کا کباڑا کر دیا تاہم۔ اگر کوئی امیر کبیر وزیر قیمتی سوٹ اور ٹائی کے ساتھ ہینچ چپل پہن کر آئے اور تقریر کے لئے کھڑا ہو... تو... سوچیے سامعین کا کیا حال ہوگا۔

اسی طرح اگر ایک خوبصورت لڑکی خوبصورت شلوار قمیض کے ساتھ گھڑ سواری کرنے والے بوٹ پہن کر آئے تو دیکھنے والوں کے دل پر کیا گزرے گی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ لندن یونیورسٹی میں جب میں پوسٹ گریجویٹ کر رہی تھی تو ایک خاتون مرے ساتھ پڑھ رہی تھیں یہ 74-75 کی بات ہے۔ مجھ سے کئی سال بڑی تھیں۔ تنہا اور غیر شادی شدہ تھیں۔ ساڑھی کے ساتھ بڑے بڑے گھٹنوں تک سے بوٹ پہنتی تھیں۔ ان کے پیر کچھ بڑے بھی تھے تھیں بھی کچھ ہوائی تھیں اور پھر انگریزی بھی بنگالی میں بولتی تھیں۔ ستاون سال کی گھنگی رفتار سے سب ان سے بھاگتے مگر معاف کیجیے وجہ ان کی خوفناک انگریزی نہیں جوتے تھے۔ لڑکیاں ہنسی نہ روک پاتیں۔

تاریخی لحاظ سے یہ بتاتا چلیں گی کہ آدم علیہ السلام جب جنت سے نکلے تو کپڑے تو اتروا لئے گئے تھے مگر اس پر دنیا کی کسی مذہبی کتاب نے روشنی نہیں ڈالی کہ کیا جوتے بھی دھروا لئے گئے تھے۔ میری ناچیز عقل تو یہی کہتی ہے کہ جوتے پہنے رکھنے کی رعایت نہیں ملی ہو گی کیونکہ پیر کے نشان میں کوئی جوتا حائل نہیں۔ نہ ہی کسی کمپنی کا سراغ لگایا جا سکا ہے۔ میرا وجدان کہتا ہے عقل پر بھروسہ نہیں کر سکتی کیا جا کب کو دنا پڑے اور وہ تماشا بے لباس ہے تو میرا وجدان کہتا ہے کہ حضرت ابراہیم نے اپنے بیٹے کو بیوی کے لالچی ہونے پر طلاق کا مشورہ خود سے کے ذریعہ بھجوایا تو کہا۔

"میرا بیٹا آئے تو اس سے کہنا کہ گھر کی چوکھٹ بدل دے"

اگر جوتی ایجاد ہو چکی ہوتی تو وہ کہتے "اپنے پیر کی جوتی بدل دو"

اس سے اس چیز کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ اس وقت تک عورت کا اعلیٰ مقام تھا کیونکہ چوکھٹ کا درجہ بہر صورت جوتی سے اعلیٰ ہے۔

رام چندر جی کے زمانے میں چمڑے کے جوتوں کے بجائے لکڑی کی کھڑاؤں کی تصویر دیکھی ہے جو بارہ سال تک رام چندر جی کی کھڑاویں راج پاٹ پر چڑھ کر بیٹھی رہیں۔ اور مزے کرتی رہیں۔ بچپن کی طرح کھڑاویں بھی اپنی تاریخ میں اس واقعہ کا ذکر فخر سے کر سکتی ہیں کہ لکڑی کی تھیں تو کیا ہوا تو سخت کے پیر نے اور وہ گدی نشین ہو گئیں۔

باقی آسمانی کتابوں کا تو ہمیں کچھ علم نہیں پر مسلمانوں کی آسمانی کتاب میں حضرت موسیٰ کے حوالے سے جوتوں کا ذکر آیا ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ فرعون نے حضرت موسیٰ کو جوتے ضرور پہنائے ہوں گے۔ تب ہی تو وہ مزے سے طور میں تجلیٰ آگ لینے جا رہے تھے تو حکم ہوا۔

"اے موسیٰ میں تیرا رب ہوں اپنے جوتے فوراً اتار دو کہ تم ایک پاک وادی میں ہو"

جوتوں کے حوالے سے ایک اور اہم واقعہ یاد آیا۔ مشہور ہے کہ القرآن محمد رسول اللہ ﷺ شب معراج میں سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچے تو بھی آپ کو ربِ جلیل نے جوتے اتارنے کا حکم نہ دیا۔ یہاں اس واقعے سے ایک بہت مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ بریلوی علما نے اس سے یہ ثابت کرنا شروع کیا کہ آپ بشر نہ تھے کیا آپ کی ذات پر بشریت کو فخر نہیں ہونا چاہیے۔ آپ چہرے سے نگران... یہ سن کر وہابی علماء نے دلائل کی بمباری شروع کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جوتے کی بحث میں جوتے چل گئے۔

یہ بھی یاد رہے کہ جوتے کے وجود سے بہت سے محاورے اردو زبان میں وجود میں آئے ہیں۔ محاورے سے ایک واقعہ یاد آ گیا۔

خوش قسمتی سے ہمیں پانچ سال کی عمر میں اچھا خاصا پڑھنا آ گیا تھا مگر ایسی اچھی کتابیں جیسی یہاں بچوں کے لئے ملتی ہیں ہمارے ملک میں کہاں؟ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم اردو کی کتاب پڑھنا اپنا فرض کہیے شوق میں آ کر انقلاب فرانس پر ایک کتاب پڑھ ڈالی صرف اس لئے کہ اس میں تصویریں تھیں مگر مدتوں

ہوتا کہ خواب نظر آتے رہے اور ہم ڈرتے رہے۔ تھک ہار کر ہم نے اخبار کا مطالعہ شروع کر دیا اپنی تمام تر بے خبری کے باوجود جس کی آدھی بات ہی سمجھ میں آتی۔ ایک دن ہم نے سرخی دیکھی۔ انتخابات سے قبل ہی پارٹی کا اتحاد ٹوٹتا نظر آ رہا ہے خطرہ ہے کہ جلد جوتیوں میں دال بٹنی شروع ہو جائے گی۔

ہم نے پہلے تو پوری دلچسپی اور دلجمعی سے دیوانہ وار قہقہے مارے پھر جلدی سے تفصیل جاننے کے لئے خبر کی تفصیل پڑھی کہ کون لوگ جوتیوں میں دال کھاتے ہیں۔ تاہم خبر کچھ یوں تھی۔

"میاں افتخار الدین اور محمود علی قصوری کی نیشنل پارٹی اور حسین شہید سہروردی کی عوامی لیگ کے اتحاد سے جو نیشنل عوامی پارٹی وجود میں آئی تھی اور سالانہ جلسے میں جس نے قوی اتحاد کا مظاہرہ کیا تھا اور حزب اختلاف کی حیثیت میں جس طرح حکومت کے ایوانوں میں زلزلہ برپا کر دیا تھا اس کے اپنے ایوانوں میں اختلافات کے شگاف پڑنے لگے ہیں۔ کیونکہ مرکزی کمیٹی کے اجلاس میں الیکشن کے بعد عہدوں کی تقسیم پر ابھی سے اختلاف رونما ہونے لگے ہیں۔ الیکشن کے بعد جوتیوں میں دال بٹنے کے قوی امکانات ہیں۔ بات کچھ کچھ سمجھ میں آئی کچھ نہیں۔

تخت کی سفید چادر پر لیٹے لیٹے ہم نے کہنیاں ٹکائیں چہرے کو ہاتھوں میں لے کر خیالات کے گھوڑے سرپٹ دوڑا دیے۔ دفتوں کے بڑے سے چولہے پر ایک بہت بڑی دیگ چڑھی ہے جس میں مختلف منشوروں کی دال پک رہی ہے اس عرصہ میں کہیں منشور بھی دال ہی جیسی کوئی شے لگتی تھی۔ سوچیے ذرا منشور کی دیگ سے لے کر حد نظر تک سیاسی قائدین اور دونوں ساتھ پارٹیوں کے سرکردہ ممبر، جوتیاں پیروں کی جگہ ہاتھوں میں لئے دال تیار ہونے کے منتظر کھڑے ہیں... صدر مملکت ڈھکنا کھولتے ہیں وزیر مملکت چمچہ ڈال کر دال نکالتے ہیں مگر انداز سے معلوم ہوتا کہ ساری دال خود رکھ لینے کا ارادہ ہے صرف چند جوتیوں تک ہی دال پہنچتی ہے کہ لوگ قطار میں کھڑے بےقرار ہونے لگتے ہیں۔ پھر چھینا جھپٹی شروع ہوتی ہے۔ گھبرا کر حسین شہید سہروردی اور میاں افتخار الدین دیگ میں اوندھے منہ گر پڑتے ہیں صدر مملکت ان کو کھوجنے لگتے ہیں وزیر اعظم..... پھر دوسرے دن سرخی ہو گی۔ جوتیوں میں دال لینے کی خاطر میاں افتخار الدین اور سہروردی کی دال پک گئی۔

اور پھر ہم نے دیوانہ وار ہنسنا شروع کیا یہاں تک کہ دادی کی ڈانٹ نے سلسلہ توڑا۔

یہ کیا بدتمیزی سے ہنسا جا رہا ہے دیکھتی نہیں میں نماز پڑھ رہی ہوں۔

ہم معذرت کر کے بھاگے شکر ہے ہماری دادی عصمت چغتائی یعنی ٹیڑھی لکیر والی دادی نہیں تھی ورنہ چادر پر حساب بے باق کرتیں... یعنی

کھوپڑی پر جوتے برسے... اب یہ بھی ایک محاورہ ہے۔

محاورہ سے ہمیں آٹھویں کا بورڈ کا امتحان یاد آ گیا۔ "میاں کا جوتا میاں کا سر"۔ ہفتے بعد کلاس میں اس پرچے پر تبصرے ہونے لگے۔ ایک لڑکی نے بہت اعتماد سے کہا۔ "میں بتاتی ہوں اس کا مطلب کیا ہے کہ اگر بیوی کھانا جلا چکی ہے تو عموماً میاں بیوی کے سر پر جوتے مارتا ہے لیکن جو میاں اچھا ہوتا ہے وہ یہ کرتا ہے کہ اپنا جوتا اتار کر اپنے ہی سر پر مار لیتا ہے یہ ہے میاں کا جوتا میاں کا سر محاورہ ہو گیا۔

ایک اور لڑکی نے اس کی بات سن کر منہ بنائے۔

"اے ہے! میاں نہ ہوا مرکھنا بیل ہو گیا یا دولتی مارنے والا گدھا کہ اس کو مارے بغیر سر میں کھجلی ہو رہی ہے میرا میاں مجھے مار کر تو دیکھے میں ایک کے چار لگاؤں گی۔" وہ بھی میری طرح ان دنوں نازک اندام کہلاتی تھی۔ ایک تندرست لڑکی نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھ کر کہا "اس مریل سے تو نے اپنے لئے کیا چوہا پسند کر رکھا ہے؟ جس سے شادی کرے گی چوہے کو ہی تو مار سکتی ہے۔"

وہ لڑکی تھوڑی پریشان نظر آئی۔ "واقعی اس پہلو پر تو میرا دھیان نہیں گیا تھا" اس نے فکر مندی سے کہا۔

میں حسب معمول اس کی مدد کو دوڑی۔ ابن مفتی کی عمران سیریز میں جوڈو کراٹے کا بہت ذکر رہتا تھا۔ جلدی سے مشورہ دینا انتہائی ضروری سمجھا۔

"ذہین۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ تمہارے ابا لکھ پتی ہیں ان سے کہو فوری طور پر ایک کراٹے استاد کا انتظام کریں۔"

"ہونہہ" اس کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا۔ لڑکیاں محاورے کے بارے میں بھول کر اپنے دفاع کے بارے میں سوچ بچار کرنے لگیں۔ جیسے شادی کا مطلب خانہ آبادی نہیں جوتے بازی ہے۔

جوتا بیچارہ انسان کی زندگی میں اہمیت حاصل کرنے کے لیے گھسا ہی چلا آتا ہے جب ایک اور قصہ سنیے۔

یہ گورنمنٹ کالج سیالکوٹ کا واقعہ ہے۔ اسلامیات کا گھنٹہ تھا۔ سورہ مائدہ کا دوسرا رکوع ہے۔ اس آیت میں وضو کا حکم ہے۔

"اے ایمان والو جب تم نماز قائم کرنے کے لیے اٹھو تو دھو لیا کرو اپنا چہرہ اور کہنیوں تک اور مسح کرو اپنے سر کا اور اپنے پیر کا۔"

ایک لڑکی نے ہاتھ کھڑا کیا "مس پیر کا..... سے کیا مراد ہے؟"

مس کے جواب سے قبل ایک اور لڑکی کھڑی ہو گئی۔

"مس مجھے معلوم ہے۔ جب جوتے پہنے ہوں تو پیر دھونے کے بجائے مسح کرتے ہیں۔"

"جوتوں پر نہیں موزوں پر مسح ہوتا ہے" مس نے حقارت سے کہا۔

"جس میں شیعہ لوگ جوتوں پر مسح کرتے ہیں" وہ ختم ہو گئی۔

مس کا پارہ چڑھ گیا۔ "تمہیں کیسے معلوم؟ کیا تم شیعہ ہو؟ بغیر ثبوت کے... نہیں مس میں شیعہ ہرگز نہیں سنی ہوں۔ اور.... اس نے ڈرامائی رنگ پیدا کیا۔ میں سنی ہوں جس کا مطلب ہے سنی سنائی باتوں پر یقین کرنا۔ پھر ہنسی کا طوفان اٹھا تو.... بس اللہ دے اور بندہ لے۔ شکر ہے جلد گھنٹی بج گئی اور ہم لوگوں کو پیٹ کے درد اور مس کو دل کے درد سے نجات ملی۔ جوتا بیچارہ اس کی زندگی میں عزت اور توقیر کی جگہ گراوٹ اور تحقیر لکھی ہے۔ عزت کا مقام اس پر حرام۔ خوبصورت قالین پر اس کا داخل ممنوع۔ مسجد مندر میں اس کی صورت سے چڑھ.... ہاں ایسے موقعوں پر چند جوتوں کی تقدیر یں ضرور جاگ گئیں۔

مثلاً مسجد کمیٹی کے نو دولتیوں میں دنگا ہو گیا اور جوتے چلنے لگے تو... تو ان جوتوں کو چلنے سے روکنے کے لیے پولیس والوں کے جوتوں کو مسجد میں پا بیاپی ہو گئی۔ تاریخ کے بہت سے شرمناک واقعوں میں اسے بھی ڈال کر شرمندگی کی گرد جھاڑ دی گئی۔ اللہ اللہ خیر صلا۔

جوتوں سے متعلق ہر انسان کی زندگی میں کہانیاں ہوں گی ہمیں ریسرچ کا موقعہ نہ مل سکا البتہ... ہم اپنے دکھ ضرور آپ کے سامنے کھولیں گے۔ شاید آٹھ کی عمر پانچ برس کی ہوگی۔ نزہت کا غرارہ اور خوبصورت جوتوں میں ہم خود کو بڑا حسین محسوس کر رہے تھے والد صاحب کی انگلی چھوٹا بھائی پکڑے تھا۔ عیدگاہ میں نماز پڑھی ہی ہوگی یاد نہیں... یاد صرف ایک تلخ سی بات ہے کوئی ہمارے جوتے اٹھا لے گیا۔ چند واپسی پر ہم روتے دھوتے والد صاحب کے کندھوں پر چڑھ کر آئے۔ یہ سوچ کر بھی دعا بخشی نہیں ہوا کہ چھوٹا بھائی پیدل گھسٹ رہا ہے اور ہم گود میں دوسرے کسی موقعے پر اسے چڑھانے سے باز نہ آئے مگر اس دن اس کا بھی دھیان نہ آیا۔

ایک یہ بھی راز کی بات بتاتی چلوں دوسرے لوگ ہمیں تھوڑا سا ذہین سمجھتے ہیں مگر ہماری والدہ ہمیں گھاس نہیں ڈالتیں۔ چند سال قبل وہ یہاں آئی ہوئی تھیں۔ ہم نے ایک دن بڑی رازداری سے سرگوشی میں ان سے کہا۔

"امی مجھے بڑی فکر رہتی ہے میرا حافظہ تیزی سے خراب ہو رہا ہے"

وہ ہنسیں... ارے تمہارا حافظہ صحیح کس دن تھا؟ مانگو سرمہ دانی تو اٹھا لائی تھیں نمک دانی۔ ایک دفعہ پھر امی نے بچپن کا ایک واقعہ گوش گزار کیا۔ جس سے دو ثبوت ملتے ہیں۔ ایک یہ ہمارا دماغ بچپن میں بھی غیر حاضر رہتا تھا اب نہیں حاضر رہتا تو کوئی بات نہیں دوسرے یہ کہ اس کا تعلق بھی جوتے سے ہے

To be in some one's shoes

یہ محاورہ تو قارئین نے سنا ہی ہوگا... اور.... بہر حال ہمیں بھی اپنے والد صاحب کی چپلیں پہن کر پھٹ پھٹ شور کرنا اچھا لگتا تھا۔ ایک ہم پر ایسا ہی دورہ پڑا ہوا تھا کہ امی نے آواز دی۔ پھر حکم ہوا کہ "پڑوس کی خالہ کو کوئی پیغام دینا ہے جلدی سے آؤ"

ہماری کمزوری یہ بھی تھی کہ ہمیں تابعداری کا خبط تھا۔ بھاگے دروازے کی طرف امی کا پیغام لے کر۔ گویا دیر ہو گئی تو ترک کے لفظ نہیں ملیں گے۔ خالہ کا گھر قریب ہی تھا۔ خالہ آنگن میں ہی مل گئیں۔ ہم نے انہیں پیغام دیا۔

عجیب بات تھی وہ.... ہمارے چہرے کی طرف دیکھنے کے بجائے پیروں کی طرف بار بار دیکھ رہی تھیں اور مسکرا رہی تھیں... پھر وہ کمرے میں کچھ لینے گئیں تو ہماری نظر پیروں پر پڑی... اب ان کی مسکراہٹ کا راز کھلا۔ ہم نے ایک پیر میں اپنی ایک میں ابا کی چپل پہن رکھی تھی۔

ہم نے خالہ کا انتظار مناسب نہیں سمجھا اور سعادتمندی کی جلد بازی کو برا بھلا کہتے ہوئے دونوں چپل بغل میں دبائے اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔

چشم دید گواہ نے جوتے سے متعلق ایک واقعہ کہا۔

یہ 1975 وغیرہ کا واقعہ ہے جب لندن میں شادیاں گھروں میں ہوتی تھیں لوگ پڑوسیوں سے بھی ایک دو کمرے مانگ لیا کرتے تھے ایک شادی میں جانے کے لئے ہم نے سفید کامدار ساڑھی کے ساتھ ویسی ہی سلور رنگ کی ملتے جلتے سینڈل خریدی۔ دکان دار نے بتایا کہ یہ سنڈریلا سینڈل ہے۔ اتنی خوبصورت سینڈل ہم نے کبھی زندگی میں نہیں دیکھے تھے۔ قیمت.... بس دل پر ہاتھ رکھ کر خرید ہی لی۔ گھر میں لا کر بار بار دیکھی پہنی پھر دیکھی پھر پہنی۔ عمر ہی ایسی تھی۔ بے قراری سے شادی کے دن کا انتظار رہا۔ کہاں دولہا کو اپنی دلہن کا انتظار ہوگا جو ہمیں تھا کہ وہ سینڈل پہنیں گے مگر .....

ہوا یوں کہ چودہ فٹ مربع کے کمرے میں خواتین کو بٹھلایا گیا۔ جوتیاں بہت دور کہیں اتارنی پڑیں... نتیجہ یہ ہوا کہ واپسی پر ہماری ایک سینڈل دھکے کھاتی کہیں دور دروازے کے علاقے میں پہنچ گئی... خاتون خانہ بولیں "اے ہے اب اس وقت تو ملنا مشکل ہے میں ڈھونڈ کر رکھ لوں گی۔ لے جایئے گا۔

خیر ہماری دل سے ایک سینڈل ہاتھ میں لئے لنگڑاتے ہم کار میں بیٹھ گئے خیریت تھی کہ ڈرائیونگ والے بھدے جوتے موجود تھے ہم نے ان جوتوں کے وجود کو اسی طرح غنیمت جانا جیسے بوڑھی کنواری عورت کو کالا گورا شوہر مل جائے۔ یہ بھی اللہ کا شکر کرتی ہے اور اس کے وجود کو غنیمت جانتی ہے۔

اس سینڈل کا غم ہمیں مسلسل ستاتا رہا۔ تنگ آ کر ہم نے خاتون خانہ کو یہ پوچھنے کے لئے فون کیا کہ.... ویرانے پر کیا گزری؟

فون کیا... اُدھر سے آواز آئی۔ ہیلو.... آواز مردانہ تھی۔

کیا وہ آپ کی بیگم ہیں؟....

وہ تو نہیں ہیں تلاش جاری ہے ہمت مرداں .....

معاف کیجئے گا پوچھنا یہ تھا کہ ہماری ایک سینڈل آپ کے دولت خانے پر رہ گئی تھی۔ وہ لینے آنا چاہتی ہوں... ہم نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

اوہو... تو آپ سنڈریلا ہیں۔ مجھے بہت شوق ہے کہ دیکھوں اتنی خوبصورت سینڈل والی.... خود۔

میں نے فون رکھ دیا۔ لاحول ولا قوۃ ضرور غلط نمبر ہو گا۔

دو تین بار پھر کوشش کی۔ وہی بے ہودہ آواز میں۔ بیہودہ بات۔

پتا ہے میں سنڈریلا کو خود سینڈل پہنانے آؤں گا۔

اس شام ہم نے فون رکھ کر سنڈریلا کی روح پر تو کا کریا کرم کرلیا کیونکہ اس کی چاہ میں.... عزت سادات کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔

اور آپ جانیں عزت سب کو عزیز ہوتی ہے مگر سادات اور عزت کربلا اور نیم چڑھا والی بات ہو جاتی ہے۔ تب ہی تو میر کو غم تھا کہ عزت سادات بھی گئی۔

جوتے کے موضوع پر یہ بھی بتاتی چلوں کہ جب ہمیں مذہب سے بڑا لگاؤ تھا۔ پڑھا کہ امام شافعی کہتے ہیں عورت کی ایڑیوں کا بھی پردہ۔ سو ہم نے موزوں کو برقعے کا حصہ بنالیا۔ نتیجہ لڑکیاں ہم پر خوب پھبتیاں کستیں۔ لوگوں کا خیال تھا کہ ہمارے پاؤں میں کچھ عیب ہے۔ ایک دن ہمارے کالج میں تو حد ہی ہو گئی۔ لان سے گزر رہی تھی کہ ایک نوجوان نے دوسرے سے کہا۔

"کڑی دی پیری ٹکری اے"۔

"او کیوں۔ تینوں کس طرح پتا"۔

"دیکھ تے سہی پیراں ول... جون دی گرمی وچ جراباں پاندی اے"۔

"تے مطلب اے چڑیل اے پیر پچھل تے ہوا..."

لیجئے صاحب یہ تھا ہمارا پردہ کا۔ لندن پہنچے تو یہ صرف برقع غائب ہو گیا بلکہ اسکارف اور شلوار قمیض سے بھی چھٹی۔ سو پتلون اور کوٹ نے اس کی جگہ لے لی۔ مگر ہمارا کمال دیکھئے ہم نے ایڑیوں کا پردہ قائم رکھا۔ ہم نے سوچا کچھ تو ثواب ملے گا۔ اب یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ثواب کا خیال ایک قسم کی منافقت ہی تھی ورنہ سردی اصل مجبوری تھی۔ کیا کرتی۔

دو برس قبل عید الوداع کو نماز کے لئے گئے۔ ایک صاحب اپنے سات نمبر کے جوتے چھوڑ کر ہمارے چار نمبر کے جوتوں میں کیسے فٹ ہو گئے۔ تاہم اس دن ہمیں ننگے پاؤں ڈرائیونگ کی ورنہ سات نمبر کے جوتوں میں ضرور کوئی حادثہ ہو جاتا۔ تو قارئین یہ تھی ہماری دربدری جوتا کہانی ہماری زبانی۔

حمد

رفعت سروش

ہے ہر اک نظر تری مشاطگی کا آئینہ
عالمِ امکاں تری جلوہ گری کا آئینہ

چاند ٹیکہ ہے خلا کا اور مالا کہکشاں
ہے زمیں جیسے کسی انگشتری کا آئینہ

آسماں در آسماں اک عالمِ سیارگاں
ہر نیا سورج تری صنعت گری کا آئینہ

زلزلے طوفاں ترے غیض و غضب کی اک رمق
لعل پتھر میں تری کاریگری کا آئینہ

ریگِ صحرا کو بنا کر منبعِ آبِ حیات
کر دیا ہے چور تو نے تشنگی کا آئینہ

گر بصیرت ہو یہاں ہر رازِ پنہاں وجود
حرفِ قرآں ہے تری دیدہ وری کا آئینہ

قادرِ مطلق ہے تو میں ذرۂ خاکی سروش
اور روشن کر دے میری شاعری کا آئینہ

حمد

غالب عرفان

آئینِ ارتقا کا ہمیں کلیہ ملے
ہر سجدۂ خلوص اگر اُس سے جا ملے

بخشے ہیں اُس نے ہم کو جو قرآن کے حروف
مفہوم جان لیں تو پیامِ بقا ملے

دل کا خلوص لب سے اُبھرنے کی دیر ہے
بابِ اثر سے جا کے سلوکِ دعا ملے

تقدیر کا ہو جبر کہ تدبیر کامیاب
جب تک خدا نہ چاہے کسی کو بھی کیا ملے

دنیا وہ چاہے مجھ کو حیاتِ ابد اگر
میری عبادتوں کا سفر اُس سے جا ملے

بس شرط ہے کہ مانگنے والے کی طرح مانگ
سجدے میں سر ہو اور در اُس کا کھلا ملے

ہر اک شکست و ریخت میں ہے اُس کی مصلحت
وہ چاہے تو ہر عہد میں انساں نیا ملے

میں بھی تو چاہتا ہوں وہی روشنی اگر
عرفانؔ زندگی کا اشارہ ذرا ملے

نعتِ خیرُ الوریٰ

عبدالعزیز خالد

دِل نواز دِل

دل اس کے کام کی خوشبو سے مست ہے کہ جسے
یمن کی سمت سے رحمان کی مہک آئے

بیاں ہو اس کی کریمی کا کیا کبھی جس کے
لب آشنا نہ ہوئے حرفِ بے مروّت سے

ملے علوم و معارف کے جو خزانے انہیں
بلا دریغ سرِ عام خاص و عام میں بانٹے

جو اس کے قلعے میں داخل ہوا، ہوا محفوظ
وہ اپنے بردوں کو آزادِ حزن و خوف کرے

وہ جس نے آدمِ فانی پہ راز یہ کھولا:
"بدن کے مرنے سے روح و عمل نہیں مرتے

کرے اگرچہ ہزار اعتذار و استعفاف
شقی کو بہرہ نہ بخشائشِ خدا سے ملے

ہر ایک اُمّتی آلِ رسولِ اُمّی ہے
مقامِ حسنِ عمل ہے حسب نسب سے پرے!"

چکیدہ کِنج دین کا رحیقِ مشکِ ختام
فروغِ رخ سے قمر اکتساب نور کرے

کبھی کھلے ہیں بجز زائرِ شبِ اسراء
کسی پہ حسینِ حیات آسماں کے دروازے؟

تہِ زمیں ہے پُراسرار طور سے زندہ
صدا درودوں کی سمعِ قبول تک پہنچے

ثنائے خواجۂ کونین ہے وظیفہ مرا
اگرچہ آئے نہ آدابِ عرضِ شوق مجھے

لباسِ حرف ہے کوتاہ قدِ معنی پر
فراخنائے سخن تنگ ہے بیاں کے لیے

سلیقۂ سخن اس صنف کا ہے سب سے جدا
نہ حقِ نعت کا ہی ادا ہو خالدؔ سے!

نعتِ رسولِ مقبولؐ

ناصر زیدی

کتنا اعزاز دیا عشقِ نبیؐ نے مجھ کو
آپ بلوایا ہے آقاؐ نے مدینے مجھ کو

مَیں جو لوٹا درِ اقدس سے بصد ناز و ادا
بڑھ کے سینے سے لگایا ہے سبھی نے مجھ کو

مَیں نے آقاؐ کو ہر اک درد کا درماں جانا
مرتبہ بخشا اسی دیدہ وری نے مجھ کو

بادباں تھاما ہے میرا جو مرے مولاؐ نے
کیا ڈبوئیں گے یہ امواج سفینے مجھ کو؟

اس سے بڑھ کر کوئی اکرام بھلا کیا ہوگا
مطمئن رکھا سدا میرے نبیؐ نے مجھ کو

دل میں حسنینؓ کی اُلفت کو لیے جا پہنچا
*"درِ فردوس پہ روکا نہ کسی نے مجھ کو"

نعت گوئی کو کیا جب سے وظیفہ ناصر
علم و عرفاں کے ملے کتنے خزینے مجھ کو

*امیر مینائی

اسلم راہی

جوش کو راہ نہ دی ہوش کو قائم رکھا
سامنے ایک ہی منہاج عزائم رکھا

ہم نے ہر عہد میں روکا ہے اسے جس نے قدم
جانبِ وادیِ تقلیدِ جرائم رکھا

میرے اللہ کا احسان ہے اس قحط میں بھی
اُس نے فاقہ نہیں رکھا مجھے صائم رکھا

دوستی کا یہ سبق میں نے لیا پھولوں سے
ہاتھ کانٹوں پہ بھی رکھا تو ملائم رکھا

بھولنے کی مجھے عادت نہیں اسلم راہیؔ
یاد رکھا ہے جسے میں نے اُسے دائم رکھا

نعت

علی آذر

میں سوچتا ہوں کہ میرا مقام کیا ہوتا
نہ ہوتا میں جو نبیؐ کا غلام کیا ہوتا . . .!

جہالتوں کے اندھیرے میں مست و بےخود تھا
نہ ملتا مجھ کو جو اُسکاؐ پیام کیا ہوتا . . . .!

یہ صدقہ ہے ترا کہ لوگ دیتے ہیں عزت
وگرنہ میرا یہاں احترام کیا ہوتا . . . . . !

میں بکتا کوڑیوں کے مول دی ترےؐ نسبت
شرف نہ ہوتا کوئی، کوئی نام کیا ہوتا

اگر سکھایا نہ ہوتا سلیقہ جینے کا . . . .!
کوئی بھی نظم، کوئی انتظام کیا ہوتا . . . .!

الجھتا رہتا بگولوں کی طرح دُنیا میں . . .!
بغیر راہنماؐ شاد کام کیا ہوتا . . . .!

میں پلکوں سے نہ کبھی چھوتا روضے کی جالی
میری نگاہوں میں بیت الحرام کیا ہوتا

خیال آتا ہے میدانِ حشر کا آذرؔ
نہ ہوتا دامنِ خیرالانامؐ کیا ہوتا . . . .!

شوکت واسطی

بنتِ حوا کی طرح دل میں اگر تُو آئے
ابنِ آدم کی تجھے مجھ میں سے خوشبو آئے

میں ہوں انسان ہر انسان کا دکھ میرا ہے
اس مرض میں تو افاقہ نہ سرِ مُو آئے

کی یہ آدم نے دعا خوش نہ جو حوریں آئیں
ہم خمیر اپنا خدایا کوئی خوش خُو آئے

پیاس کانٹوں کی بجھے دشت میں گر آبلہ پا
تُو سرِ چاہ نہ جائے نہ لبِ جُو آئے

سانس کے پڑ گئے لالے کہ ہے ماحول میں حبس
سب یہ چاہیں چلے صرصر ہی کہ اب لُو آئے

باہم اک دوسرے کو ڈھونڈنے قریہ قریہ
ہم چناں ہم جو گئے ہمدمو، ہم چُو آئے

حکمراں کوئی ہوا، فرق نہ رنگت سے پڑا
چت موئے دفع ہوئے اب تو یہ رُو آئے

بلبلو صاف اشارہ ہے چمن سے اُڑ لو
اس جگہ ہونے کو آباد اب اُلو آئے

شوکت اوسان خطا یوں جو ہوئے ہیں، کیا پھر
نرغہ کرتے ہوئے احباب ہر سُو آئے

جگن ناتھ آزاد

یوں اک سبقِ مہر و وفا چھوڑ گئے ہم
ہر راہ میں نقشِ کفِ پا چھوڑ گئے ہم

دُنیا! ترے قرطاس پہ کیا چھوڑ گئے ہم
اک حسنِ بیاں، حسنِ ادا چھوڑ گئے ہم

ماحول کی ظلمات میں جس راہ سے گزرے
قندیلِ محبت کی ضیاء چھوڑ گئے ہم

بیگانہ رہے دردِ محبت کی دوا سے
یہ درد ہی کچھ اور سوا چھوڑ گئے ہم

تھی سامنے آلائشِ دُنیا کی بھی اک راہ
وہ خوبیٔ قسمت سے ذرا چھوڑ گئے ہم

اک حسنِ دکن تھا کہ نگاہوں سے نہ چھوٹا
ہر حسن کو ورنہ بخدا چھوڑ گئے ہم

بیکل اُتساہی

ترے در تک پہونچنے کا وسیلہ کاٹ جاتی ہے
یہ دنیا جانے کب سے میرا رستہ کاٹ جاتی ہے

پہونچ جاتی ہیں دشمن تک ہماری خفیہ باتیں بھی
بتاؤ کون سی قینچی لفافہ کاٹ جاتی ہے

تری وادی سے ہر اک سال برفیلی ہوا آ کر
ہمارے ساتھ گرمی کا مہینہ کاٹ جاتی ہے

عجب ہے آج کل کی دوستی بھی دوستی ایسی
جہاں کچھ فائدہ دیکھا تو پتہ کاٹ جاتی ہے

بڑی بیپا کیوں سے وہ ملا کرتی ہے ہر اک سے
مرا جب سامنا ہوتا ہے رستہ وہ کاٹ جاتی ہے

کبھی کٹیا کو بیکلؔ جب محل کا روپ دیتا ہوں
حکومت کی نظر میرا انگوٹھا کاٹ جاتی ہے

عبدالعزیز خالدؔ

اگر دُردِ تہِ کاسہ دو یک جرعہ بھی ہے باقی
اَدِر کاساً وَّ ناوِلہا الا یا ایُّہا السّاقی!
بکھر جاؤں زرِ گل کی طرح آغوش میں ترے
کہا کس گلبدن نے جانے کب یہ حرفِ مشتاقی؟
کریں جذبات کو بیدار خواب آلود آنکھوں
سکھائے کون خوش چشموں کو یہ شوخی یہ شلاقی؟
گرائے گی نجانے کس مغاکِ تارو تیرہ میں
رسولِ ہاشمی کی قوم کو آپس کی ناچاقی؟
بجھا دی شمعِ حکمت تندبادِ جاہلیت نے
سمٹ کر تنکنا میں رہ گیا پیغامِ آفاقی
ہیں اہلِ منبر و محراب عاری فہم و دانش سے
ہیں داعی خیر کے خوگر دہ تمزویر و زرّاقی
تری دنیا میں لاکھوں ایک لقمے کو ترستے ہیں
یہی اے خالقِ ارزاق! ہے کیا شانِ رزّاقی؟
ہے ان کے دم قدم سے قائم آب و تاب عالم کی
کریں اپنی جگہ اہلِ ہنر بھی کارِ خلّاقی
ہے بخشنہار کی بخشش کمال و کسب کیا میرا
تخیّل کی یہ دزدائی طبیعت کی یہ برّاقی؟
سروشِ غیب کی تائید بھی درکار ہے اس کو
نہیں کافی قبولیت کو محض اخلاص و مشّاقی!
ترا سب سے بڑا دشمن ترے پہلو میں ہے خالدؔ
کہیں تجھ سے نہ ہوں منسوب اس کے شعرِ الحاقی!

سید مشکور حسین یاؔد

بہت سودے کے اپنے ہم کھرے ہیں
ہمیشہ دل ہی دے کر دل لئے ہیں

ہمیں جو جاگتا ہے دیکھتا ہے
ہم اپنی صبح کے اندر چھپے ہیں

نگاہیں تو اُٹھی تھیں ایک ہی بار
مگر پردے تو اب تک اُٹھ رہے ہیں

ہماری سانس ہے بادِ بہاری
مثالِ شاخِ گُل ہم جھومتے ہیں

بہت چھانی ہے ہم نے خاک اپنی
تب اپنے آپ میں آ کر بسے ہیں

ہیں اپنے کارنامے زُلف در زُلف
سلاسل ہی ہمارے سلسلے ہیں

چھوا کیا یاؔد وہ دستِ حنائی
ہم اپنے آپ میں رچ بس گئے ہیں

ندا فاضلی

کہیں چھت تھی' دیوار و در تھے کہیں ملا مجھ کو گھر کا پتا دیر سے
دیا تو بہت زندگی نے مجھے' مگر جو دیا وہ دیا دیر سے

ہوا نہ کوئی کام معمول سے گذارے شب و روز کچھ اس طرح
کبھی چاند چمکا غلط وقت پر کبھی گھر میں سورج اُگا دیر سے

کبھی رک گیا راہ میں بے سبب' کبھی وقت سے پہلے گھر آئی شب
ہوئے بند دروازے کھل کھل کے سب' جہاں بھی گیا میں گیا دیر سے

یہ سب اتفاقات کا میل ہے' یہی ہے جدائی یہی میل ہے
میں مُڑ مُڑ کے دیکھا کیا دُور تک' بنی وہ خموشی صدا دیر سے

سجا دن بھی روشن ہوئی رات بھی' بھرے جام لہرائی برسات بھی
رہے ساتھ کچھ ایسے حالات بھی' جو ہونا تھا جلدی ہوا دیر سے

بھٹکتی رہی یوں ہی ہر بندگی' ملی نہ کہیں سے کوئی روشنی
چھپا تھا کہیں بھیڑ میں آدمی' ہوا مجھ میں روشن خدا دیر سے

ڈاکٹر ناشر نقوی

رنجشیں سب چھوڑ دیں سب سے لڑائی چھوڑ دی
عیب تھا سچ بولنا میں نے برائی چھوڑ دی

اب اُبھر کر آ رہے ہیں ڈوبنے والوں کے نام
خوف کھا کر ناخدا نے ناخدائی چھوڑ دی

توڑ سکتا ہی نہ تھا رشتہ میں اپنے بھائی سے
اس سبب سے باپ کی ساری کمائی چھوڑ دی

اب اترتے ہی نہیں مہماں پرندے جھیل پر
بہتے دریا تھم گئے پانی نے کائی چھوڑ دی

ہم سے پوچھ کس لئے خالی خزانے ہو گئے
شاہ زادوں نے فقیروں کی گدائی چھوڑ دی

رحمتوں نے اپنے سینے سے لگایا ہے اُسے
جس نے وصلِ صبح کی خاطر رضائی چھوڑ دی

کوئے جاناں میں بھلا اب دیکھنے کو کیا بچا
سُن رہا ہوں آپ نے بھی بے وفائی چھوڑ دی

ذہن میں اُبھرے تھے یوں ہی بےوفا یاروں کے نام
لکھتے لکھتے کیوں قلم نے روشنائی بھیج دی

دِل نواز دِلؔ

قتّال ہے صنم مرا سفّاک ہی نہیں
مکّار بھی ہے صرف وہ چالاک ہی نہیں
اشکوں کے ساتھ خُون کا جل بھی ہے رواں
نمناک سب کی آنکھ ہے نمناک ہی نہیں
بِکھرا ہُوا ہے آگ کا دریا بُری طرح
خس بھی ہے دیکھ آگ میں خاشاک ہی نہیں
ہیں آسماں زمین کے چکّر میں کوزہ گر
گردش میں صرف ایک ترا چاک ہی نہیں
بے خوف ہے نِڈر ہے بڑا شوخ و شنگ ہے
گستاخ بھی ہے دیکھ وہ بیباک ہی نہیں
یہ جو ہے ایک آدمِ خاکی جہان میں
ہے آگ، آب اور ہَوا، خاک ہی نہیں
جس میں ہو دِل کی دید کا جوہر کا وہ ایک آنکھ
شفّاف صاف سب سے ہے بس پاک ہی نہیں
چکّر میں جو نہیں ہے وہ کیسی زمین ہے
گردش میں جو نہیں ہیں وہ افلاک ہی نہیں
تیرا کرے تو کوئی کرے توڑ کیا بتا
تو زہر ہے وہ جس کا کہ تریاک ہی نہیں
اَب اور کیا کہے کوئی اَیسے غلیظ کو
وہ اِک نجس پلید ہے ناپاک ہی نہیں
ہے خُون خُون دِل مرا لالہ کے داغ سے
گُل تر بہ تر ہے اوس سے صد چاک ہی نہیں
ہر جسم کو کسا ہے تکبّر کی طناب نے
خیمہ بھی تنگ ظرف ہے پوشاک ہی نہیں
دُشمن کے دِل میں کیا ہے وہ سب جانتا ہے دیکھ
اُس کو فقط نِگاہ کا اِدراک ہی نہیں
جو اَب ہُوا ہے دِلؔ سرِ بازار خُون دیکھ
وہ خُون دردناک ہے خُوںناک ہی نہیں

اسلم راہی

جوش کو راہ نہ دی ہوش کو قائم رکھا
سامنے ایک ہی منہاجِ عزائم رکھا

ہم نے ہر عہد میں روکا ہے اُسے جس نے قدم
جانبِ وادیِ تقلیدِ جرائم رکھا

میرے اللہ کا احسان ہے اِس قحط میں بھی
اُس نے فاقہ نہیں رکھا مجھے صائم رکھا

دوستی کا یہ سبق میں نے لیا پھولوں سے
ہاتھ کانٹوں پہ بھی رکھا تو ملائم رکھا

بھولنے کی مجھے عادت نہیں اسلم راہیؔ
یاد رکھا ہے جسے میں نے اُسے دائم رکھا

شگفتہ نازلی

گرچہ دُنیا تو آنی جانی ہے
پھر بھی مالک بڑی سُہانی ہے

صرف اعمال ساتھ جاتے ہیں
باقی ہر شے تو بس کہانی ہے

میرے حرفوں کو یوں سلاست دے
جیسے بہتی ندی کا پانی ہے

چھت سے پہلے ذرا تو یہ سوچو
ایک دیوار اور اُٹھانی ہے

خوش گمانی سے اب گریز کرو
پہلے اُس نے کبھی کیا مانی ہے

پھر بھی جانے کو جی نہیں کرتا
جانتے ہیں کہ دُنیا فانی ہے

اُس کی باتوں پہ کان نہ دھرنا
وہ تو خود سَر بڑی دوانی ہے

اب تو متروک سارے قصے ہوئے
کون راجہ کہاں کی رانی ہے

کچھ تو پانی میں لہریں پیدا ہوں
ایک کشتی ذرا بہانی ہے

ایسی حیرت کی بات کیا اِس میں
یہ تو جذبے کی ترجمانی ہے

جو بھی مانگا ہے مولا تجھ سے ہی
آگے اَب تیری مہربانی ہے

جان تو دی ہوئی اُسی کی ہے
آخرش ایک دن تو جانی ہے!

شہاب صفدر

کہیں چراغ کہیں پہ ستارے گریاں تھے
شریکِ غم تھے جو سورج کے سارے گریاں تھے

وہ شب تھی گریے کی اور گریہ تھا قیامت کا
برنگِ صوزِ غمِ دل کے مارے گریاں تھے

بس ایک میں ہی نہ تھا تیرے بعد رنجیدہ
فضائیں اشک فشاں تھیں، نظارے گریاں تھے

مجھے تھا گھیرے ہوئے ایک رنج کا گرداب
کھڑے ہوئے سرِ ساحل سہارے گریاں تھے

دکھائی دیتی تھی وہ شام مجھ کو آخری شام
کہ جاں سے بڑھ کے جو لگتے تھے پیارے گریاں تھے

سبھی کو دکھ تھا مرے بے سبب اجڑنے کا
سب اہلِ چشم بغیر اک تمہارے گریاں تھے

کسی بھی درد سے کچھ واسطہ نہیں تھا تو پھر
شہابؔ دیدہ و دل کیوں ہمارے گریاں تھے

حصیرؔ نوری

چین نہ لینے دے گی تم کو دھوپ کبھی ویرانے میں
اپنی چھاؤں میں خود کو رکھنا دیر لگی ہے آنے میں

کب سے میں حیران کھڑا ہوں جیون کی دلہن کے پاس
جانے کتنا وقت لگے گا گھونگھٹ کو سرکانے میں

اس کے دل میں بھید ہے کیا کیا مجھکو کچھ معلوم نہیں
آنکھوں میں جب نیند بھری ہو جاگے کون جگانے میں

پچھلی خوشیوں کا کوئی لمحہ یاد نہیں ہے کس سے کہوں
لمحے ساعت، ساعت بھی دن بن جائیں گے جانے میں

آخر کس دنیا میں ڈھونڈیں امن وفا کی منزل ہم
بے حس و حرکت ہم ٹھہرے ہیں ذات کے اس تہہ خانے میں

کیسے کیسے زخم ہیں دل میں، پل دو پل کی بات نہیں
دیر لگے گی اس کو یارو بات مجھے سمجھانے میں

ممکن ہے اب کوئی شاید مجھ سے ملنے آئے حصیرؔ
ضد ہے مجھے جینے کی لیکن بہتر تھا مر جانے میں

پرتو روہیلہ

کارِ الفت اور اتنی عجلت میں
ہم تو مارے گئے شرافت میں

ایسا لگتا ہے اڑ گئے یک دم
جتنے لمحے تھے ایک ساعت میں

وصل کی رات بھی تمام ہوئی
لمسِ نا آشنا کی حیرت میں

موسموں نے بھی ڈھا دیا اسکو
کچھ خرابی بھی تھی عمارت میں

ایک بوسہ کر لوٹتے ہیں یہ ہونٹ
مدتوں سے اسی حلاوت میں

اس کو دیکھا نہیں نظر بھر کے
زندگی کٹ گئی محبت میں

وہ بھی تنہا ہے میں بھی ہوں تنہا
ہو ملاقات کیسے خلوت میں

حسن کی بولیاں سرِ بازار
عشق کے فیصلے عدالت میں

کون پوچھے کہ لکھنے والے نے
لکھدیا کیا ہماری قسمت میں

مامون ایمن (نیویارک)

بدلتے وقت کی رفتار کیا ہے
محبت! اب ترا کردار کیا ہے

زمیں کو چھو رہا ہے آسماں، اب
طلب کی راہ میں پرکار کیا ہے

کھا کر سر بھی مرتا ہی نہیں وقت
ہوا کے ہاتھ میں تلوار کیا ہے

بھلا بیٹھا ہوں میں خود کو بھی، لوگو!
مرے کاندھوں پہ اب یہ بار کیا ہے

ازل سے ہے مری فطرت میں جھکنا
تو پھر سجدوں سے مجھ کو عار کیا ہے

انا الحق سے ابھی واقف نہیں میں
مجھے معلوم کب ہے، دار کیا ہے

مجھے ہے فخر میں خاکی ہوں، میری
نظر میں نور کیا ہے، نار کیا ہے

صبا سے پوچھتا پھرتا ہوں، ایمن!
وفا میں پھول کیا ہے، خار کیا ہے

شین کاف نظام

کہانی کوئی ان کہی بھیج دے
اندھیرا ہوا روشنی بھیج دے

اداسی اکیلے میں ڈر جائے گی
گھڑی دو گھڑی کو خوشی بھیج دے

یہاں کوئی طوفان آنے کو ہے
کوئی شاخِ زیتون کی بھیج دے

زمیں پر ہماری بڑا شور ہے
خلا سے ذرا خامشی بھیج دے

فرشتے زمیں پر بہت آ چکے
کہیں سے کوئی آدمی بھیج دے

شاہد واسطی

دل کھینچتی ہے زلفِ پریشاں اُسی طرح
غزلیں اتر رہی ہیں مری جاں اُسی طرح

اہلِ وطن کہاں ہیں جنہیں کچھ خیال تھا
فن کار آج بھی ہے پریشاں اُسی طرح

غربت کو اب بھی آبلہ پائی کا سامنا
سرمایہ آج بھی ہے خراماں اسی طرح

بچپن ہو جیسے حکم کے ملنے کی دیر ہے
مل تو گیا ہے کھیل کا ساماں اسی طرح

جاتے ہوئے جو تم نے کہا تھا تم آؤ گے
دل کی گلی ہے آج بھی ویراں اسی طرح

کہتا ہے کون علم و ہنر ہیں بہار پر
انسانیت ہے چاک گریباں اُسی طرح

وعدوں کے پھول سوکھے ہوئے دیر ہو چکی
بکھرا پڑا ہے ہجر کا ساماں اُسی طرح

تیرے خیال نے جہاں رستہ بدل لیا
بیٹھا ہوا ہوں بے سروساماں اسی طرح

سب کچھ تو ہے یہاں تم آؤ تو بات ہے
دریا رواں دواں ہیں گلستاں اُسی طرح

اکبر حمیدی

یہ کیوں کہوں کہ مجھے چھوڑ کر گئے ہوئے ہیں
کہ جانے والے مری روح میں بسے ہوئے ہیں

مَیں اپنی سمت کے اک راستے سے آتا ہوں
تمہاری سمت کے سب راستے رُکے ہوئے ہیں

ہوائیں وقت کی شرمندہ ہو کے لوٹیں گی
ہم اپنی خاک سے پاتال تک جُڑے ہوئے ہیں

تری رضا ہو تو تبدیل کر دوں ان سب کو
جو تیری چاندی سی پیشانی پر لکھے ہوئے ہیں

کوئی تو ہو جو انہیں اعتدال میں کر دے
کہ اپنی حد سے بہت بوالہوس بڑھے ہوئے ہیں

نہیں تھا ان کے نصیبوں میں کوئی روشن لفظ
بہت سے لفظ بظاہر لکھے پڑھے ہوئے ہیں

اب اپنے ذوقِ نظر کا سوال ہے اکبر
ہزار زاویے اُس جسم پر بنے ہوئے ہیں

باقر زیدی

کچھ نئے حرف لکھوں کوئی نئی بات کروں
کچھ تو ہو پاس مرے جس پہ مباہات کروں

بازوؤں میں نہیں طاقت کہ اٹھاؤں کوئی بوجھ
اور یہ عزم کہ تبدیلئ حالات کروں

اجنبیت ترے ماحول میں دم گھٹتا ہے
کوئی ایسا بھی ملے جس سے کوئی بات کروں

نہ کسی زلف کا سایہ نہ کسی جسم کی دھوپ
روز و شب کس کے سہارے بسر اوقات کروں

کچھ تو مجھ سے بھی ملے میرے تمدن کا سراغ
تَرک میں کیوں رَوشِ پاسِ روایات کروں

چھین لیتا ہے مسیحا سے شفا کی طاقت
کیا دعاؤں سے ملے گا کہ مناجات کروں

گردشِ وقت کہ پوچھے ہے زمانے کا مزاج
سامنے آئے ذرا میں بھی تو وہ بات کروں

ایک دل کم ہے محبت میں تواضع کے لیے
کس طرح اتنے حسینوں کی مدارات کروں

اُس سے اک بات بھی کہتے نہیں بنتی باقر
جس سے چاہے بہت جی کہ ہر اک بات کروں

ذکیہ غزل

میں تیرے ہجر زدہ موسموں کی زد میں ہوں
پسِ خیال تری قربتوں کی حد میں ہوں

میں چاہتی ہوں اجالا مری زمیں پہ ہو
میں اک دیا ہوں، مگر روشنی کی مد میں ہوں

یہ نسلِ نو مرے لہجے سے متفق کب ہے
میں اک سوال ہوں لیکن قبول و ردّ میں ہوں

کشاں کشاں لئے پھرتی ہے جستجو کوئی
خبر نہیں کہ جنوں میں ہوں یا خرد میں ہوں

مرا ہنر مرا اپنا ہے مستعار نہیں
میں جسقدر بھی، جہاں بھی ہوں اپنے قد میں ہوں

کدورتیں ہیں یہاں نفرت و عداوت ہے
مگر میں پھر بھی یہاں فکرِ نیک و بد میں ہوں

وہ دوستی میں غزلؔ حد سے گر گئے لیکن
میں دشمنی کو نبھا کر بھی اپنی حد میں ہوں

قیصر نجفی

پھول سے چہرے جو مرجھانے لگے
ہم خزاں دیدہ بھی شرمانے لگے

امن سے اکتا گئے انسان جب
جنگ سے دل اپنا بہلانے لگے

لے رہے تھے نام جو اخلاص کا
لوگ ہم کو بھی وہ دیوانے لگے

ان سے کیا امید ہو انصاف کی
سب حقائق جن کو افسانے لگے

بڑھ گیا کچھ اور زنجیروں کا وزن
جب سے ہم آزاد کہلانے لگے

دیدہ و دل میں وہی رت ہے جو تھی
گلستاں اب کے بھی ویرانے لگے

اس ستم کا کس سے مانگیں گے حساب
آپ قیصرؔ خود پہ جو ڈھانے لگے

ڈاکٹر پنہاں

دل کو یہ سمجھانا ہے
دنیا پاگل خانہ ہے

وہ کیسا بیگانہ ہے
دل جس کا دیوانہ ہے

فطرت کے بیگار سبھی
شمع بنے پروانہ ہے

جیون دکھ سکھ دکھ سب
الجھا تانا بانا ہے

ہیرے موتی رو لینا
جینے کا ہرجانا ہے

سپنا ہے یہ جیون اور
دنیا اک افسانہ ہے

حاصل کا بھی حاصل کیا
آخر تو مر جانا ہے

منزل ویسے دور نہیں
رستہ کچھ انجانا ہے

موت کے قدموں میں رکھا
ہستی اک نذرانہ ہے

پنہاںؔ اب تو ہر اک کو
شاعر ہی کہلانا ہے

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

بخش دیتی ہے خطا غم کو بھلا دیتی ہے
ماں تو ہر حال میں بچوں کو دعا دیتی ہے

جنگ کچھ بھی نہیں دیتی تباہی کے سوا
دشمنی اور بھی نفرت کو ہوا دیتی ہے

ایسا لگتا ہے اجالوں سے ہے نفرت اس کو
یہ ہَوا جلتے چراغوں کو بجھا دیتی ہے

چین پل بھر کے لئے بھی نہیں لینے دیتی
زندگی تو مجھے کیوں اتنی سزا دیتی ہے

راکھ ہو جاتی ہے جل کر میرے ارمان کی لاش
جب کبھی یاد تیری آگ لگا دیتی ہے

بات کچھ بھی ہو مگر یہ بھی حقیقت ہے جناب
بھوک انسان کی توقیر گھٹا دیتی ہے

اپنے بیگانے کی کچھ قید نہیں ہے عاشق
مفلسی سب کی نگاہوں سے گرا دیتی ہے

سوہن راہی

سفر تھا اور سفر میں راستے تھے
مری منزل تھی کہاں، کیا فاصلے تھے

بُجھا لیتے تھے اپنی پیاس خود ہی
لبوں کی پیاس میں کیا حوصلے تھے

سمندر تھے میرے پہلو میں رقصاں
مرے خوابوں کے جھرنے جاگتے تھے

مرے دشتِ طلب چُپ چاپ ہیں اب
یہیں پر آنسوؤں کے قافلے تھے

گُلوں کے رنگ اور خونِ جگر میں
حدیثِ دل کے یکساں سلسلے تھے

زمیں کی پیاس کُچھ ایسی نہیں تھی
نہ میری بھوک میں یہ مرحلے تھے

سلطان صبروانی

یہ اختیارِ عدل ترا اور کتنی دیر
یہ کاروبارِ جُرم و سزا اور کتنی دیر

یہ بال و پر یہ جُرأتِ پرواز کب تلک
یہ تیرے رُخ پہ چلتی ہوا اور کتنی دیر

گُلہائے عطر بیز یہ کلیاں یہ دِل کشی
گلشن میں رقصِ بادِ صبا اور کتنی دیر

الفاظ بھی نہ ساتھ ترا دیںگے ایک دن
یہ تمکنت یہ ذہنِ رسا اور کتنی دیر

کب تک رہوں میں گوش بر آواز کچھ کہو
سُنتا رہوں میں چُپ کی صدا اور کتنی دیر

آ تجھکو حُسن و خیر کے معنی بتائیں ہم
یہ ترے خیر خواہ بھلا اور کتنی دیر

کیا جانے کس کو خیر کی منزل نصیب ہو
یہ ترے ساتھ راہنما اور کتنی دیر

اک دن تو اُس نے حشر کی محفل سجانی ہے
تنہا رہے گا میرا خدا اور کتنی دیر

غالب عرفان

رہِ منزل جو پاؤں میں چھپی ہے
مہ و انجم کی چھاؤں میں چھپی ہے

عصاً اک چاہیئے پھر معجزاتی
نئی دنیا بلاؤں میں چھپی ہے

ہوائے امن جو خوشبو تلاشے
وہ اُڑتی فاختاؤں میں چھپی ہے

نئے انسان کی ہر تشنہ خواہش
خلاؤں در خلاؤں میں چھپی ہے

سنہری روشنی صبحِ ازل کی
ابد کی انتہاؤں میں چھپی ہے

گلی کے شور میں گم چاپ اُس کی
مری آہٹ فضاؤں میں چھپی ہے

بدلتے موسموں سے میری نسبت
سمندر کی ہواؤں میں چھپی ہے

میں مجرم ہوں خود اپنی آگہی کا
مری ہستی خطاؤں میں چھپی ہے

وہی ہے شہرِ عرفاںؔ کی تمنا!
جو زیرِ لب دعاؤں میں چھپی ہے

ملک زاہدہ جاوید

خود پہ نشہ طاری رکھ
اُس سے ملنا جاری رکھ

بے ترتیبی ٹھیک نہیں
کمرے میں الماری رکھ

اُڑ جائیں گے سب کاغذ
ان پہ پتھر بھاری رکھ

سب کو بانٹ کے خیموں میں
اپنے گھر سرداری رکھ

سچائی کی پرتیں کھول
خبروں کو معیاری رکھ

اپنی الگ پہچان بنا
فکر نہ تو بازاری رکھ

لہجے کو سنجیدہ کر
باتوں میں تہ داری رکھ

محفل کی خاطر جاویدؔ
کچھ خبریں سرکاری رکھ

غفار بابرؔ

رُکنے ضرور دِل میرا دلبر بھی آئے گا
لیکن وہ لے کے ہاتھ میں خنجر بھی آئے گا

یہ بھی بہت ہے سَر تو سلامت ہے دوستو!
بیری اگر ہے گھر میں تو پتھر بھی آئے گا

ایڑی اُٹھا کے چلنے لگا ہے جو ساتھ ساتھ
کل کو یہ میرے قد کے برابر بھی آئے گا

لکھوں گا جب میں اُس کا سراپا تو خودبخود
کوزے میں بند ہونے سمندر بھی آئے گا

ملنے کے واسطے مجھے کانٹوں کے شہر میں
میں نے سنا وہ رشکِ گُلِ تر بھی آئے گا

کیا پوچھتے ہو تشنہ لبوں کی کرامتیں
لے کر وہ ساتھ بادہ و ساغر بھی آئے گا

مجھ کو یقین ہے کہ میرے ہاں وہ مہ لقا
اِک بار آگیا تو "مُکرّر" بھی آئے گا

اتنا وہ بے لحاظ نہیں جانتا ہوں میں
آیا ہے جب یہاں تو میرے گھر بھی آئے گا

مجھ کم سخن کی بزم میں بابرؔ خدا گواہ
سوچا نہ تھا کہ تجھ سا سخنور بھی آئے گا

صدیق شاہد

نہ زیر بار کوئی کر سکا سوال مجھے
انانیت نے بنا رکھا یرغمال مجھے!

خطا معاف میں گم تھا اک اور عالم میں
پکارتا رہا شب بھر ترا خیال مجھے

نکھر رہا ہے بدن دھوپ کی تمازت میں
یہ کس جہان میں لے آئی کوئی چال مجھے

میں پیار کرتا ہوں تجھ سے تو بدگماں بھی ہوں
تو بدگمانی کے گرداب سے نکال مجھے

تری نظر تھی کہ جس سے میں سرفراز ہوا
تری نظر ہی نے کر ڈالا پائمال مجھے

تو جا چکا بھی نہیں ہے مگر ترا جانا
ابھی سے رکھے ہوئے ہے بہت نڈھال مجھے

وہ میرے ربط نہاں کا اسیر ہے اب تک
جوان رکھتا ہے شاہدؔ یہ احتمال مجھے

انا دہلوی

یہ پیار بھرا لہجہ دلگیر نہ بن جائے
کہہ کہہ کے غزل مجھ پر وہ میر نہ بن جائے

لاتا ہے خیالوں کو احساس کے کاغذ پر
ڈرتی ہوں کہیں تصویر نہ بن جائے

ہاتھوں میں قلم لے کر میں سوچنے لگتی ہوں
حالات کی مجبوری شمشیر نہ بن جائے

بدلی ہوئی دنیا کی بدلی ہوئی باتیں ہیں
رشتہ کہیں پیروں کی زنجیر نہ بن جائے

دنیا میں بنایا ہے اک چھوٹا سا گھر میں نے
یہ تاج محل جیسی تعمیر نہ بن جائے

یہ مسئلہ دل کا ہے حل کر دے اسے مولا
یہ درد محبت بھی کشمیر نہ بن جائے

تم دل میں اناؔ اپنی امیدیں جواں رکھنا
تاریکیٔ غم جب تک تنویر نہ بن جائے

رب نواز مائلؔ

جو احساسِ خوشی کو کچھ نہیں ہو
ہمیں خوف مرگ کے پھر کیا کہیں ہو

یہ کہنا کیوں ہے بجنے کا ہمیشہ
کہ ہستی اُن سے ہی شاید حسیں ہو

بکار شعر گوئی کیوں نہ ہو یوں
کہ جو بھی آگے آئے دل نشیں ہو

وہ کیا ہیں بوجھتے سوچیں نہ اس پر
جنہیں سب بوجھنے کو اک زمیں ہو

جہاں بھی ہو کوئی ہنگامۂ زرخ
بپائے شوق دل پہنچا وہیں ہو

وفا کے نام پر *تکذاب مائلؔ
کسی کو ہو نہ ہو تم کو کہیں ہو

*پشتو لفظ گمیں انجمن کے حق میں

پروفیسر زُبیرؔ کنجاہی

فرسودہ رسموں کی قبائیں
کب تک جسم و جاں پر سجائیں

دونوں طرف ہے اِک مجبوری
کیسے یہ دیوار گرائیں

ہر جانب ہیں درد کے پہرے
چار طرف ہیں کالی بلائیں

ہر چہرہ اِک آئینہ ہے
کس کو چھپائیں کس کو دکھائیں

مجھ کو کیا پہچان سکیں گے
جو خود کو پہچان نہ پائیں

جانے زُبیرؔ کہاں کھویا ہے
آؤ اُسے بھی ڈھونڈ کے لائیں

کرامت بُخاری

عجب ویران وادی کا سفر ہے
زمیں زرخیز لیکن بے ثمر ہے۔

مرے دامن میں جب سے ہے محبت
سُنا ہے حادثوں کو بھی خبر ہے۔

کھلی جب سے تلاطم کی حقیقت
اُسی دن سے طبیعت بے خطر ہے۔

نہ کیوں صحرا میں عکسِ آب دیکھوں
یہ پانی کی پُرانی رہ گزر ہے۔

میں تنہائی میں تنہا تو نہیں ہوں
کسی کی یاد میری ہم سفر ہے۔

نئے قصے پُرانے تذکروں سے
نئی سوچوں پہ ماضی کا اثر ہے۔

وہی جو باخبر کہتا ہے خود کو
وہی سب سے زیادہ بے خبر ہے۔

صابرؔ عظیم آبادی

میں قصرِ جاں کا در و بام جگمگا نہ سکا
ہوا تھی اتنی کہ گھر میں دیا جلا نہ سکا

جسے بٹھایا تھا پلکوں کی چھاؤں میں ہم نے
وہ شخص دھوپ کی یلغار سے بچا نہ سکا

عدو کو موردِ الزام کیسے ٹھہراؤں
میں دوستوں میں بھی اپنی جگہ بنا نہ سکا

قدم قدم پہ ملے اتنے غم کہ آنگن میں
میں ایک پھول مسرّت کا بھی کھلا نہ سکا

حصارِ تیرہ شبی میں گھرا رہا برسوں
یہی سبب ہے کہ میں روشنی میں آ نہ سکا

پروئے اس طرح الفاظ کے گہر میں نے
زمانہ میرے قلم کی ہنسی اُڑا نہ سکا

جبھی تو سانپ خسارے کا مجھ کو ڈستا ہے
ترے ارادوں کا اندازہ میں لگا نہ سکا

دباؤ اتنا اندھیروں کا تھا کہ میں اب تک
دیارِ عشق میں سورج کوئی اُگا نہ سکا

ہوا کا کھیل تھا سارا اسی لئے صابرؔ
یہ بادبان مجھے راستہ دکھا نہ سکا

خورشید انور رضوی

بچپن، جوانی سنگت و احباب لے گیا
سب کچھ بہا کے وقت کا سیلاب لے گیا

تصویر ماہ و سال گئی ذہن سے اتر
کشتی کو سطحِ آب سے گرداب لے گیا

اِک شخص کیا گیا کہ سبھی مجھ سے چھین کر
صبر و قرار، ہوش، تب و تاب لے گیا

صحرا میں، جنگلوں میں کبھی اُس کے شہر میں
جانے کہاں کہاں دلِ بیتاب لے گیا

کس کا وجود تھا کہ مری سوچ بن گیا
کس کا خیال تھا کہ مرے خواب لے گیا

خورشید کیا کہوں کہ غم و فکرِ روزگار
دل کے چمن سے اِک گُلِ نایاب لے گیا

سحر تاب رُومانی

دل کا شیشہ سوچ رہے تھے
کیسے ٹوٹا سوچ رہے تھے

دنیا منظر دیکھ رہی تھی
ہم ہی تنہا سوچ رہے تھے

تم نے صحرا بخش دیا ہے
ہم تو دریا سوچ رہے تھے

پیچ و خم میں اُلجھ گئے ہیں
سیدھا رستہ سوچ رہے تھے

ویسا ویسا ہُوا کہاں ہے
جیسا جیسا سوچ رہے ہیں

طاقِ دل پر صرف ہُوا ہے
جلتے رہنا سوچ رہے تھے

اِس سے آگے سفر ہمارا
ہو گا کیسا سوچ رہے تھے

سجاد مرزا

عمر کے لمحوں کی لاشیں ایک اک گرتی رہیں
خواہشوں کی ناگنیں انسان کو ڈستی رہیں

ایک بھی چہرہ یہاں ہنستا ہُوا دیکھا نہ تھا
خوف کی پرچھائیاں ہر سمت لہراتی رہیں!

جسم اس کا بے حس و بے جان ہو کر رہ گیا
میرے اندر بے بسی کی آندھیاں چلتی رہیں

موسموں کے کیا عجب پر تو پڑے تخلیق پر
برف رُت میں تتلیاں پھولوں پہ منڈلاتی رہیں

آج پھر اس کی توجہ اَور ہی جانب رہی
آج پھر آنکھوں میں میری کرچیاں چبھتی رہیں

دل کے جگنو نے دیا جینے کا مجھ کو حوصلہ
چاندنی راتیں اندھیرا اوڑھ کر بیٹھی رہیں!

کس لیے سجاد مرزا اس کی چاہت میں جیئے؟
جس کی بانہیں چاند تاروں کے لیے پھیلی رہیں!

اِکرام تبسّم

ظلم کو اپنا ظرف دکھلا دو
لاش کو مسکرا کے بوسہ دو

ہو گئے جمع سامعین تمام
بڑھ چلا ہے سکوت' خطبہ دو

باپ سے بولا کہیں بیٹے
بیچ کر جائیداد حصہ دو

داد بہروں سے کر رہے ہو وصول
اپنی آواز کو نہ دھوکا دو

نگرانی کرو خزانے کی
دیدہ و دل پہ اپنے پہرہ دو

مر نہ جائے برہنہ جسم غریب
چادرِ گردِ راہ پہنا دو

شیشہ و سنگ کو تبسّم جی
ہوش میں اپنے اب تو ٹکرا دو

علی عرفان عابدی

رت جگا آنکھ میں سج ... نا.. آیا
بعد تعبیر کے سپنا .... آیا

اُس کے چہرے کے مقابل آ کر
چاند بھی گہن میں ہے نا..... آیا

ہر حوالے کو منانے کے لئے
اٹھ کے میں بزم سے تنہا آیا

اُس کی خوشیوں کے لئے اپنی خوشی
ساتھ ہی دل کے میں دفنا آیا

میں دمِ واپسی خموشی سے
اک جنازہ لئے اپنا آیا

ذہن و دل تھے مگر پھر بھی
بات کہنے کی نہ کہنا آیا

دل کو گھر تو سمجھ لیا اُس نے
ساتھ عرفاؔن نہیں رہنا آیا

احمد ظہور

شور گھر گھر سے قیامت کا اُٹھا میرے بعد
میں جو کہتا تھا وہ دنیا نے کہا میرے بعد

ظلم کے ہاتھ کو روکو میں فقط کہتا ہوں
توڑ ڈالے گا اِسے جو بھی اُٹھا میرے بعد

شامِ غم بیت گئی جی بھی لئے تیرے بغیر
یاد اب آئی تجھے میری تو کیا میرے بعد

کون پوچھے گا کہ کیوں دیر سے گھر آئے ہو
کون دیکھے گا تیری راہ کھڑا میرے بعد

میں تیری بزم سرِ شام ہی چھوڑ آیا تھا
دیر تک جلتا رہا کوئی دیا میرے بعد

یوں تو اُس نے بھی بہت میری پذیرائی کی
دیکھئے کہتا ہے محفل میں وہ کیا میرے بعد

میں نے کی اُس سے محبت بھی پرستش کی طرح
بن نہ بیٹھے کہیں وہ بت بھی خدا میرے بعد

وہ جو اک لمحہ سرِ دار گراں گزرا ہے
پھیل کر صدیوں پہ ڈھونڈے گا فنا میرے بعد

ثنا اکبر

آباد ہیں نظر میں منظر وہی پرانے
کاش آئے دن کوئی پھر لے کر وہی پرانے

غربت وہی وطن میں ہر سمت آج بھی ہے
یعنی نشانِ عبرت ہیں گھر وہی پرانے

بچپن کی پیاری یادیں اُن میں بسی ہوئی ہیں
ہیں پاس تتلیوں کے جو پر وہی پرانے

کب آنچ پیار کی یہ پگھلا سکے گی ان کو
دل کی جگہ دھرے ہیں پتھر وہی پرانے

جاری وفا جفا میں آویزشیں ہمیشہ
ہیں سر وہی پرانے خنجر وہی پرانے

یہ آتشِ تعصب ہوتی نہیں فرو کیوں
حالات دیس کے ہیں بدتر وہی پرانے

سمجھوں نہ ثنا کیوں ورنہ سہیلیاں تو
دے کر فریب جائیں اکثر وہی پرانے

شاکر خان نیازی

وہ کر گیا ہے میرے نام گھر جُدائی کا
ہے ایک پردہ میری آنکھ پہ جُدائی کا

اِسی گمان میں یہ روح کانپ اٹھتی ہے
کھٹک رہا ہے میرے دل میں ڈر جُدائی کا

محبتوں کی صداقت پہ ہے یقیں لیکن
مجھے تو رہتا ہے ہر وقت ڈر جدائی کا

خوشی کے شعر میری کیوں زبان سے ابھریں
ابھی تلک ہے یہ مجھ پہ اثر جُدائی کا

ہمارے درد بھی ہنستے ہیں اشک پہ شاکر
وہ دے رہا ہے دلاسہ مگر جُدائی کا

وقت کا پہیہ

انور خواجہ (لاس ویگاس)

ہارون اپنی گلی سے نکل کر شریڈن روڈ پر چڑھا۔ جس کے دونوں طرف اُونچی اُونچی فلک بوس شاندار عمارت شانے سے شانے بھڑائے کھڑی تھیں۔ اُن سے پرے جھیل مشی گن تھی جس کا پانی غروب آفتاب کی روشنی میں سیماب کی طرح چمک رہا تھا۔ جھیل کے اُس پار دنیا کی سب سے اُونچی عمارت سیرز ٹاور آسمان کی پہنائیوں کو چیرتی اکیلی کھڑی تھی جو ایک پاکستان معمار فضل الرحمن خان کی نگرانی میں تعمیر ہوئی تھی۔ جسے دیکھ کر اُسے ہمیشہ فخر محسوس ہوتا تھا۔

دائیں طرف ذرا آگے اُسے ایک لڑکی کھڑی نظر آئی جو دیوانے وار ہاتھ ہلا کر کوئی ایک گاڑی ٹھہرانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن ایک کار والا بھی دھیان نہیں دے رہا تھا۔ پہلی چیز جو اُس کی طرف توجہ مبذول کراتی تھی وہ لمبے سنہرے بال تھے جو شانوں پر جھول رہے تھے۔ اُسے خیال آیا کہ وہ بدن فروش ہے اور گاہک کو تلاش کر رہی ہے لیکن جب وہ قریب آکر رُکا تو احساس ہوا کہ وہ بڑی غیر معمولی شخصیت کی مالک تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اُس کے چہرے کے نقش و نگار فطرتی نہیں تھے بلکہ کسی بت تراش نے اپنے کمال فن سے اُن کو الگ الگ بنایا تھا۔ متوازن بیضوی چہرہ۔ رخساروں کی ہڈیاں اُونچی، گول ٹھوڑی، پنکھڑی کی طرح سرخ نازک لب اور ستواں ناک اُس نے ہاتھ ہلانے چھوڑ دیے ایک لمحہ کے لئے ہارون کا جائزہ لیا پھر دوڑ لگائی اور دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

پٹ کر اُس کی طرف دیکھا۔ ہونٹ ذرا سے خمیدہ ہوئے ایک مسکراہٹ کی لکیر چہرے پر پھیلی بڑی بڑی آنکھوں نے اُسے مبہوت کر دیا۔ وہ اندازہ نہ لگا سکا کہ اُن کا رنگ سبز ہے یا نیلا۔

''مہربانی کر کے گاڑی آگے بڑھائیں۔ مجھے بہت دیر ہو گئی ہے۔''

وہ ہالی وڈ کی لڑکیوں کی طرح لگتی تھی اُس نے پورے بازوؤں والی کھلی قمیض اور ڈھیلی پتلون پہنی تھی جس میں اس کے بدن کے زاویے اور اُبھار صاف نمایاں نہیں ہوتے تھے۔

''مندر جانا ہے...... زیادہ دُور نہیں۔''

''کس کا مندر ہے۔''

''بدھوں کا مندر ہے۔''

''اِس سفید امریکیوں کے علاقے میں۔''

''جی ہاں...... آپ ذرا آگے جائیں اور دوسری گلی میں داخل ہوں تو آپ کو ایک بڑی عمارت نظر آئے گی وہی ہمارا مندر ہے۔''

جب وہ وہاں پہنچا تو گلی میں بائیں ہاتھ کو ایک پیگوڑا طرز کی عمارت تھی۔ وہ صدر دروازہ کے سامنے رک گیا۔ اُس نے اپنا پرس اور اخبار وغیرہ سنبھالا اور دروازہ کھول کر اُتر گئی اور پھر اُس سے مخاطب ہوئی۔

''شکریہ آپ کا...... آپ چند منٹ کے لیے مندر میں کیوں نہیں تشریف لاتے۔''

''میری کچھ اور مصروفیات ہیں دعوت کا شکریہ!''

''آپ کا لہجہ ذرا مختلف ہے۔ کس ملک سے آپ کا تعلق ہے۔''

''پاکستان سے۔''

''ارے واہ۔ میں تو پشاور اور سوات جا چکی ہوں۔ وہاں بدھ مذہب کے بہت سے آثار قدیمہ موجود ہیں۔''

''پشاور میرا آبائی شہر ہے...... واہ کیسا اتفاق ہوا۔''

''آپ کل ضرور تشریف لائیں...... چار بجے عبادت ہوگی اُس کے بعد کھانا...... یہاں ہر ایک کوئی نہ کوئی کھانا لے کر آتا ہے بڑا مزہ آئے گا......''

''میں عبادت کے بعد آؤں۔ میں مسلمان آدمی ہوں۔''

''ٹھیک ہے آپ پانچ بجے آئیں...... ہاں ایک بات دھیان میں رکھیں کہ ہم لوگ گوشت نہیں کھاتے...... پانچ بجے بھولئے گا نہیں۔''

''میں ضرور آؤں گا۔ آپ کا نام کیا ہے۔''

''شانتی...... یعنی امن۔''

''مجھے معلوم ہے...... بڑا خوبصورت نام ہے۔''

اُس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ ہارون نے وہ سپید مخروطی ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ اُس ہاتھ سے ایک ہمدردانہ حرارت نکل کر اُس کے ہاتھ میں سرایت کرنے لگی اور پھر سارے بدن میں پھیل گئی۔

دوسرے دن جب وہ پانچ بجے مندر کے باہر پہنچا تو گاڑیاں ایک دوسرے سے لگی کھڑی تھیں۔ پارکنگ تلاش کرنے میں پندرہ منٹ لگ گئے وہ ایک بغلی دروازے سے صحن میں داخل ہوا۔ لوگ عبادت ختم ہونے کے بعد باہر نکل رہے تھے اور درختوں کے نیچے رکھی میزوں کے گرد جمع ہو رہے تھے جہاں کھانا چنا ہوا تھا۔

اُس نے ہجوم کا جائزہ لیا۔ ہر قومیت کے لوگ وہاں موجود تھے لیکن شانتی کہیں نظر نہ آئی۔ دوسرے لمحے اُسے ہندوستانی ساڑھی میں ملبوس ایک بہت ہی حسین لڑکی نظر آئی۔ بسنتی رنگ اُس پر بے حد کھل رہا تھا اُس کے سنہری بال شانوں پر جھوم رہے تھے وہ شانتی نہیں ایک دیوی لگتی تھی۔

شانتی نے دیکھا کہ ایک گورا چٹا لمبا جوان اُس کی طرف بڑھ رہا ہے...... سیاہ گھونگروالے بال اور لمبی لمبی پلکیں...... اُس کی صورت کسی سے ملتی جلتی ہے...... اُس کے ذہن میں ایک بجلی کوندی۔ پشاور عجائب گھر کے باہر بدھ کے دو ایک جیسے مجسمے نصب یاد آئے۔ جو اُس کی جوانی کے زمانے کی نمائندگی کرتے تھے۔ عجائب گھر کے ڈائریکٹر نے بتایا تھا کہ یہ مجسمے آفریدی قبیلے کے نوجوانوں سے بے حد مشابہت رکھتے ہیں۔ شانتی کو یوں لگا کہ وہ مجسمے اُس جوان آدمی کے روپ میں زندہ ہو گئے تھے۔ اُس میں ایک طرح کا روحانی حسن تھا۔ ایک مقناطیسی کشش تھی۔

یہ تو وہی آدمی ہے جس نے اُسے کل مندر میں لا کر چھوڑا تھا۔ وہ

نامعلوم جذبہ کے تحت بازو پھیلائے اُس کی طرف لپکی۔ ہارون نے اُس کے لمس میں عجیب طرح کا جذبہ محسوس کیا اور اُس کا بدن کانپنے لگا دوسرے لمحے وہ اُس سے جدا ہو گئی اور وہ سنبھل گیا۔

''آج تو آپ غضب ڈھا رہی ہیں۔''

''شکریہ۔''

اُن کی آنکھیں چار ہوئیں۔ اُسے یوں لگا کہ وہ ابھی اُن کے سحر سے تحلیل ہو جائے گا۔

''آیئے میں آپ کو کچھ دوستوں سے متعارف کراؤں۔''

اکثر لوگ شانتی سے واقف تھے۔ اُس نے اُن کا انفرادی طور پر حال احوال پوچھا۔ اگر مردوں نے اُس کے برتاؤ اور حسن کی تعریف کی۔ عورتوں نے کسی حسد کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ خندہ پیشانی سے اُس سے بات چیت کی۔ آخر میں وہ ایک بڑے گروہ کے پاس آ کر رک گئے جس میں عورتوں کی تعداد زیادہ تھی۔ سب نہایت انہماک کے ساتھ ایک اونچے سفید آدمی کی گفتگو سن رہے تھے جس کے سر کے بال اور داڑھی صفاچٹ تھی۔ اُس نے بدھ بھکشوؤں کی طرح لمبا لال کرتا پہنا ہوا تھا وہ بظاہر بڑا حلیم طبع لگتا تھا لیکن اُس کے باطن سے ایک طرح کی جنسی کشش پھوٹ رہی تھی جو عورتوں کو مسحور کیے ہوئے تھی وہ کہہ رہا تھا۔

''مجھے عزت مآب دلائی لامہ سے چند سال پہلے نیویارک میں ملاقات کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ وہ ایک عظیم روحانی راہنما اور رحم دل انسان ہیں۔ اُن کی علمیت کا یہ عالم ہے کہ اُنہوں نے وہاں ایک شام خطبے میں بدھ کے فلسفے کو اس طرح پیش کیا کہ مرے جیسے جاہل آدمی کو بھی سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ اُنہوں نے کہا بدھ مت ایک طرح کی سائنس ہے اس کے رموز اسرار سمجھنا کوئی آسان نہیں لیکن اُنہوں نے چند جملوں میں دریا کو کوزے میں بند کر دیا اُنہوں نے مزید وضاحت کی۔ سچائی جسے وہ ''دھرم'' کہتے ہیں ہر ایک کے اندر موجود ہے اُس کو دریافت کرنے کے لیے ہر ایک کو جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ ناخوشی جسے پالی زبان میں ''دکھ'' کہتے ہیں۔ انسانی زندگی کا ایک لازمی جزو ہے ہم انسان مسرت چاہتے ہیں۔ درد اور تکلیف سے دور رہنے کی خواہش کرتے ہیں۔ ہر انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مسرت حاصل کرے۔ ایسی تدابیر اور طریقے اختیار کرے کہ ''دکھ'' پر قابو پا لے لیکن اس عمل میں اُسے دوسروں کو دکھ پہنچانے اور اُن کے حقوق کو پامال کرنے کا حق نہیں۔ ہم جو تدابیر بھی اختیار کریں اُن کے منفی اور مثبت اثرات کے بارے میں پوری طرح سوچ لیں۔ بدھ مت کا یہ نظریہ ہے کہ ہر چیز کا دوسری چیز سے رشتہ ہے۔ رشتے ناتے کا نظریہ آئن سٹائن نے اب دریافت کیا پہلے بدھ مت کے اندر یہ نظریہ دو ہزار اور پانچ سو سال سے موجود ہے۔''

اُس آدمی کی آواز گھمبیر اور پُر اثر تھی کسی نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہیں کی تھی۔ شانتی نے وقفہ سے فائدہ اٹھایا اور آگے بڑھ کر اُس آدمی سے مخاطب ہوئی ''جناب اشوک صاحب...... میں اپنے دوست ہارون سے آپ کو ملوانے لائی ہوں۔ یہ جان کر آپ کو مسرت ہوگی کہ اُن کا تعلق پشاور پاکستان سے ہے۔''

''واہ... واہ... کمال ہو گیا۔ مجھے آپ سے ملاقات کر کے بے حد خوشی ہو رہی ہے۔ میں پشاور اور افغانستان جا چکا ہوں۔''

''بہت خوب... مجھے بھی بڑی خوشی ہوئی جناب......''

''اشوک'' سفید فام آدمی نے کہا ''پشاور سے جو بھی کوئی آتا ہے اُسے میں اپنا دوست سمجھتا ہوں۔ وہاں مختصر قیام کے دوران لوگوں نے بڑی مہمان نوازی اور دوستی کا مظاہرہ کیا۔ میں اُسے بھول نہیں سکتا۔''

اُس نے اپنے دونوں ہاتھ بڑھائے اور ہارون کے ہاتھ کو لے کر بڑی گرمجوشی سے بھینچا۔

''آپ سیر کے لیے آئے ہیں یا کاروباری سلسلہ میں۔''

''اب میں مستقل یہاں رہتا ہوں۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ جب آپ کو فرصت ملے تو میرے غریب خانہ پر تشریف لائیں۔ آئندہ مہینے میں جناب دلائی لامہ کے شکاگو کے علاقے میں دورہ کی وجہ سے خاصا مصروف رہوں گا۔ لیکن اتنی شدید مصروفیت کے باوجود آپ کے لئے وقت نکالوں گا۔ آنے سے قبل فون کر کے معلوم کر لیں۔ میں نے گندھارا کی تہذیب کے بارے میں کئی دستاویزی فلمیں بنائی ہیں آپ آئیں تو آپ کو دکھاؤں گا۔''

''میں ضرور حاضر ہوں گا اور وہ دستاویزی فلمیں دیکھوں گا۔''

تمام عورتیں نہایت غصے سے شانتی اور ہارون کو دیکھنے لگیں۔ جنہوں نے اشوک پر قبضہ کر لیا تھا۔ شانتی نے یہ بات بھانپ لی۔

''اشوک صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ! اب میں ہارون صاحب کو دوسرے مہمانوں سے متعارف کراتی ہوں۔''

''ضرور ضرور...... ہارون صاحب آپ سے ملاقات کر کے بے حد خوشی ہوئی وقت نکال کر ضرور میرے گھر تشریف لائیں۔ شانتی آپ کو لے آئے گی۔''

''اشوک صاحب...... پھر ایک بار آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔''

جب وہ دونوں اُس گروہ سے دُور نکل آئے تو شانتی نے کہا ''اگر ہم کچھ اور وقت اشوک کے پاس ٹھہرتے تو وہ عورتیں ہمیں قتل کر دیتیں۔''

''میں آپ سے پورا پورا اتفاق کرتا ہوں...... اشوک بھی بڑے عاشق مزاج آدمی لگتے ہیں...... ساری عورتیں اُن کے چکر میں ہیں۔''

''ایسی بات نہ کریں.... وہ ایک مذہبی آدمی ہیں۔''

''کیا مذہبی آدمیوں میں جنس نہیں ہوتی۔''

''میں اس موضوع پر کچھ کہہ نہیں سکتی۔''

''آپ کے دلائی لامہ کی بھی کسی عورت سے دوستی نہیں۔''

''اُن کے پاس ذاتی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے کوئی وقت نہیں۔ اُن کے سامنے ایک عظیم مقصد ہے۔ ساری کائنات کو بدھ دھرم سے آشنا کریں وہ عمل تناسخ کے توسط سے دنیا میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔''

''وہ بے شک عمل تناسخ سے آتے ہوں گے مگر اس وقت مغربی طاقتیں اور بھارت اُن کو اشتراکی چین کے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ انعام کے طور پر اُن کو دنیا کے تمام عیش و آرام مہیا کیے جا رہے ہیں۔''

''چین نے دلائی لامہ کے ملک تبت پر زبردستی قبضہ کر لیا ہے۔''

"چین نے بُرا کیا لیکن اُس کا دعویٰ ہے کہ تبت تاریخی طور پر چین کا حصہ تھا۔ اِس وقت کی صورت حال میں وہ تبت کو مغربی طاقتوں کے حوالے نہیں کر سکتا وہ دنیا کی چھت پر اپنے فوجی اڈے تعمیر کر لیں گے اور چین کی جاسوسی کریں گے۔"

"خیر یہ بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے اِس موضوع کو ترک کریں۔"

"میں دلائی لامہ کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔"

"میں تھوڑا بہت آپ کو بتا سکتی ہوں......"

"بتایئے میں سن رہا ہوں۔"

"دلائی لامہ کا نام ایک منگول حکمران نے رکھا تھا جس کے معنی ہیں "عقل کا سمندر" پچھلے چھ سو سال میں جس طرح کا نظام تبت میں پروان چڑھا۔ اُس میں انتظامی اور مذہبی اُمور ایک ہی شخصیت میں زم کر دیئے گئے...... وہ دلائی لامہ ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ دلائی لامہ تبت کا بادشاہ ہوا۔"

"ہاں ایک لحاظ سے کہہ سکتے ہیں لیکن دلائی لامہ کا انتخاب تناسخ کے عقیدے پر مبنی ہے۔ جب ایک دلائی لامہ مر جاتا ہے تو اُس بچے کی تلاش شروع ہو جاتی ہے جس کے بدن نے دلائی لامہ کی روح کو قبول کیا ہے۔ پیشن گوئیوں اور نشانیوں کی مدد سے صحیح بچے کا انتخاب ہوتا ہے اور پھر آخری فیصلہ قومی مجلس کرتی ہے اُس مرحلہ کے بعد بچے کو پٹولا محل میں ایک جلوس کی شکل میں لایا جاتا ہے اور اُس کی تربیت شروع ہو جاتی ہے جب وہ اٹھارہ سال کا ہو جاتا ہے تو مجلس شورا سارے اختیارات اُسے سپرد کر دیتی ہے۔ یہ چودھواں دلائی لامہ ہے جب چین نے تبت پر پوری طرح قبضہ کر لیا تو دلائی لامہ نے بھارت میں پناہ لی۔"

"اِس کا مطلب ہے کہ چودھواں دلائی لامہ آخری ہوگا۔"

"شاید..... اس بات کا فیصلہ چینی حکومت کرے گی ہو سکتا ہے وہ اس رسم کو جاری رکھنے کی اجازت نہ دے۔"

"آپ تو دلائی لامہ کے بارے میں خاصی معلومات رکھتی ہیں۔"

"یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی...... آپ کو بھوک لگی۔"

"تھوڑی سی"

"مرچوں والا کھانا پسند کریں گے۔"

"ضرور"

"تو اپنے تھائی لینڈ کے سٹال پر چلتے ہیں...... لیکن وہاں آپ کو گوشت نہیں ملے گا بلکہ مچھلی بھی نہیں ملے گی۔"

"ٹھیک ہے...... سبزی کھائیں گے۔"

چھوٹے قد اور چپٹی نقوش والی لڑکیاں کڑاہیوں میں تیل کے چولہوں پر سبزی پکا رہی تھیں۔

"ہیلو نینا" شانتی نے کہا۔

"ہائے شانتی...... آپ اس لباس میں کتنی خوبصورت لگ رہی ہیں۔"

"شکریہ" شانتی نے کہا "کچھ کھانے کو مل جائے گا۔"

"ضرور! آپ حکم کریں۔"

"سبزیاں.... کھٹا میٹھا شوربہ اور سادہ چاول.... ایک سبزی میں مسالہ ذرا کم رکھیں۔"

"آپ اُدھر میز پر بیٹھ جائیں.... میں آپ کا کھانا لے کر آتی ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد نینا ایک ٹرے لے کر آئی جس میں بھاپ اُڑاتی سبزی کی دو پلیٹیں گرم شوربے کے دو پیالے اور ایک منقش برتن میں سادہ چاول رکھے تھے...... ساتھ ہی چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں سوئے بین کی چٹنی، سرکا اور سرخ مرچیں۔

"شوربے میں جھینگا مچھلی بھی نہیں" ہارون نے پوچھا۔

"جی نہیں۔"

"جھینگا مچھلی کے بغیر شوربے کا کیا مزہ ہوگا"

"اِس شوربے میں بانس کے پودوں کی جڑیں موجود ہیں" نینا نے کہا "جو جھینگا مچھلی سے زیادہ لذیذ ہیں۔"

"شکریہ! آپ کی بات مان لیتا ہوں۔"

لڑکی مسکرا کر واپس چلی گئی۔

ہارون نے مرچوں کا آدھا پیالہ سبزی پر اُلٹا۔ اُوپر سوئے بین اور سرکا ڈالا اُن کو کانٹے کے ذریعے سبزی کے ساتھ ملایا پھر ایک بڑی چمچ بھر کر منہ میں ڈالی تھوڑی دیر چبایا جب لذت محسوس ہوئی تو نعرہ لگایا۔

"واہ.....واہ۔"

"کمال ہے" شانتی نے مسکراتے ہوئے کہا "آپ کس مزے سے مرچوں بھری سبزی کھا رہے ہیں..... اگر میں ایک چمچ بھی منہ میں ڈالوں تو مر جاؤں۔"

"مرچ کھانا ہمارے خون میں ہے۔"

اُس نے چند منٹ میں سبزی کی پلیٹ ختم کر دی اور نینا سے ایک اور پلیٹ مانگی اُسے بھی چٹ پٹ ختم کیا۔ اُس کے بعد چاول کھائے اور آخر میں شوربہ پی لیا اور پھر شانتی کی طرف دیکھا وہ مسکرائے جا رہی تھی۔

"لگتا ہے آپ کئی دنوں کے بھوکے تھے۔"

"اس طرح کا لذیذ کھانا میسر آئے تو آدمی کتا ہو جاتا ہے۔"

"لیکن آپ لگتے نہیں۔"

"کوشش کرتا ہوں کہ کتا نہ بنوں۔"

دونوں ایک ساتھ ہنسے۔

"اب آپ کھانا شروع کریں۔"

"لیکن آپ مجھے گھوریں گے نہیں۔"

"اچھا..... میں نینا کی طرف دیکھتا ہوں۔"

"اُدھر بھی نہ دیکھیں۔"

"واہ..... ابھی سے جلن شروع ہو گئی۔"

"میں تو مذاق کر رہی ہوں۔"

"اب آپ کھایئے..... میں زمین کی طرف دیکھتا ہوں۔"

شانتی نے چند چمچیں منہ میں ڈالیں پلیٹ کھسکا دی اور اُٹھ کھڑی ہوئی'' مجھے بھوک نہیں..... چلئے آپ کا کچھ اور لوگوں سے تعارف کراؤں۔''

''آپ سے ملاقات کرنے کے بعد مجھے کسی سے ملاقات کی خواہش نہیں۔ آپ جایئے لوگوں سے ملئے۔ میں اب اجازت چاہتا ہوں۔''

شانتی نے اپنے پرس سے ایک کارڈ نکال کر اُس کی طرف بڑھایا۔

''اس کارڈ پر میرے گھر اور مندر ..... دونوں کے فون نمبر ہیں۔ اگر گھر پہ نہ ملوں تو مندر میں فون کرلیں میں اِن دو جگہوں کے علاوہ کہیں نہیں جاتی۔''

''اچھا..... کوئی آپ کا دوست نہیں..... میرا مطلب ہے کوئی مرد آپ کی زندگی میں نہیں آیا۔''

''میری جذباتی..... وابستگی صرف اپنے دھرم سے ہے۔''

''اچھا ضرور..... میں آپ کو فون کروں گا۔''

شانتی نے اپنا چہرہ آگے بڑھایا اُس نے دونوں رخساروں پر بوسے دیئے اور اپنی کار کی طرف جاتے ہوئے سوچنے لگا۔ عجیب لڑکی ہے۔

کچھ دنوں بعد اُس نے شانتی کو فون کیا تو مشین بولنے لگی۔ اُس نے مندر کا نمبر گھمایا۔ تو دوسری گھنٹی پر شانتی نے فون اُٹھالیا۔

''ہیلو''

''ہارون بول رہا ہوں..... کیسی ہیں آپ۔''

''بالکل صحیح سلامت..... آپ کیسے ہیں۔ کدھر ہیں آپ۔''

''میں اپنے اپارٹمنٹ میں ہوں اور آپ کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ بڑی سہانی اور حسین شام ہے۔ چلئے آپ کو کہیں لے چلوں۔''

''شکریہ! میں بہت مصروف ہوں۔''

''کھانے کے لئے تو جاسکتی ہیں۔''

''میرا خیال ہے کہ ایک گھنٹے میں فارغ ہوجاؤں گی۔''

''میں آپ کو لینے آرہا ہوں۔''

''شرط یہ ہے کہ مجھے کھانے کے بعد مندر میں اُتاریں گے۔ ابھی مجھے بہت سے خطوط لکھنے ہیں۔''

''شرط منظور۔''

کھانے کے دوران ہارون نے کہا'' آپ خطوط نویسی کل صبح کے لئے اُٹھا رکھیں آج رات کو کسی ڈسکو یا کلب میں چلتے ہیں۔ بڑا مزہ آئے گا۔''

''آپ کی دعوت کا شکریہ۔ لیکن یہ کام مجھے آج رات کو کرنا ہے۔ صبح تو میں شکاگو ٹیلی ویژن پر کام کرتی ہوں۔''

''میں نے سمجھا تھا کہ آپ سارا وقت مندر میں کام کرتی ہیں۔''

''مندر میں صرف شام کو کام کرتی ہوں..... یہ ایک خدمت ہے میں اُس کام کا کوئی معاوضہ نہیں لیتی۔''

''ٹیلی ویژن میں آپ کی کیا مصروفیات ہیں۔''

''میں مقامی دلچسپی کے لئے چھوٹے چھوٹے پروگرام ترتیب دیتی ہوں۔ دستاویزی فلمیں بنانا میرا خاص شعبہ ہے۔ اُس فن میں یونیورسٹی سے میں نے ڈگری لی ہے۔''

''بہت خوب۔''

کھانے کے بعد اُس نے شانتی کو مندر کے دروازے پر چھوڑا اور اُس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بھینچا۔

''میں آپ سے ایک لمبی ملاقات کرنا چاہتا ہوں..... یہ تو کوئی ملاقات نہ ہوئی۔''

''میں بہت مصروف ہوں۔ آپ مجھے فون کریں کوئی وقت نکال لوں گی لیکن یہ یاد رہے کہ یہ ملاقات رات کے قیام میں نہیں بدل سکتی۔''

''آپ مجھ پر بھروسہ کریں۔ یہ بڑی معصومانہ ملاقات ہوگی۔''

''بائی بائی'' وہ بھاگ کر اندر چلی گئی۔

وہ شریڈن روڈ سے واپس آتے ہوئے سوچنے لگا کہ شانتی جیسی ذہین اور حسین لڑکی کیوں بدھ مت کے چکر میں پڑی ہے اِس کی کوئی منطقی وجہ ہوگی وہ یہ سارے سوالات اُس سے پوچھنا چاہتا تھا لیکن اُسے ڈر تھا کہ وہ ناراض نہ ہو جائے۔

ایک ہفتے بعد وہ اپنے کام سے واپس آیا تو کلارک روڈ سے گذرا اُسے شانتی کا خیال آیا اُس نے اپنی گاڑی مندر والی گلی میں موڑلی وہاں صرف شانتی کی گاڑی کھڑی تھی۔ وہ کمپیوٹر پر بیٹھی کچھ لکھ رہی تھی۔ اُس کے قدموں کی چاپ سن کر اُس نے نظر اُٹھائی اور پھر بھاگتی ہوئی اُس کی جانب آئی۔ اُس کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا اور نیلی آنکھوں میں بدلیاں سی آنے لگیں۔ وہ اُودھے رنگ کی ساڑھی میں بے حد دلکش لگ رہی تھی۔ اُس نے شانتی کے دونوں رخساروں پہ بوسے دیئے پھر شانتی نے ہارون کو آرام سے پیچھے دھکیلا۔

''آج تو آپ بڑی خوبصورت لگ رہی ہیں۔''

''شکریہ۔''

''کسی کے ساتھ باہر جارہی ہیں۔''

''نہیں تو..... میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ میرا کسی سے کوئی جذباتی تعلق نہیں۔''

''پھر ہماری گنجائش ہے..... ہم قسمت آزمائی کرسکتے ہیں۔''

''ضرور کوشش کریں.....''

''پہلے کہیں کھانا کھاتے ہیں۔ اُس کے بعد کہیں گھومنے چلتے ہیں۔''

''آپ ہیں رومانی آدمی اور میرے پاس رومان کے لئے وقت نہیں۔''

''بی بی کام کرکے اپنے آپ کو ہلاک نہ کریں..... چلیں میں آپ کو اپنے گھر لے جاتا ہوں میں بہت اعلیٰ کھانا پکاتا ہوں۔ مرغ کے گوشت کو میں نے مسالہ لگا کر فرج میں رکھا ہوا ہے۔''

شانتی مسکرائی۔

''اگر آپ کو بہت بھوک لگی ہے تو میرے اپارٹمنٹ میں چلیں..... میں یہاں سے بہت نزدیک شریڈن روڈ پر رہتی ہوں۔ میں نے اپنی دوست تھما سے تھائی کھانے کا طریقہ سیکھا ہے۔ لیکن گوشت نہیں ملے گا۔''

''چلئے یہ تو اور بھی اچھی بات ہے.....''

''آپ گاڑی لے کر میرے پیچھے آئیں۔''

ایک اُونچی عمارت میں پچیسویں منزل پر شانتی کا پانچ کمروں والا کشادہ اپارٹمنٹ تھا۔

ڈرائنگ روم میں قیمتی سرخ ایرانی قالین بچھا ہوا تھا کالے چمڑے کے صوفے رکھے تھے۔ کھڑکیوں سے جھیل دکھائی دیتی تھی۔ دیواروں کا رنگ سفیدی مائل تھا اور اُسی رنگ کے بھاری پردے اُونچی اُونچی کھڑکیوں پر نیم وا لٹک رہے تھے دیواروں پر مہاتما بدھ کی تصاویر آویزاں تھیں جو اُس کی زندگی کے مختلف واقعات کو پیش کرتی تھیں۔

''آپ بیٹھیں میں ابھی آتی ہوں۔''

تھوڑی دیر بعد وہ چینی طرز کا سرمئی رنگ کا جھلملاتا پاجامہ اور قمیض پہن کر آئی جس سے اُس کا سڈول بدن پوری طرح عیاں ہو رہا تھا۔ اِس نظارے سے اُس کے بدن میں سنسنی پھیل گئی۔

''میں پندرہ منٹ میں کھانا بناتی ہوں۔ سبزیاں کٹی ہوئی ہیں اور چاول بھیگے ہوئے ہیں۔''

''ٹھیک ہے میں انتظار کرتا ہوں۔ آپ اطمینان سے پکائیں۔''

اچانک اُس کی نظر کارنس پر پڑی جس کے درمیان بدھ کے اُوپر کے دھڑ کا مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ وہ اُٹھ کر قریب گیا اور غور سے معائنہ کرنے لگا یہ گندھارا تہذیب کے فنِ اصنام سازی کا ایک نادر نمونہ تھا۔

''ارے بھئی ..... یہ مجسمہ کہاں سے آیا''

''سوات ..... پاکستان سے۔''

''یہ اصلی ہے!''

''نہیں ..... یہ اصلی نہیں۔''

''آپ نے اصلی سمجھ کر خریدا۔''

''جی ہاں ..... اِس کے پیچھے ایک کہانی ہے۔ جو آپ کو بعد میں سناؤں گی۔''

پندرہ منٹ بعد شانتی نے آواز دی۔

''کھانا تیار ہے ..... میز پر آجایئے۔''

میز پر دو پلیٹیں اور ساتھ ہی کاغذی رومال پر چمچے اور کانٹے رکھے تھے وہ ایک پلیٹ کے سامنے بیٹھ گیا۔ شانتی بھاپ اُڑاتی سبزی کی پلیٹیں اُٹھا کر لائی ایک اُس کے سامنے رکھی اور دوسری اپنے سامنے۔ دوسری دفعہ ایک کانچ کے پیالے میں چاول لے کر آئی۔

''شروع کریں ..... ہر قسم کی چٹنیاں یہاں موجود ہیں'' اُس نے گھومنے والی ٹرے کی طرف اشارہ کیا جو میز کے درمیان رکھی تھی۔

فضا میں اُدرک لہسن اور تازہ اُبلی ہوئی سبزیوں کی خوشبو پھیل گئی۔

ہارون نے لکڑی کے چمچے سے اپنی پلیٹ میں ایک طرف چاول لے پھر مرچوں سوئے کی چٹنی اور سرکہ ڈالا۔ سب کو خوب ملایا اور ایک بڑی چمچ بھر کر منہ میں ڈالی۔

''واہ کیا لذیذ کھانا ہے ..... آپ تو بڑی ماہر معلوم ہوتی ہیں۔''

''بس گذارہ کرتی ہوں۔''

کھانے کے بعد وہ صوفے پر آ کر بیٹھ گیا اور شانتی برتن جمع کر کے باورچی خانہ میں لے گئی چند منٹوں بعد وہ گرم چائے کے دو پیالے لے کر آئی۔

''میں نے صرف ایک چمچ چینی ڈالی ہے۔''

''شکریہ! اب مجسمے کی کہانی سنائیں۔''

''یہ کہانی نہیں جناب حقیقت ہے۔''

''تو پھر حقیقت سنایئے۔''

''اسلام آباد سے جب میں نیویارک کے لئے ہوائی جہاز پر سوار ہونے لگی تو مجھے کسٹم والوں نے روک لیا۔ میں پاکستان میں گندھارا تہذیب کے سب سے مکمل کھنڈر تخت بائی کے بارے میں ایک دستاویزی فلم بنانے کے لئے انتظامات کرنے گئی تھی۔

ایک کسٹم افسر نے کہا ''محترمہ آپ کے سامان میں بدھ کا ایک مجسمہ ہے۔ پاکستان کے قانون کے مطابق تاریخی اہمیت کے آثار ملک سے باہر لے جانا جرم ہے۔''

''اُس مجسمے کی قیمت میں نے پانچ سو ڈالر ادا کی ہے۔''

''آپ نے پانچ سو ڈالر دیئے ہوں گے لیکن قانون کے مطابق آپ یہ مجسمہ نہیں لے جاسکتیں۔''

''اب میں کیا کروں۔''

''ہم یہ مجسمہ ایک آدمی کے ذریعہ ٹیکسلا عجائب گھر کے ڈائریکٹر کے پاس بھیجیں گے اگر اصلی ہوا تو ہم ضبط کرلیں گے اور اگر نقلی ہوا تو آپ کو دو دن بعد واپس مل جائے گا۔ ہمیں افسوس ہے کہ اس قانونی غلطی کی وجہ سے آپ کو سفر ملتوی کرنا پڑے گا۔''

میں مجبوراً رُک گئی جب تیسرے دن کسٹم کے دفتر گئی تو اُنہوں نے مجسمہ واپس کر دیا اور کہا کہ نقلی ہے۔ اب مجھے واقعی غصہ آیا میں واپس پشاور گئی اور اُس ایجنٹ کو پکڑا جس نے مجھے وہ مجسمہ دلوایا تھا۔ ایجنٹ مجھے لے کر سوات گیا۔ مینگورہ شہر کے قریب ہم ایک کچے راستے پر پیدل چل کر ایک پرانی طرز کے پتھروں کے دروازے پر پہنچے۔ پہلے تو دروازہ کھٹکھٹانے پر کوئی اندر سے نہیں بولا لیکن جب ایجنٹ مسلسل دروازہ کھٹکھٹاتا رہا تو کسی نے گھر کے اُوپر جو مچان بنی تھی اُس کی دیوار میں ایک سوراخ تھا وہاں سے جھانکا پھر دروازہ کھل گیا۔ ایک پچاس سال کا آدمی باہر نکلا اُس نے ایجنٹ سے ہاتھ ملایا۔ مجھے سلام کیا اور ہمیں اندر لے گیا۔ یہ ایک مستطیل کمرہ تھا جس کی دیواروں کے ساتھ لکڑی کی الماریاں تھیں جن میں بدھ کے مختلف جسامت کے مجسمے رکھے تھے۔ پورا ایک بدھ کا میوزیم تھا میں حیران ہو کر اُن مجسموں کو دیکھنے لگی۔ ایجنٹ نے پشتو زبان میں اُس آدمی سے بات چیت کی اور پھر مجھ سے کہا 'یہ آدمی رقم آپ کو واپس نہیں کر سکتا اُس نے سردیوں کے لئے سودا سلف اُس رقم سے خرید لیا ہے۔ سردیوں میں برف باری کی وجہ سے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ سب لوگ خوراک پہلے سے خرید کر رکھ لیتے ہیں ..... لیکن بدھ کے دو تین مجسمے بغیر قیمت کے لے جا سکتی ہیں لیکن آپ کو یہ بات راز میں رکھنی ہوگی کہ یہ مجسمے اس آدمی یعنی احمد خان نے بنائے ہیں۔ اِس علاقے میں بہت سے جاہل اور جنونی لوگ آباد ہیں اگر اُن کو معلوم ہو جائے یہ آدمی مجسمے بناتا ہے تو اُس کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ اُن کے

بُز دیک بت تراشی ایک کفرانہ فعل ہے۔" میں نے تین مجسمے اُٹھائے اور واپس آ گئی..... وہ شخص بہت بڑا فن کار تھا اُس کے تراشے ہوئے مجسمے اصلی مجسموں کے ساتھ رکھیں تو یہ پہچاننا مشکل ہو جائے گا کہ اصلی کونسا ہے۔"

"آپ نے اُس آدمی سے پوچھا کہ یہ فن اُس نے کہاں سے سیکھا۔"

"میرا یہ خیال تھا کہ اُس نے بھارت جا کر کسی ہندو بت تراش سے یہ فن سیکھا ہو گا..... لیکن میں حیران رہ گئی جب اُس نے کہا کہ اُس نے یہ فن اپنے باپ سے سیکھا ہے۔"

"حیرانی کی بات ہے سیاحوں کی آمد تو ابھی بیس تیس سال ہوئے شروع ہوئی اُس سے قبل یہ لوگ مجسمے کہاں فروخت کرتے ہوں گے۔ اسلام کو اِس علاقہ میں سات سو سال ہو چلے ہیں۔ اسلام ہر قسم کی بت پرستی کے خلاف ہے پھر اتنا طویل عرصہ کس طرح بت تراشی کا فن زندہ رہا۔"

"واقعی اتنا عرصہ کسی فن کا ناموافق حالات میں زندہ رہنا ناممکن ہے۔ یہ تحقیقاتی مطالعے کا زبردست موضوع ہے" شانتی نے کہا۔

"آپ اس موضوع پر تحقیقات کر کے دستاویزی فلمیں کیوں نہیں بناتی ہیں۔"

"میں اشوک صاحب سے بات کروں گی۔"

"کیا آپ نے تخت بائی کے بارے میں فلم بنائی تھی۔"

"میں نے اُس میں بدھ دیوداسی کا کردار ادا کیا۔"

"بہت خوب..... وہ فلم آپ کے پاس وڈیو ٹیپ پر موجود ہے۔"

"نہیں..... ابھی وہ سٹوڈیو کے ٹیپ پر ہے..... آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو ہم کسی دن ٹیلی ویژن سنٹر میں جا کر دیکھ لیں گے۔"

"جس دن آپ فارغ ہوں..... مجھے فون کریں میں ٹیلی ویژن آ جاؤں گا۔"

رخصت ہوتے وقت اُس نے شانتی کو گلے سے لگایا اور عجیب سا جوش آیا اُس نے شانتی کو زور سے بھینچا پھر اُس کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیئے اُس نے دونوں ہاتھ ہارون کی چھاتی پر رکھ کر پورے زور سے دھکا دیا وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ شانتی زور زور سے سانس لینے لگی۔ لگا کہ ابھی گرے گی۔ ہارون اُس کو سنبھالنے کے لئے آگے بڑھا تو پیچھے ہٹنے لگی اور آخر صوفے پر گر گئی۔ تھوڑی دیر بعد آہستہ سے اٹھی اور فرج سے پانی کی بوتل نکال کر غٹا غٹ پی گئی۔

"کیا ہوا آپ کو۔"

شانتی نے غصے سے ہارون کی طرف دیکھا۔

"آپ کو اپنے آپ پر کوئی قابو نہیں ہے۔ جوش میں آ کر مجھے اِس طرح بھینچا کہ میں سمجھی کہ ابھی میرا دم نکل..... جائے گا۔ مجھے جانوروں کی طرح لاڈ پیار کرنے کا طریقہ پسند نہیں۔ اب آپ تشریف لے جائیں۔ رات بہت ہو چکی ہے اور مجھے صبح سویرے ٹیلی ویژن سنٹر پہنچنا ہے۔"

"بخدا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ آپ کو کوئی تکلیف پہنچے۔"

"مجھے آپ کا ارادہ معلوم ہے..... بس اب آپ تشریف لے جائیں۔"

اُس کے باہر نکلتے ہی شانتی نے سٹکنی لگا دی۔

دو ہفتے تک اُس نے کوشش کی کہ اپنے جذبات کو اپنے آپ سے چھپا رکھے۔ جب اُس نے محسوس کیا کہ اُس نے اپنی خواہشوں پر قابو پا لیا ہے تو اُسے اطمینان ہو گیا لیکن غیر شعوری طور پر اُس کی انگلیاں ٹیلی فون کے ہندسوں پر دوڑنے لگیں۔ دوسری طرف سے ایک سریلی مترنم آواز آئی اور اُس کا دل سینوں سے کھنچنے لگا۔

"شانتی..... اُدم اُدم"

وہ گھبرا گیا اور کچھ بول نہ سکا۔

"شانتی بول رہی ہوں..... کون ہے بھئی۔"

"میں..... میں..... ہارون بول رہا ہوں۔"

"ہائے..... کدھر ہیں آپ..... میں بہت دنوں سے آپ کے فون کا انتظار کر رہی ہوں۔"

"آپ نے مجھے فون کیا ہوتا۔"

"میرے پاس آپ کا نمبر نہیں ہے۔"

"اوہ..... مجھے معاف کریں..... میرا خیال تھا کہ آپ کے پاس میرا فون نمبر موجود ہے۔"

"آپ کل شام فارغ ہیں۔"

"بالکل فارغ ہوں۔"

"اشوک صاحب نے بامیان افغانستان کے بارے میں اپنی دستاویزی فلم مکمل کر لی ہے۔ وہ خاص خاص لوگوں کے لئے اپنے گھر میں اُس فلم کی نمائش کر رہے ہیں۔ اُن کی بڑی خواہش ہے کہ آپ بھی وہ فلم دیکھیں۔"

"لیکن مجھے تو اشوک صاحب کی رہائش گاہ معلوم نہیں۔"

"آپ اُس کی فکر نہ کریں۔ کل ٹھیک چار بجے میرے اپارٹمنٹ میں آ جائیں میں آپ کو وہاں لے چلوں گی۔"

"بہت خوب۔"

دوسری شام پہلی گھنٹی پر شانتی اپنے اپارٹمنٹ سے نیچے آ گئی۔ اُس نے ڈھیلا ڈھالا لباس پہنا ہوا تھا وہ بہت سنجیدہ لگ رہی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اُسے دیکھ کر خوش نہیں ہوئی۔

لیک شور ڈرائیو سے وہ لنکن پارک کی سڑک پر مڑے اور وہاں سے گولڈ کوسٹ کے علاقے میں آئے جس کے سامنے مشی گن جھیل تھی۔ اشوک کا اپارٹمنٹ ایک بڑی شاندار اور اونچی عمارت میں تھا۔ نیچے لابی میں باوردی چوکیدار مہمان کو راہ دکھا رہا تھا اور ایلویٹر کھول کر اُن کو سوار کروا رہا تھا۔ اشوک کا اپارٹمنٹ ساتویں منزل پر تھا۔ بڑا کشادہ اور روشن..... کھڑکیاں جھیل کی جانب کھلتی تھیں۔ ڈرائنگ روم سے ساز و سامان ہٹا دیا گیا تھا اور کرسیاں بچھا دی گئی تھیں۔ کرسیوں کے سامنے ایک سٹیج بنایا گیا تھا اور درمیان میں ایک میز پر ایک بڑی سکرین کا ٹی وی رکھا ہوا تھا۔

"آپ کی آمد کا شکریہ" ہارون سے ہاتھ ملایا اور شانتی کے رخسار پر بوسہ دیا۔ وہ طعام خانے میں گئے اور اپنی پلیٹیں سبزی چاول اور سلاد سے بھر لیں اور دیوار کے ساتھ بیٹھ گئے۔ شانتی لوگوں سے گفتگو کرتی رہی اور کھانا بھی کھاتی

تھی۔ وہ اُکتا کر کھڑکیوں سے باہر دیکھنے لگا۔ جھیل سے اُس پار کئی آبادیاں ستاروں کی بستیاں معلوم ہوتی تھیں۔

اشوک نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی اور پھر ٹیلی ویژن کے سامنے جا کر کھڑا ہوا "خواتین اور حضرات اگر آپ لوگ کرسیوں پر تشریف رکھیں تو پھر ہم فلم دکھائیں۔"

لوگ کرسیوں پر بیٹھنے لگے اور تھوڑی دیر میں خاموشی چھا گئی۔

"سب سے پہلے میں آپ لوگوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ میرے غریب خانہ پر تشریف لائے۔ افغانستان کی موجودہ حکومت طالبان نے دھمکی دی ہے کہ وہ دنیا کے سب سے بڑے کھڑے مہاتما بدھ کے دو مجسمے تباہ کر دیں گے۔ میں نے یہ دستاویزی فلم طالبان کے اقتدار میں آنے سے قبل بنائی تھی۔ اس فلم کا کچھ حصہ تھائی لینڈ میں بھی فلم بند کیا گیا ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ کمپیوٹر کی مدد سے فلم کی اِس طرح تدوین کروں کہ کوہ بابا افغانستان کی غاروں میں ہزاروں سال پرانی زندگی کی تصاویر پیش کر سکوں۔ یہ آپ بتائیں کہ میں اِس تکنیک میں کتنا کامیاب ہوا ہوں۔ ایک تخمینہ کے مطابق کوہ بابا میں بیس چھوٹی بڑی غاریں ہیں جو رہائش، عبادت، مدرسہ اور جلسوں کے لئے استعمال ہوتی تھیں۔ آپ ذرا اس بات کو تصور میں لائیں کہ اُن بدھ بھکشوں کو اپنے مذہب سے کتنی محبت تھی جنہوں نے وہ بیس ہزار غاریں کھودیں ہیں۔ بامیان اُس زمانے میں بدھ تہذیب کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ وہ اُس شاہراہ ریشم پر واقع تھا جو وسطی ایشیا سے ہندوستان کو جاتی تھی۔ یہ دستاویزی فلم ساری دنیا میں نمائش کے لیے پیش کی جائے گی تا کہ بین الاقوامی طور پر طالبان کی حکومت پر دباؤ ڈالا جائے کہ وہ مہاتما بدھ کے مجسموں کو نقصان نہ پہنچائیں۔ آج میں نے ٹیلی ویژن کی صنعت سے وابستہ بہت سے بڑے لوگوں کو یہاں مدعو کیا ہے کہ وہ اِس کام میں میری مدد کریں۔"

چند منٹوں بعد سکرین روشن ہوئی۔ بامیان لکھا ہوا آیا اُس کے بعد دنیا کا نقشہ جو افغانستان کے نقشے میں ڈھل گیا۔ پہاڑوں کا ایک لامتناہی سلسلہ اور کیمرہ دو بڑے بدھ کے مجسموں پر آ کر ٹھہرا اور باری باری اُن کو قریب سے دکھایا۔ ایک مجسمہ کی ناک ذرا ٹوٹی ہوئی تھی۔ پس منظر میں وچتر وینا کے ساز کی مدھر دھن کے ساتھ مہاتما بدھ کی تعریف و توصیف میں سنسکرت زبان میں مناجات گائی جا رہی تھیں۔

ایک کے بعد دوسری غار سکرین پر آئی۔ تبصرہ نگار نے کہا کہ ایک تخمینہ کے مطابق کوہ بابا میں بیس ہزار سے زیادہ غاریں دریافت ہوئی ہیں۔ جن کو پرانی طرز کے ہتھیاروں اور چھینی سے پہاڑ کاٹ کر بنایا گیا تھا۔

یہ سخت محنت کا کام اُن بدھ بھکشوں نے کیا تھا جنہوں نے اپنی زندگی بدھ کی تعلیمات پھیلانے میں صرف کر دی تھی۔ اب ہم آپ کو پندرہ سو سال پیچھے لے جاتے ہیں اور اُن غاروں میں زندگی کی جھلکیاں دکھاتے ہیں۔"

ایک گولا پھٹا سکرین دھواں دھار ہو گئی اور جب اُس بدھ بھکشوں کی تصاویر آہستہ آہستہ نمودار ہونے لگیں جو مختلف مذہبی کاموں میں مصروف تھے ایک بڑے غار میں ایک بوڑھا بھکشو مہاتما بدھ کی زندگی کی کہانی بیان کر رہا تھا۔ اُس کے سامنے کوئی تیس کے قریب طالب علم زمین پر بچھی دری پر براجمان نہایت انہماک سے وہ کہانی سن رہے تھے۔ دوسرے غار میں جو پہلی سے کم کشادہ تھی۔ ایک نوجوان استاد بچوں کو پڑھا رہا تھا۔ تیسری غار میں ایک کسرتی بدن اور مضبوط پٹھوں والا آدمی بغیر کسی ہتھیار کے دفاع کا فن سکھا رہا تھا۔

آخر میں تبصرہ نگار نے تبت، لداخ، چین، جاپان، تھائی لینڈ اور جنوبی چین کے نقشے دکھا کر کہا کہ بدھ مت بامیان کے مرکز سے مذکورہ ممالک میں پھیلا۔ تبصرہ نگار نے آخر میں بدھ کی مختلف مورتیاں دکھا کر بدھ مت کے فلسفے کو آسان زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی۔

فلم کے اختتام پر سب لوگوں نے زور زور سے تالیاں بجائیں اور بڑھ کر اشوک کو گھیر لیا۔ ٹیلی ویژن کمپنی کے ایک افسر نے کہا۔

"واہ..... کیا خوبصورت دستاویزی فلم آپ نے بنائی ہے۔"

"شکریہ! میں ٹیلی ویژن کمپنیوں کو یہ فلم بغیر کسی معاوضہ کے پیش کروں گا۔"

"ہم آپ کو معاوضہ ضرور دیں گے..... آپ کو نہیں۔ آپ کے ادارے کو تا کہ آپ ایسی مفید فلمیں بناتے رہیں۔"

"بہت بہت شکریہ!"

بھیڑ کم ہوئی تو ہارون اشوک کے پاس گیا۔ اُس نے دیکھا کہ شانتی اُس کے پیچھے کھڑی ہے اور اشوک کو پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی ہے اچانک اُس پر انکشاف ہوا کہ شانتی اشوک سے محبت کرتی ہے اور اُسے شانتی کی محبت کا علم نہیں یا وہ جان بوجھ کر اُس کے جذبہ محبت کا اعتراف نہیں کر رہا تھا کیونکہ اُسے دوسری عورتوں سے ترک تعلق کرنا پڑے گا۔

"مبارک ہو..... آپ نے کمال کی فلم بنائی" ہارون نے کہا۔

"شکریہ۔"

"مبارکباد قبول کریں" شانتی آگے بڑھی اُس کی آواز لرزنے لگی۔ اُس کا رنگ پیلا پڑ گیا اور وہ تیورا کر گرنے لگی اشوک نے اُسے شانوں سے پکڑ کر سنبھال لیا۔

"معاف کیجئے گا" وہ سنبھل کر کھڑی ہوگئی "جانے مجھے کیا ہو گیا ہے۔"

"شانتی مجھے بے حد عزیز ہے۔ یہ فلم میری نہیں شانتی کی بھی ہے" اُس نے میری طرف دیکھا "میں چاہتا تھا کہ شانتی کا نام میرے نام سے پہلے آئے لیکن وہ راضی نہ ہوئی تو میں نے اُس کا نام مددگار ہدایت کار کے طور پر لکھ دیا فلم کو ایڈیٹ Edite شانتی نے کیا۔"

اشوک کو کچھ اور لوگوں نے آ گھیرا تو وہ پیچھے ہٹ گیا۔ شانتی اُس کے پاس آ کھڑی ہوئی وہ خود بخود صدر دروازے کی طرف بڑھنے لگا اور باہر نکل آیا۔ وہ اُداس تھا اشوک کا خیال کر کے اُسے غصہ بھی آ رہا تھا۔ اُس نے عورتوں کو ایک غیر مرئی طاقت کے ذریعے قابو کیا ہوا تھا اور اسی طرح شانتی کو بھی کسی طلسم میں پھنسایا ہوا تھا۔

دستاویزی فلم "بامیان" امریکہ، یورپ اور پھر ایشیا کے کئی ملکوں پر دکھائی گئی۔ عوام اور خواص دونوں نے پسند کی۔ شکاگو ٹیلی ویژن نے اِس دستاویزی فلم کی کامیابی کے سلسلہ میں ایک بڑی شاندار دعوت کا انتظام ڈاؤن

ٹاؤن ہلٹن میں کیا۔ شانتی نے اُسے دعوت نامہ بھیجا۔ جب وہ ہلٹن ہوٹل کے بڑے ہال میں داخل ہوا تو لوگوں کا ہجوم دیکھ کر بے حد متاثر ہوا۔ شکاگو کی اعلیٰ سوسائٹی کے سارے چیدہ چیدہ لوگ وہاں موجود تھے۔

مرد انگریزی اور اطالوی طرز کے سلے ہوئے سوٹوں میں ملبوس تھے۔ عورتوں نے فرانسیسی ڈیزائنرز کے بنائے ہوئے لباس پہنے تھے۔ عورتوں کے بدنوں سے اُٹھتی ہوئی خوشبویات نے ماحول کو معطر کیا ہوا تھا۔ اُن کے نقرئی قہقہے ہر طرف جھنجھنا رہے تھے۔ اس چکا چوند ماحول میں شانتی کو تلاش کرنا بڑا مشکل تھا۔ اچانک اُسے فیشن ایبل عورتوں کے ایک گروہ کے درمیان سنہری گھونگھریالے بال جھولتے نظر آئے۔ اُس لڑکی نے کالا جھلملاتا ریشمی لباس پہن رکھا تھا۔ اُس کے سڈول بدن کے زاویوں اور اُبھاروں کو اُجاگر کر دیا تھا۔ شانے اور بازو عریاں تھے۔ لباس کو اُٹھی ہوئی مدور چھاتیوں نے گرنے سے روک رکھا تھا۔ جب اُس نے رُخ پھیرا تو اُسے لگا کہ وہ شانتی ہے۔ وہ تو بدرنگ ساڑھیاں اور ڈھیلے ڈھالے خراب سلے ہوئے کپڑے پہننے والی لڑکی ہے۔ یہ حسینہ نازنین تو کوئی ہالی وڈ کی ایکٹریس ہے یا کوئی فیشن ماڈل.....

لیکن جب اُس چہرے پر مسکراہٹ پھیلی اور نیلی آنکھوں میں چمک آئی اور وہ لچکیلا بدن لہراتا ہوا اُس کی طرف لپکا تو اُسے یقین ہو گیا کہ وہ شانتی ہے۔ اُس نے اپنی جون بدل لی تھی۔ ایک لمحہ کے لئے اُسے صدمہ ہوا کہ یہ..... ہار سنگھار اُس کے لئے نہیں تھا۔ جب اُس نے شانتی کا سپید مخروطی ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا۔ تو اُس کے بدن میں ایک بجلی سی دوڑ گئی اُسے لگا کہ وہ ہاتھ ہی نہیں بلکہ وہ دلفریب بدن بھی اُس کا ہے۔

''اُف میرے خدا..... یہ آپ ہیں تو آپ پہ قربان جایئے..... شکریہ کہ آپ نے وہ بدرنگ ساڑھی نہیں پہنی..... آئندہ آپ کوئی ساڑھی واڑھی نہیں پہنیں گے..... ہاں جی۔''

شانتی زور سے ہنسی جیسے فضا میں نغمے بکھر گئے۔

''آپ تو بات سے بات بناتے ہیں۔''

''بخدا سچ کہتا ہوں..... آپ نے تو ساڑھی والے لباس میں اپنی شخصیت کو مسخ کر دیا تھا۔''

''آیئے..... آیئے..... میں آپ کو اپنی دوستوں سے ملواؤں۔''

شانتی اُسے ہاتھ سے پکڑ کر عورتوں کے گروہ میں لے آئی۔

''یہ جناب ہارون صاحب ہیں میرے عزیز دوست ہیں اور یہ جو دستاویزی فلم میں بامیان کا علاقہ دکھایا گیا ہے اُس سے قریباً دو سو میل دور پشاور میں رہتے ہیں جو پاکستان کا افغانستان کی سرحد کے پاس سب سے بڑا شہر ہے۔''

''واہ..... آپ بھی بدھ مذہب سے تعلق رکھتے ہیں'' ایک نوجوان عورت نے پوچھا۔

''نہیں یہ مسلمان ہیں'' شانتی نے کہا۔

''آپ کو بامیان میں ایک بھی بدھ مت کا پیروکار نہیں ملے گا'' ہارون نے کہا۔

''وہاں کیا واقعہ پیش آیا'' ایک دوسری عورت نے پوچھا۔

''آپ جیسی خوبصورت عورتوں نے سب بدھ مت کے ماننے والوں کو ہلاک کر دیا'' سب نے قہقہہ لگایا۔

''آپ لوگ مجھے اجازت دیں تا کہ میں ہارون صاحب کو ٹیلی ویژن کے افسروں سے ملوا دوں۔''

''یاد رہے تو ہارون صاحب کو واپس لے آئیں'' نوجوان عورت نے کہا جو ہارون کو بہت شوخ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

''میں ان کو ضرور واپس لے آؤں گی..... آپ غم نہ کریں۔''

اُس نے ہارون کو بہت سے لوگوں سے متعارف کرایا جن میں ٹیلی ویژن کے چند افسر بھی تھے۔ سارے لوگ شانتی میں دلچسپی لے رہے تھے اُس سے سرسری بات کر کے آپس میں باتیں کرنے لگتے۔ آخر وہ اشوک کے گروہ کے پاس پہنچے اُسے بہت سی عورتوں اور مردوں نے گھیر رکھا تھا۔

آج اشوک نے بدھ بھکشوں کا لباس نہیں پہنا ہوا تھا۔ وہ کالے سوٹ، سفید قمیض اور قرمزی رنگ کی ٹائی میں بہت بھلا لگ رہا تھا۔ اُس کی آواز میں ایک طرح کا اعتماد تھا۔ اُسے بہت سے لوگوں نے گھیرا ہوا تھا۔

''اس دستاویزی فلم کے بعد آپ کون سے منصوبہ پر کام کر رہے ہیں'' ایک عورت نے پوچھا۔

''ٹیکسلا..... بدھ تہذیب کی قدیم یونیورسٹیوں میں سے ایک ہے۔ اتفاق سے اُس علاقہ سے تعلق رکھنے والے ایک صاحب یہاں موجود ہیں..... جناب ہارون'' اُس نے ہارون کی طرف اشارہ کیا۔ سارے لوگ اُسے دیکھنے لگے۔

''ان کی وہاں بہت جان پہچان ہے اور یہ ہماری پوری مدد کریں گے۔''

شانتی نے آگے بڑھ کر اشوک کے کان میں سرگوشی کی۔ اُس نے شانتی کا بازو پکڑا۔

''معاف کیجئے گا'' اُس نے کہا'' مجھے شانتی سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ ابھی حاضر ہوتا ہوں۔''

اشوک شانتی کے بازو میں اپنا بازو ڈالے ایک اندھیرے گوشے میں کھڑے ہو کر آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ عورتوں نے اُن دونوں کو گھور کر دیکھا اور پھر آپس میں باتیں کرنے لگیں۔ مردوں نے اپنا الگ گروہ بنا لیا۔ ہارون وہاں چند منٹ اُلو بن کر کھڑا رہا پھر اُس نے گھر جانے کا ارادہ کیا کہ ہوٹل کے ایک خادم نے آ کر بتایا کہ کھانا تیار ہے اور ساتھ کے کمرے میں لگ چکا ہے وہ کھانے کے کمرے میں داخل ہوا۔ اُس نے سوچا کہ اگر اُبلی ہوئی سبزیاں ہی نظر آئیں تو وہ کھانا نہیں کھائے گا۔ سبزیاں کھاتے کھاتے زندگی حرام ہو گئی تھی لیکن یہ دیکھ کر اُسے خوشی ہوئی کہ وہاں وافر تعداد میں مرغ اور گائے کا بھنا ہوا گوشت موجود تھا اُس نے اپنی پلیٹ کے ایک طرف مرغ اور دوسری طرف گوشت کی بوٹیاں ڈالیں اور پلیٹ کر کوئی بیٹھنے کی جگہ تلاش کرنے لگا کہ ایک آواز نے اُسے چونکا دیا۔

''لگتا ہے آپ بہت بھوکے ہیں۔''

وہ نوجوان عورت جو اُسے شوخ نظروں سے دیکھ رہی تھی اُس کے

پاس کھڑی تھی۔

"میں بھوکا نہیں ہوں..... لیکن میں نے ایک زمانے بعد کسی دعوت میں اتنے مرغ اور کھانے کے کھانے دیکھے ہیں۔ جدھر جاؤ سبزی..... اس سے پہلے کہ گوشت غائب ہو جائے میں نے سوچا اپنی پلیٹ بھر لوں۔"

"تو آپ گوشت خور ہیں..... بدھ مت کے پیروکار تو گوشت نہیں کھاتے۔"

"شانتی سے میری دوستی ہے لیکن میں بدھ نہیں ہوں اور گوشت بھی کھاتا ہوں۔"

"میں بھی سبزی خور نہیں ہوں..... میری پلیٹ میں بھی اپنی پسند کا گوشت ڈال دیں۔"

وہ بڑے دلربایانہ انداز سے مسکرائی۔ ہارون نے اُس کی پلیٹ میں گوشت اور مرغے کی بوٹیاں ڈالیں اور ساتھ سلاد بھی رکھ دیا۔

"چلئے وہ سامنے چند کرسیاں رکھی ہیں وہاں چل کر بیٹھتے ہیں" عورت نے کہا۔

"مجھے امریکی کھانا بالکل پسند نہیں..... نہ نمک نہ مرچ بدذائقہ" ہارون نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا اور اُس پر ایک بھرپور نظر ڈالی۔

اُس نے دوسروں کو قتل کرنے کے لیے لباس پہنا ہوا تھا۔ دو ریشم کی کالی ڈوریاں کمر سے آ کر شانوں سے گذر کر دو بھری بھری چھاتیوں کے اُوپر باقی بلاؤز کو پکڑے ہوئے تھیں۔ اُس کے سڈول عریاں شانے اور بازو بڑے دلکش لگ رہے تھے اُس کے ہونٹوں پر ایک شریر مسکراہٹ اور آنکھوں میں سختی تھی۔

ہارون نے چند لقمے لیے اور پھر پلیٹ میز کے نیچے رکھ دی۔ اُس عورت نے ابھی تک پلیٹ کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

"سگریٹ اور کھانے کی بو سے میرا دم گھٹنے لگا ہے چلئے کہیں باہر چلتے ہیں" عورت نے کہا۔

"معاف کیجئے گا۔ مجھے صبح کام کرنا ہے۔"

"صبح تو اتوار ہے۔ چھٹی ہے۔"

"مجھے کبھی کبھی چھٹی کے دن بھی کام کرنا پڑتا ہے۔"

اُس عورت نے معنی خیز نظروں سے اُس کی طرف دیکھا اور سنجیدہ لہجے سے کہا "شانتی آپ کے پاس واپس نہیں آئے گی وہ اُس گنجے ٹیلی ویژن ڈائریکٹر کے گرد اُس وقت تک منڈلاتی رہے گی جب تک وہ اُسے گھر لے جا کر اُس کے بدن سے اپنی ہوس کی آگ نہ بجھا لے..... اگر اُسے رات گذارنے کے لیے کسی ٹیلی ویژن افسر کی بڈھی بیوی نہیں ملتی تب وہ شانتی کے ساتھ رات گذارے گا۔ اُسے جو اتنی ترقی ملی ہے اُس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اُس نے ٹیلی ویژن کے افسروں کی بیویوں کو ہمیشہ خوش رکھا ہے۔"

"آپ یہ کیسی باتیں کرتی ہیں۔ محض جھوٹے الزام لگا رہی ہیں۔ شاید شانتی کی مقبولیت سے آپ حسد کرتی ہیں۔"

"میں ایک وکیل ہوں اور اُس ٹیلی ویژن میں قانونی اُمور دیکھتی ہوں جہاں شانتی کام کرتی ہے۔ اُس نے اپنے آپ کو اُس گنجے ڈائریکٹر کے پیچھے ذلیل و خوار کیا ہوا ہے۔ وہ سارے ٹیلی ویژن سنٹر میں مذاق کا نشانہ بنی ہوئی ہے۔"

ہارون کو ایسا لگا کہ کسی نے اُس کے دل میں خنجر گھونپ دیا ہے اُس کے گلے میں نوالہ پھنس گیا اور یوں محسوس ہوا کہ دم گھٹ کر ابھی مر جائے گا۔ اُس کی آنکھیں باہر نکل آئیں اور چہرہ سوج گیا اُس عورت نے اُس کی کیفیت دیکھ کر ایک زور کا مکا اُس کی کمر میں مارا مرغے کی بوٹی منہ سے نکل کر فرش پر گری اور وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ وہ عورت لپک کر گئی اور میز سے پانی کا بھرا ہوا گلاس اُٹھا لائی۔ ہارون نے گلاس لے کر دو تین گھونٹ بھرے اور اُس کا سانس معمول پر آنے لگا۔

"شکریہ..... آپ نے تو میری جان بچائی۔"

"آپ کو تازہ ہوا کی ضرورت ہے۔"

وہ اُسے کلائی سے پکڑ کر راہداری میں لے آئی وہاں ماحول ذرا ٹھنڈا تھا۔

"آپ کی طبیعت خراب ہے۔ میرے ساتھ چلیں" ہارون نے اثبات میں سر ہلایا "میں زیادہ دور نہیں رہتی..... لیک شور ڈرائیو کے پاس پہلی اُونچی عمارت ہے اُس میں رہتی ہوں۔"

اُس عورت نے لفٹ کا بٹن دبایا اور جب وہ گیراج میں پہنچے تو کہا۔

"آپ گاڑی چلا لیں گے۔"

"جی ہاں" اُس نے آہستگی سے جواب دیا۔

"آپ میرے پیچھے آئیں۔"

باہر برف پڑ رہی تھی۔ آسمان سے سفید روئی کے گالے گھومتے ناچتے زمین پر گر رہے تھے۔ برقی سیمابی قمقمے سڑک کے دونوں طرف دھندلا گئے تھے اور زمین پر ایک سفید چادر سی بچھائی جا رہی تھی۔

جب وہ اُس عورت کے اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو یوں محسوس ہوا کہ وہ بادلوں کے دوش پر کسی نامعلوم پراسرار منزل کی طرف رواں ہے۔ نشست کے کمرے کے تینوں طرف ایک قوس کی شکل میں کھڑکیاں تھیں اُن کے باہر برف اب تیزی سے گرنے لگی تھی..... ہر طرف اُداسی اور خاموشی تھی کمرہ نیم گرم تھا اور ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔

اُس عورت نے اُس کا بڑا کوٹ اُتارا پھر چھوٹا..... اور ہاتھ پکڑ کر ایک کمرے میں لے آئی جہاں پہلے سے ہلکی سبز روشنی ہو رہی تھی۔

"آپ اس کمرے میں سوئیں..... میں ابھی دو گولیاں لے کر آتی ہوں۔ آپ کو نیند آ جائے گی..... مجھے افسوس ہے کہ میں نے شانتی کے بارے میں خبر سنا کر آپ کو تکلیف پہنچائی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ کو اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں..... میں خود بھی اس طرح کے ایک جذباتی صدمے سے گذر چکی ہوں۔"

ہارون بستر پر بیٹھ گیا اور خاموشی سے جوتوں کے تسمے کھولنے لگا۔ عورت نے الماری کھول کر ایک پاجامہ اور قمیض لا کر بستر پر رکھی۔

"یہ کپڑے نئے ہیں۔ کسی نے استعمال نہیں کیے۔ آپ کپڑے تبدیل کر لیں میں ابھی چائے اور نیند کی گولیاں لے کر آتی ہوں۔"

اُس نے کپڑے تبدیل کیے اور بستر پر لیٹ گیا۔ ستاروں کی روشنی سے کمرے میں بڑی پراسرار روشنی ہو رہی تھی اور یاسمین کے پھولوں کی ہلکی ہلکی خوشبو آ رہی تھی۔ اُس نے ادھر اُدھر دیکھا لیکن وہاں کوئی پھول نہیں تھے ایسا لگتا تھا کہ گرمی کی جو لہریں مشین سے نکل رہی تھیں اُن کے ساتھ خوشبو بھی آ رہی تھی۔ یہی خوشبو اُس عورت کے بدن سے بھی آتی تھی۔

معطر ہوا کے ساتھ ستار کی دھن بھی سنائی دینے لگی۔ کھڑکیوں کے باہر بادلوں نے کمرے میں اندھیرا سا کر دیا۔ یوں لگا کہ ابھی کوئی پری آنے والی ہے۔ اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور جب دوبارہ کھلیں تو ایک حسین و جمیل پری زاد کمرے میں شیشوں کو پار کر کے آ گئی۔

اُس کا بلوریں بدن عریاں تھا اور سنہری بال ایک بادل کے ٹکڑے کی طرح اُڑ رہا تھا۔ پستانوں کے اُوپر اور رانوں کے درمیان ستارے جگمگ کر رہے تھے۔ وہ اُس کے بدن میں تحلیل ہو گئی اور وہ ایک نامعلوم لذت کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔ وہ ایک غیر مرئی قالین پر ایک دوسرے سے لپٹے کہکشاں کے چمکتے دمکتے راستے پر اُڑتے چلے گئے۔ قندیلوں اور چراغوں کے طوفانوں میں سے گذرتے وہ مسرت و انبساط کے جزیرہ میں اُتر گئے۔

وہ بیدار ہوا تو خواب میں..... وہ بلوریں سڈول بدن اُس کے ساتھ چمٹا ہوا اُس لمس میں ایسا نشہ تھا کہ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا یہ سب کچھ حقیقت ہے یہ لذت بھرا بدن یہ نیم روشن کمرہ یہ شیشوں کے باہر اُڑتے ہوئے بادلوں کے بجرے..... سب ایک اسرار..... ایک طلسم ہے۔

اُس کی بھوک اُس کی ناآسودگی اتنی شدید تھی کہ وہ اُس پری زاد سے جدا ہونا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ایک اور دورا ہے پر کھڑا محسوس کر رہا تھا۔ حیران تھا کون سی حالت حقیقت اور کون سی حالت سحر ہے۔

وہ پری اُس کے وجود کو فنا کر دینا چاہتی تھی وہ اُس کی خودی کو نیست و نابود کر دینے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ وہ اُس کے وجود میں داخل نہیں ہو رہا تھا۔ بلکہ اُس کی خواہش یہ تھی کہ صرف ایک وجود قائم رہے ایک اکائی ہو جائے۔ اُس نے اپنی پوری ذہنی اور جسمانی طاقت سے اُس ذات کے حصار کو توڑنے کی کوشش کی لیکن وہ وقتی طور پر ناکام رہا..... وہ اُس کے وجود پر چھا گئی اب وہ اُس کا غلام تھا۔

لیکن اُس غلامی میں بھی شانتی کا خیال جب آتا تو وہ نینسی کی لذت کی رسی کو کاٹنے کی کوشش کرتا بعض دفعہ وصال کے لمحات میں جب دونوں بدن لذت کی منزل کے بہت قریب ہوتے ہیں تو اُس کے بدن کے سارے تنے ہوئے تار ڈھیلے ہو جاتے اور وہ برف کی سل میں ڈھل جاتا۔

نینسی کو معلوم ہو جاتا کہ اُس کی کیا وجہ ہے وہ اُس کا بدن اپنے گرم گرم نرم ہاتھوں سے سہلاتی اور سرگوشی کرتی ''ہمارے درمیان کوئی تیسری مخلوق آنے کی کوشش کر رہی ہے لیکن میں اُسے آنے نہیں دوں گی۔ تم باور کرو۔ یقین کرو کہ میرے علاوہ تم سے کوئی اتنی محبت نہیں کر سکتا میری محبت بے غرض اور سچی ہے۔''

رفتہ رفتہ اُس کے بدن میں خون دوڑنے لگتا اور ساری طنابیں تن جاتیں اور وہ نینسی کے ساتھ وصال کی منزل کو عبور کر لیتا۔

بعض دفعہ وہ شدید جسمانی خواہش محسوس کرتا لیکن نینسی کے آگے وہ اظہار نہ کر سکتا تو وہ کسی بیسوا کو تلاش کرتا لیکن اکثر وہ تجربہ بڑا ناکام ہوتا۔ نینسی اور شانتی کا وجود اُس کے ذہن میں گڈمڈ ہو جاتا اور اُسے رات بھر نیند نہ آتی۔

ایک رات وہ جب بستر پر کروٹیں بدلنے کے بعد بڑی مشکل سے سویا تو فون کی گھنٹی بجی۔ فون پر شانتی کی آواز آئی وہ گھبراہٹ میں چیخ رہی تھی۔

''خدا کے لئے میرے پاس آ جائیں۔ ایک بڑا المیہ ہو گیا ہے۔''

اُس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات کے دو بجے کا عمل تھا۔

''ابھی آتا ہوں آپ گھبرائیں نہیں۔''

جب وہ شانتی کے اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو وہ دوڑ کر آئی اور ہچکیاں لیتے ہوئے اُس سے لپٹ گئی۔

''پاگل افغانی ملاؤں نے مہاتما بدھ کے مجسمے بامیان میں بارود بھر کر اُڑا دیے۔''

''او میرے خدا..... یہ کیسا پاگل پن ہے۔''

''ہر حکومت اور مذہبی راہنماؤں نے اُن سے درخواست کی وہ ایسا نہ کریں۔ جاپان نے وہ مجسمے خریدنے کی پیشکش کی۔ لیکن اُف پاگل ملاؤں نے کسی کی نہ سنی اور اُن مقدس مجسموں کو تباہ کر دیا۔ یہ پاگل ملا کسی دوسرے کے مذہبی جذبات کا احترام نہیں کرتے۔''

وہ شانتی کو شانوں سے پکڑ کر صوفے پر لے آیا اور رومال سے اُس کی آنکھیں صاف کیں جو مسلسل رونے سے لال ہو گئی تھیں۔

''آپ بالکل صحیح کہتی ہیں یہ لوگ پاگل ہیں اُن کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام کسی مذہب کی عبادت گاہیں اور اُن کے آثار تباہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ افغانستان میں یہ لوگ بڑے بڑے پگڑ باندھ اور داڑھیاں رکھ کر مذہب کے ٹھیکیدار بن گئے عوام کو غلام رکھنے کے لئے مذہب کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ اُن ملاؤں نے افغانستان میں خانہ جنگی شروع کر رکھی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ افغانستان میں قریباً ہزار سال سے مسلمان حکومت کر رہے ہیں لیکن کسی حکمران نے بدھ مت کے مجسمے اور آثار تباہ نہیں کئے۔ آپ کو یہ جان کر حیرانی ہو گی کہ بامیان کے علاقہ کے علاوہ بھی افغانستان بدھ مذہب کے آثار سے بھرا پڑا ہے۔''

''مجھے معلوم ہے..... ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ آپ مسلمان لوگ عورتوں کو بے وقوف کیوں سمجھتے ہیں۔ آپ لوگ اجازت نہیں دیتے کہ وہ مردوں کے شانہ بشانہ زندگی کی پوری ذمہ داریاں قبول کریں۔ آپ لوگوں کو یہ خطرہ ہے کہ اگر مرد اور عورت پیشہ ورانہ طور پر ہی کسی تعلیمی سماجی اور دوسرے اداروں میں اکٹھے کام کریں تو وہ یقیناً جنسی اختلاط کی طرف مائل ہو گا۔ کیا واہیات نظریہ ہے۔''

''طالبان کا اسلام کوئی اسلام نہیں۔ اسلام نے عورتوں کو مساوی حقوق دیئے ہیں۔ بعض حالات میں ان حقوق میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ اس لیے عورتیں جسمانی طور پر مردوں سے کمزور ہیں۔

اقبال ہمارے دور کے بہت بڑے شاعر اور جدید اسلامی نظریات کے مبلغ ہیں۔ انہوں نے عورتوں کی فضیلت کے بارے میں ایک معرکہ آرا نظم

لکھی ہے۔ جس کا ایک شعر یہ ہے۔

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

آگے چل کر اس نظم میں اُنہوں نے اعلان کیا عورت اگرچہ مکالماتِ افلاطون نہ لکھ سکی لیکن اُس کے بطن سے افلاطون پیدا ہوا۔"

"مجھے آپ کے شاعر کے خیالات جان کر بڑی خوشی ہوئی۔ شکر ہے کہ اس طرح کے مفکر آپ کی قوم میں پیدا ہونے لگے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ اُن کے خیالات کو عروج تک پہنچایا جائے۔ ورنہ آج بھی اسلامی ملکوں میں عورت کا استحصال ہو رہا ہے۔ مردوں کو چار شادیاں کرنے کی اجازت ہے۔"

"یہ اسلامی قانون ہے۔ خاص خاص حالات میں مردوں کو ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی اجازت دی گئی۔ اس رسم کا پس منظر یہ ہے۔ میں اسے رسم ہی کہوں گا۔ جنگوں کے دوران جب بہت سے مرد ہلاک ہو گئے تو دوسرے مردوں کو اجازت دی گئی کہ اُن بیواؤں سے شادی کر لیں تا کہ عورتوں کی بسر اوقات کا کوئی ذریعہ پیدا ہو جائے۔ لیکن اس بات کی خاص طور پر ہدایت کی گئی کہ مرد اپنی تمام بیویوں میں سے برابر کا سلوک کرے۔"

"جو ناممکن ہے میرے خیال میں ایسا کوئی اسلامی قانون بھی نہیں بنایا گیا جو عورتوں کے حقوق کی حفاظت کرے۔"

"کچھ اسلامی ممالک نے ایسے قانون بنائے جو اس رسم کو غلط استعمال کرنے سے باز رکھتے ہیں۔ اُن میں پاکستان پیش پیش ہے۔ اُس قانون کے مطابق آپ دوسری شادی اُس وقت نہیں کر سکتے جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے آپ کی بیوی بانجھ ہے یا کسی موذی مرض میں مبتلا ہے اور اُس کی موت یقینی ہے۔"

"شاید یہ قانون زیادہ دیر نہ چل سکا" شانتی نے جواب دیا۔

"قریباً دس سال تک یہ قانون لاگو رہا۔"

"اُس کے بعد جنرل ضیاالحق کی حکومت آئی اُس نے حدود والا قانون نافذ کیا اور اُس کے تحت ہزاروں بے گناہ عورتوں کو قید خانہ میں ڈال دیا گیا۔ جنرل ضیاء کے بعد بھی یہ قانون کسی نہ کسی صورت میں جاری ہے۔ پاکستان کی پولیس آج بھی اس قانون کی آڑ میں عورتوں پر ظلم و ستم کر رہی ہے۔ صرف عورتوں کو بدکاری کی سزا دی جاتی ہے مردوں کو نہیں۔"

"یہ قانون اسلامی نہیں۔ افغانستان میں طالبان کی حکومت جنرل ضیاالحق کی پیداوار ہے۔ وہاں اُنہوں نے جو قانون نافذ کیے وہ جنرل ضیا کے قانون پر مبنی تھے۔"

"میرے خیال میں تبت دنیا میں واحد ملک ہے جہاں عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق حاصل ہیں" شانتی نے کہا "اُس کی وجہ یہ ہے کہ بدھ مت زندگی کا ایک حصہ ہے۔ اب تبت پر اشترا کی چین کا قبضہ ہے جانے وہاں حالات کیسے ہوں۔"

"میرا خیال یہ ہے کہ کسی بھی سوسائٹی کا اندرونی ڈھانچہ بدلنا مشکل ہوتا ہے۔ میں بدھ مت کی امن پسندی اور جیو اور جینے دو کے فلسفے سے بے حد متاثر ہوں۔"

"تو پھر آپ بدھ مت اختیار کیوں نہیں کر لیتے۔"

"مذہب تبدیل کرنا کوئی آسان بات نہیں..... بدھ مت کی مقبولیت کی وجہ یہ تھی کہ لوگ ہندو مذہب سے بدظن ہو گئے تھے جہاں ذات پات کے نظریہ نے لوگوں میں نفرت کا بیج بو دیا تھا جو سب سے نچلی ذات شودر تھی اُن کے لیے نجات کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ لوگ بدھ مت کی امن پسندی اور مساوات کی وجہ سے اُس مذہب کے حلقہ میں آنے لگے۔ یہ مذہب تقریباً سارے شمالی اور مشرقی ایشیا میں پھیل گیا۔ لیکن پھر اُن میں پیچیدہ رسومات پیدا ہونے لگیں اُس وقت اسلام ظہور میں آیا جو ایک سیدھا سادھا مذہب تھا اور یہ سارے بدھ مت کے مراکز اسلامی مراکز بن گئے۔"

"تو آپ سمجھتے ہیں کہ بدھ مت صرف رسومات کا نام ہے۔"

"بدھ مت میں بہت سی خوبیاں ہیں اگر رسومات اور ترکِ دنیا کے فلسفہ کو کم کر دیا جائے..... چھوڑیے یہ بہت اَدق مسائل ہیں..... آپ کو بھوک لگی ہے۔"

"نہیں میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔"

"اچھا تو میں آپ کے لئے اسپرین لاتا ہوں آپ بستر پر چلی جائیں۔"

"غسل خانے میں شیشے کے پیچھے الماری ہے اُس میں سپرین ہے۔"

جب وہ سپرین اور پانی کا گلاس لے کر شب خوابی کے کمرے میں آیا تو شانتی بستر میں سرہانے کی پٹی کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھی تھی۔ لیمپ کی ہلکی روشنی میں اُس کا رنگ پیلا تھا۔ اُس نے گولیاں زبان پر رکھ کر ایک گھونٹ پانی کا بھرا اور بار[illegible] کی طرف دیکھا۔

"آپ واپس اپنے اپارٹمنٹ نہ جائیں..... یہاں آ کر میری کمر کے ساتھ لگ کر لیٹ جائیں مجھے اکیلے ڈر لگتا ہے۔"

اُس نے کپڑے اُتارے اور کچھا پہنے آ کر اُس کی کمر کی طرف لیٹ گیا۔ شانتی کے بدن کے لمس سے اُس کے بدن میں انگارے سے دوڑنے لگے لیکن دوسرا بدن؟ ٹھنڈا تھا۔ وہ کئی گھنٹے ساکت وصامت لیٹا رہا اور آخر اُس نے اپنے بدن میں اُٹھتے طوفان پر قابو پا لیا اور نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

اُس رات کے بعد وہ ایک دوسرے سے الگ نہیں رہ سکتے تھے لیکن اُن کی محبت محض افلاطونی تھی۔ وہ ایک دوسرے سے بغلگیر ہوتے' پیار کرتے لیکن جب وہ ذرا آگے بڑھنے کی کوشش کرتا تو وہ اُسے پیار سے الگ کر دیتی۔

شانتی اصرار کرتی تھی کہ وہ مغرب کے فلسفیانہ اثرات سے اپنے آپ کو الگ کرے "میں" اور "ذات" سے نجات حاصل کرے جو نٹشے اور سارتر کے افکار سے مقبول ہوتے تھے۔ خواہشات دُکھ' حسد اور نفرت پیدا کرتی ہیں۔ اگر انسان خواہشات پر قابو پالے تو دُکھ' حسد اور نفرت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ یوں انسان کے لیے نروان کا راستہ کھل جائے گا۔ جو ابدی اطمینان ہے۔

ایک دن شانتی نے اُسے فون کیا کہ وہ آج رات گھر پر نہیں ہوگی۔ اشوک کے ساتھ مل کر اُس نے ٹیلی ویژن کے ایک نئے منصوبہ پر کام کرنا ہے۔

اُسے نینسی کی باتیں یاد آنے لگیں۔ شاید آج رات اُسے کوئی دوسری عورت نہیں مل سکی اس لیے اُس نے شانتی کو بلا لیا۔ اُس نے سوچا کہ جب تک وہ شانتی کو بدھ مت اور اشوک سے الگ نہیں کر لیتا وہ اُسے حاصل نہیں کر سکتا۔

پھر اُس نے سوچا کہ آج رات وہ نینسی کے ساتھ کیوں نہ گذار لے۔ اُس نے نینسی کو فون کیا اُس نے پہلی گھنٹی پر فون اُٹھا لیا۔

''ہیلو'' ایک سُریلی آواز آئی۔

''ہارون بول رہا ہوں۔''

''او مائی گاڈ..... کہاں سے بول رہے ہیں۔''

''اپنے اپارٹمنٹ سے..... اکیلا اور اُداس۔''

''میں بھی اکیلی اور اُداس ہوں..... یہاں کیوں نہیں آتے۔''

''دروازہ کھلا رکھنا۔''

''دروازہ کھلا ہے۔''

دوسری صبح جب وہ واپس آیا تو اُسے لگا کہ اُس کے دماغ سے ایک بوجھ سا اُتر گیا ہے اور اُس کا بدن ہلکا پھلکا ہو گیا ہے۔

نینسی کے ساتھ جسمانی ملاپ بڑا فطری تھا۔ اُس کی کوشش تھی کہ وہ ہارون کو زیادہ سے زیادہ تسکین دے۔ وہ سارا دن نینسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ لیکن ایک رات میں اُسے نینسی سے محبت نہیں ہو سکی تھی۔ وہ صرف شانتی سے محبت کرتا ہے اور شانتی اشوک سے محبت کرتی ہے۔ شاید اُس نے اشوک کا دل جیتنے کے لئے بدھ مذہب اختیار کیا ہے ممکن ہے وہ بھی امریکہ اور یورپ کی نوجوان نسل کے اُس گروہ سے تعلق رکھتی ہو جو محض تفریح اور جسمانی تسکین کے لئے کوئی عقیدہ یا مذہب اختیار کر لیتا ہے۔ جیسے امریکہ کے کئی نوجوان عورتوں اور مردوں نے بھارت سے آتے ہوئے مہارشی راج نیش کے فرقے میں شمولیت اختیار کر لی تھی جہاں کھلے عام جنسی اختلاط ہوتا تھا اور ساتھی بدلے جاتے۔ مہارشی نے اپنے پیروکاروں سے کئی ملین ڈالر اکٹھے کر لئے تھے۔ اُس کے پاس ایک اندازہ کے مطابق پچیس رولز رائس کاریں تھیں۔

لیکن شانتی ایسی نہیں تھی ہو سکتا ہے اُس نے اشوک کی خوشنودی کی خاطر بدھ مت اختیار کیا ہو لیکن اب وہ بدھ مت کے لئے خشوع اور خضوع سے کام کر رہی تھی ہارون اُسے صرف ایک صورت میں حاصل کر سکتا تھا کہ وہ بھی بدھ مت اختیار کر لے۔ غیر ارادی طور پر وہ شانتی کے مذہب اور زندگی کا حصہ بنتا گیا۔ وہ مندر کی کونسل کا رکن بن گیا اور شانتی کے ساتھ مل کر فلاح و بہبود کے کام میں پوری طرح حصہ لینے لگا۔ اُس نے اپنی ساری آمدن مندر کے نام کر دی۔ شانتی نے اُسے کہا کہ وہ اپنا اپارٹمنٹ چھوڑ دے اور اُس کے اپارٹمنٹ میں رہائش اختیار کر لے۔

زندگی کا پہیہ گذرنے لگا اور بدھ کا پہیہ بھی ساتھ دینے لگا۔ ہارون نے شانتی کے اصرار پر اپنا اپارٹمنٹ چھوڑ دیا اور شانتی کے پاس رہنے لگا۔

ایک دن شانتی نے اعلان کیا کہ وہ ہارون کی ناآسودگی اور جسمانی اذیت نہیں برداشت کر سکتی فی الحال وہ ذہنی طور پر تیار نہیں کہ اُسے کوئی تسکین مہیا کر سکے۔ بس ایک ہی طریقہ ہے وہ گیان حاصل کرے دماغ کی قوت سے بدن کی خواہشات پر قابو پائے آج رات سے وہ اکٹھے برہنہ سوئیں گے وہ ایک دوسرے کے بدن کو ارادتاً چھونے کی کوشش نہیں کریں گے۔ وہ اُسے ایک عورت نہیں ایک دوست تصور کرے گا۔

پہلی رات تو بڑے عذاب میں گذری۔ چند لمحے تو کچھ نہ ہوا۔ رفتہ رفتہ اُس کے بدن میں بجلی کے شرارے دوڑنے لگے ایک شدید ہیجان اور اضطراب طاری ہو گیا۔ ایک کپکپی ایک زلزلہ آیا وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے شانتی کی طرف دیکھا وہ بچوں کی طرح سکون سے سو رہی تھی۔ وہ غسل خانہ میں گیا۔ ٹھنڈے پانی سے ٹب بھرا اور اُس میں لیٹ گیا۔ پھر اُس کا آتشیں بدن آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہونے لگا۔

اُن دونوں نے یہ تجربہ کئی دفعہ دہرایا۔ ایک رات اُس نے ہارون کو اپنے کمرے میں بلوایا اور اُسے کہا کہ وہ سنگار میز کے پاس کرسی پر بیٹھ جائے اور سنگار میز میں اُس کے عکس کو دیکھے۔ اُس نے آئینے کے تین طرف سفید روشنی کے بلب لگوائے۔ سنگار میز کے آئینے کے دوسری طرف دیوار پر ایک دوسرا آئینہ نصب تھا اُس کے تین طرف بھی دودھیا روشنی کے بلب نصب تھے۔ اُس نے میز کے ایک کونے پر رکھے ٹیپ ریکارڈر کا بٹن دبایا۔ ستار کی آواز بلند ہوئی۔ الاپ کے بعد جب طبلے کی دھاپ پڑی تو شانتی نے قمیض اتاری، انگیا اُتارا۔ پتلون اتاری اور کچھا اُتارا اور ہر ایک کو ہارون کی طرف پھینکتی گئی۔ پھر رقص شروع ہوا۔ لے تیز ہوئی اور بدن آتشیں شعلہ بن گیا۔ جب موسیقی ختم ہوئی تو رقص بھی رک گیا۔ اُسے یوں لگا کہ سارا جہاں اپنی گردش بھول کر ساکن ہو گیا۔ اُس نے اپنے عریاں عکس کو آئینے میں دیکھا اُس کی چھاتیوں رانوں اور ناف کے پاس پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے اور اُس کے عکس دوسرے آئینے میں دو سے چار۔ چار سے آٹھ سے سولہ لا انتہا عکس نظر آنے لگے۔ وہ منجمد ہو گیا اور صرف اُس کی آنکھیں زندگی کا ثبوت دینے لگیں۔ وہ اُس کے قریب آئی اُس کے ہونٹ اُس کی ناف سے چھونے لگے۔

''کیا ہوا تمہیں..... میرا خیال تھا کہ تم مجھے یوں عریاں دیکھ کر پاگلوں کی طرح میرے بدن سے لپٹ جاؤ گے۔''

''میں نامرد ہو چکا ہوں۔''

''نہیں..... نہیں..... تم میرے لئے نامرد نہیں ہوئے..... تم دوسری عورتوں کے لئے نامرد ہو'' وہ زور سے چیخی۔

وہ دوزانو ہو کر اُس کے سامنے بیٹھ گئی۔ اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنی چھاتیوں پر رکھ دیئے۔

''میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں..... مجھے معلوم ہے کہ تمہاری بھی یہی خواہش ہے۔ میں نے تمہیں اس لئے انتظار کروایا کہ تم میری محبت میں پوری طرح ثابت قدم ہو جاؤ.....''

وہ حیران ہو گیا۔ شانتی کے اندر اصلی عورت بیدار ہو گئی تھی۔ پہلی دفعہ بدن کی خواہشات دماغی افکار پر فتح حاصل کر رہی تھیں۔ یہ صحت مند رویہ کی طرف پلٹنے کا پہلا قدم تھا۔

''ہم تبت میں شادی کریں گے'' شانتی نے اعلان کیا۔

''تبت میں کیوں؟''

''تبت دنیا میں بدھ مت کا سب سے بڑا مقدس مقام ہے۔''

''چین کے قبضے کے بعد تبت کا ویزا ملنا مشکل ہے'' ہارون نے کہا۔

''کوئی مشکل نہیں..... ہم اخبار نویس ہیں ہمیں آسانی سے ویزا مل جائے گا۔ چینی حکومت کی پالیسی بدل گئی ہے وہ اخبار نویسوں کو ناراض کرنا نہیں چاہتی..... میں نے سارے انتظامات کر لئے ہیں۔ اشوک صاحب نے مجھے ایک منصوبہ بھی دے دیا ہے۔ نیپال کے بارے میں ہم دو دستاویزی فلمیں بنالیں گے۔ ہمارا سارا خرچ شکاگو ٹیلی ویژن برداشت کرے گا۔ اور اگر ہم نے تبت کے بارے میں بھی کوئی فلم بنائی تو اُس کا معاوضہ الگ ملے گا۔''

دو ہفتے کی تیاری کے بعد چار آدمیوں کی جماعت کھٹمنڈو نیپال کے لئے روانہ ہوئی۔

ہوائی اڈہ کو جانے سے پہلے وہ ٹیلی ویژن سنٹر میں رُکے۔ شانتی کچھ سامان لینے اندر گئی اور ہارون ٹیکسی میں انتظار کرنے لگا۔

اُس وقت نینسی عمارت سے نکل کر باہر آئی۔ اُس کی نظر ہارون پر پڑی تو وہ ٹیکسی کی طرف آئی۔ ہارون ٹیکسی سے باہر نکل آیا وہ مسکرائی اور اُس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ اُس نے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔

''ہیلو..... ہیلو..... مبارک۔''

''شکریہ!''

''میں اب بھی آپ کی دوست ہوں۔''

''جی مجھے معلوم ہے۔''

''بائی..... بائی۔''

تھوڑی دور جانے کے بعد وہ رکی اور پلٹ کر مخاطب ہوئی ''اگر وہاں کی رسومات بہت بھاری لگیں تو یاد رکھیں میرا بستر ابھی تک گرم ہے۔''

وہ مسکرائی' آنکھوں میں شرارت ناچی اور پارکنگ لاٹ کی طرف چلی گئی۔

ایک ہفتہ کے اندر شانتی نے کھٹمنڈو اور اُس کے اِردگرد فلم بندی مکمل کر لی۔ اور ایک رات اُس نے ہارون کو بتایا۔

''دو دن بعد ہم ایک جیپ کے ذریعے تبت جا رہے ہیں۔ میں نے ایک تجربہ کار تبتی ڈرائیور اور گائیڈ کو ملازم رکھ لیا ہے۔ دو دن کے سفر کے بعد ہم تبت کے سب سے اونچے پہاڑ کے دامن میں پہنچ جائیں گے جس کی ایک چوٹی پر سب سے مقدس ہزار سال پرانا دھرم شالہ ہے۔ وہاں کوئی سڑک نہیں جاتی۔ صرف ایک تنگ پگڈنڈی سے لوگ اُوپر جاتے ہیں۔ وہاں ہماری شادی ہوگی۔''

''وہ دھرم شالہ سڑک سے کتنی دور ہے۔''

''صرف پچاس میل..... لیکن یہ فاصلہ ہمیں محسوس نہیں ہوگا۔ یہ عبادت کا موسم ہے ہمارے ساتھ ہزاروں یاتری سفر کر رہے ہوں گے بعض تو مہاتما بدھ کی محبت میں اتنے سرشار ہوں گے کہ ننگے پاؤں ہر قدم پر سجدہ کرتے ہوئے آگے بڑھیں گے۔ ہائے کیا دل گداز منظر ہوگا۔''

یہ سارے واقعات جان کر ہارون بڑا حیران ہوا۔ شانتی شاید ہوش و حواس کھو چکی تھی۔ جنون کی ایسی کیفیت میں تھی جہاں سے واپس آنا ممکن نہ ہو۔

''شادی کے بعد لداخ جا کر ہم عروسی کے دن گذاریں گے۔''

اب اُسے واقعی غصہ آ گیا۔

''کیا آپ پاگل ہوگئی ہیں۔ لداخ میں بھارت اور پاکستان کے درمیان جنگ ہو رہی ہے اِس وقت وہ دنیا کا خطرناک ترین علاقہ ہے۔''

''مجھے اچھی طرح معلوم ہے..... جنگ صرف سرحد پر سیاچین کے علاقے میں ہو رہی ہے۔ شہر اور اُس کے اِردگرد کی وادیاں بالکل محفوظ ہیں۔ لداخ میں مردوں سے زیادہ عورتیں بدھ لاما یا مذہبی راہنما ہیں۔ وہاں عورتوں کو مکمل آزادی ہے۔ یہاں تک کہ وہ ایک سے زیادہ شادی کر سکتی ہیں۔''

ہارون کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا۔

''اگر آپ کو جنسی تجربات کرنے ہیں تو لداخ جانے کی ضرورت نہیں امریکہ زیادہ موزوں جگہ ہے۔ جہاں آپ دو مردوں کے ساتھ رہ سکتی ہیں یا عورتوں سے جنسی لذت حاصل کر سکتی ہیں۔ اگر اس سے آپ کا جنسی لذت کا شوق پورا نہ ہو تو بھارت سے آئے ہوئے کسی گرو کی شاگرد بن جائیں اور اُس گرو کے سارے چیلوں کے ساتھ باری باری ہم بستری کریں۔''

''میں تو مذاق کر رہی ہوں..... آپ ویسے ہی غصے ہو رہے ہیں۔''

شانتی کا اصل روپ دیکھ کر عشق کا طلسم ٹوٹ گیا وہ اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا کہ اُس نے اپنی جان کو کس دلدل میں پھنسا لیا ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ وہ نجات حاصل کر لے۔ دوسری صبح اُس نے اٹیچی کیس لیا اور سیدھا ہوائی اڈہ پہنچا اور اُسے جو ہوائی جہاز نظر آیا اُس میں سوار ہو گیا لیکن پرواز سے پہلے اُس نے ایک برقی تار امریکہ بھیجی۔

پیاری نینی!

میں واپس آ رہا ہوں۔ میرے لئے اپنا بستر گرم رکھنا۔

تمہارا

ہارون

20 سال سے شائع ہونے والا فکاہیہ ادب کا منفرد رسالہ

''ظرافت'' انٹرنیشنل

جناب ضیاء الحق قاسمی کی ادارت میں نئی آب و تاب کے ساتھ شائع ہو گیا ہے۔

R-47 سلے بنگلوز صفورا گوٹھ' یونیورسٹی روڈ' کراچی۔ 75280

فون نمبر: 8144565 فیکس: 4900213 موبائل: 0300-2636182

E-mail:ziaqasmizarafat@hotmail.com

سہما ہوا آدمی

نند کشور وکرم

جوں جوں شام کا اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا توں توں راحین کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ بار بار عالمِ پریشانی میں گیٹ پر جا کر دیکھتا کہ شاید اُس کی بیٹی ریما سکوٹر یا رکشے پر گھر آ رہی ہو مگر ہر بار اُسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا۔ پریشانی تو بیٹی کے نہ آنے کی وجہ سے ارجنا کو بھی ہو رہی تھی مگر وہ اپنے شوہر کی طرح کسی پریشانی کا اظہار کر کے اُس کی پریشانی میں مزید اضافہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ حالانکہ اندر سے وہ بھی مختلف اندیشوں اور وسوسوں میں گھری ہوئی تھی لیکن بظاہر وہ بڑے صبر وتحمل کا اظہار کر رہی تھی تاکہ اُس کے شوہر کی پریشانی میں مزید اضافہ نہ ہو۔ وہ بار بار شوہر کو آرام سے بستر پر لیٹ جانے اور چائے پینے کے لئے اصرار کر رہی تھی مگر وہ تھا کہ اُسے کسی پل چین نہیں تھا۔ وہ اضطراب کی حالت میں کبھی کمروں کے چکر کاٹ رہا تھا اور کبھی گیٹ پر جا کر دور تک اندھیرے میں جہاں تک نظر کام کرتی تھی دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس دوران وہ اُس کی ایک دو سہیلیوں کے گھر بھی ٹیلیفون کر چکا تھا مگر وہاں سے بھی یہی معلوم ہوا کہ وہ وہاں نہیں گئی۔ مگر یہ ایک دن کی تو بات نہیں تھی جب بھی اس کے آنے میں ذرا سی دیر ہو جاتی وہ پریشان ہو اُٹھتا ہے اور جب تک وہ گھر نہیں آتی تھی وہ اسی طرح پریشان کمرے کے چکر کاٹتا رہتا اور بار بار گیٹ پر جا کر دیکھتا تھا کہ وہ ٹیکسی یا رکشے پر آ تو نہیں رہی۔

راحین کو اس طرح متفکر و پریشان دیکھ کر ارجنا ہمیشہ اُسے سمجھاتی کہ وہ بے وجہ پریشان ہوتا ہے۔ بڑے شہروں میں ٹریفک کی وجہ سے لوگ اکثر گھر دیر سے پہنچتے ہیں مگر پھر بھی اس کے اضطراب و پریشانی میں کمی نہ آتی اور ریما کے لیٹ ہونے کی وجہ سے اس کی بے چینی اور اضطراب میں بتدریج اضافہ ہوتا رہتا۔ مگر یہ پریشانی اور اضطراب پہلے نہیں تھا جب وہ ننھی منی کمسن بچی تھی۔ تب لوگ اس کی خوبصورتی کی تعریف کرتے تو اُسے بہت اچھا لگتا تھا مگر جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئی وہ کسی انجانے خوف کی وجہ سے پریشان رہنے لگا۔ اور اب جب کہ وہ بیس اکیس سال کی ایک انتہائی حسین دوشیزہ میں بدل چکی ہے اُسے اندر ہی اندر کوئی خوف... کوئی ڈر ستانے لگا تھا۔

جب سے اُس نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تھا وہ اُس کی حرکات و سکنات پر بڑی نظر رکھتا تھا۔ وہ اسکول کے بعد اگر لیٹ ہو گئی ہے تو کیوں؟ اگر وہ کسی سہیلی کے گھر گئی ہے تو اس کا کیا نام ہے؟ اور وہ کہاں رہتی ہے؟ اس کے ماں باپ کیا کرتے ہیں۔ وہ کتنے بہن بھائی ہیں؟

مگر ایسا نہیں تھا کہ اُس کی ماں فکر نہیں کرتی تھی۔ فرق اتنا تھا کہ وہ اپنے شوہر کی پریشانی کے کارن اپنی پریشانی کا اظہار نہیں کرتی تھی تاکہ کہیں بیٹی کا اُس پر بُرا اثر نہ پڑے۔ علاوہ ازیں وہ اپنے شوہر کی نفسیات سے بھی اچھی طرح واقف تھی کہ کیوں وہ یوں پریشان ہو جایا کرتا ہے؟

دراصل اُن دونوں نے اپنے والدین کی مرضی کے خلاف گھر سے بھاگ کر سول میرج کی تھی۔ جس کے نتیجے میں انہیں کئی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ والدین سے بھی اس کارن اُن کی ناراضگی ایک مدت تک چلتی رہی اور اُن سے اُن کا سمجھوتہ بھی ریما کی پیدائش کے بعد ہی ہوا۔

کبھی کبھی باہر سے آنے پر اپنے باپ کو اس طرح پریشان دیکھ کر وہ چڑ جاتی اور اس سے غصے میں سوال کرتی تھی۔ "پاپا! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو مجھ پر یقین نہیں اور آپ......"

"نہیں بیٹی! یہ بات نہیں۔ مجھے تم پر بھروسہ ہے مگر میں کیا کروں؟ لاکھ چاہنے پر بھی میں تمہارے لیٹ ہو جانے پر پریشان ہو جاتا ہوں اور طرح طرح کے خیالات میرے من میں پیدا ہونے لگتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ایسا نہ ہو لیکن کیا کروں؟ سمجھ میں نہیں آتا۔"

باہر سے تھکی ماندی آئی ریما کی اس بات سے کچھ تشفی ہو جاتی اور وہ اُٹھ کر اپنے کمرے میں جا کر بستر پر دراز ہو جاتی۔ لیکن کبھی کبھی وہ تنہائی میں سوچتی "آخر پاپا اتنی فکر کیوں کرتے ہیں؟ آخر دوسری لڑکیوں کے ماں باپ بھی تو ہیں؟ مگر میری سہیلیوں کی تو زیادہ تر مائیں چنتا میں ڈوبی رہتی ہیں اور یہاں باپ؟ عجیب بات ہے ماں نے کبھی یوں فکر نہیں کی۔ اور پھر یہی سوچتے سوچتے وہ گہری نیند میں کھو جاتی۔

بچپن میں ریما تھی بھی اتنی خوبصورت کہ ہر ایک اُسے گود میں اُٹھا لیتا اور پیار کرتا۔ مگر جب اُس نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو راحین کو اندر ہی اندر کوئی فکر ستانے لگی۔ پھر اُن ہی دنوں ایک دن اُس نے ایک رسالے میں ایک لوک کہانی پڑھی کہ ایک شہزادہ کسی ریاست کی راجکماری کو ایک اونٹنی پر بٹھا کر اپنی ریاست کی جانب جا رہا تھا کہ راستے میں ایک ندی میں سے اُسے گزرنا پڑا۔ جب اونٹنی ندی کے عین بیچ میں پہنچی تو وہ وہاں بیٹھ گئی۔ شہزادے کو ڈر تھا کہ کہیں شہزادی کی ریاست کے سپاہی آ کر اُسے پکڑ نہ لیں لہٰذا اُس نے اونٹنی والے سے کہا کہ اسے جلدی سے اُٹھاؤ ورنہ ہم پکڑے جائیں گے۔ تب اونٹنی والے نے کہا حضور فکر نہ کریں پانچ سات منٹ میں یہ خود بخود اُٹھ کر دوڑنے لگے گی۔ اس سے پہلے اسے اُٹھایا نہیں جا سکتا۔ شہزادے نے خوف کے عالم میں پوچھا "کیوں؟" اونٹنی والے نے جواب دیا حضور یہ اس کی خاندانی عادت ہے۔ اس کی ماں بھی اسی طرح پانچ سات منٹ ندی کے بیچ یوں ہی بیٹھ جایا کرتی تھی اور پھر اُٹھ کر منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہو جاتی تھی۔ آپ جانتے ہیں

خاندانی عادتیں نہیں بدلی جا سکتیں۔" یہ سُن کر شبہ ہوے کے من میں اچانک یہ خیال بجلی کی طرح کوند گیا تو کیا میں جس راجکماری کو بیاہ کر لے جا رہا ہوں کل اس کی بیٹی بھی اُس کی طرح کسی کے ساتھ بھاگ جائے گی؟ یہ خیال آتے ہی اُس نے فوراً ڈولی کو واپس موڑنے کا حکم دیا اور راجکماری کو اُس کے شہر میں چھوڑ کر خود واپس اپنی ریاست میں چلا گیا۔

یہ کہانی پڑھ کر راجن کو بھی مزید وہم ہو گیا کہ اُس کی بیٹی بھی کسی نوجوان کے ساتھ بھاگ کر چپکے سے شادی رچا لے گی اپنی ماں کی طرح۔ اُس نے بہت کوشش کی کہ یہ بات اُس کے ذہن سے نکل جائے مگر لاکھ چاہنے پر بھی وہ اپنے من سے یہ بات نکال نہیں پا رہا تھا۔ عجیب نفسیات ہو گئی تھی وہ کسی اخبار میں کسی لڑکی کے اغوا یا اُس کے ریپ کا قصہ پڑھتا یا ٹی وی پر دیکھتا تو اُسے ایسا احساس ہوتا جیسے یہ واقعہ اُس کی بیٹی کے ساتھ وقوع پذیر ہوا ہو اور وہ پریشان ہو اُٹھتا اُس کی نیند غائب ہو جاتی۔ رنجنا نے اُسے بہت سمجھانے کی کوشش کی مگر سب بے سود۔

وہ رات گھنٹوں جاگتا نہ جانے کیا کیا سوچتا رہتا۔ وہ کئی بار اُٹھ کر رنجنا کے کمرے میں جا کر جھانکتا اور دیکھتا کہ وہ سو رہی ہے یا جاگ رہی ہے یا کسی سے ٹیلی فون پر بات تو نہیں کر رہی۔ یہی نہیں اُس نے گزشتہ سال آئی ڈی کالر والا فون خرید لیا تھا تا کہ اُسے پتا لگ جائے کہ اُسے کسی نے ٹیلی فون تو نہیں کیا یا اُس نے کس کس کو فون کیا ہے؟ وہ روز رات کو چپکے سے دیکھا کرتا تھا کہ دن میں کس کس کے ٹیلی فون آئے ہیں اور کس کس نے فون کیے ہیں؟

اچانک نیچے تھری وہیلر کے رکنے کی آواز آئی۔ اُس نے جھانک کر دیکھا ریا آٹو رکشا والے کو پیسے دے رہی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی اُس کی جان میں جان آئی۔ وہ اُس کے اوپر آتے ہی اُس نے بڑے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔ "بیٹا! اتنی دیر کیوں ہو گئی۔ میری تو جان نکلے جا رہی تھی۔"

ریا نے ایک بار غصے سے باپ کی جانب دیکھا۔ پھر اُن کی اس فطرت سے واقف ہو جانے کی وجہ سے بڑے صبر و تحمل سے بولی۔ "پاپا! آپ تو یوں ہی فکر کرتے رہتے ہیں۔ مہانگروں میں لیٹ ہو جانا معمولی بات ہے آپ کو کئی بار سمجھایا۔ مگر آپ ہیں کہ ہمیشہ پریشان ہو جاتے ہیں۔ آج پہلے تو دفتر میں لیٹ ہو گئی اور پھر اتفاقاً بس آئی ٹی او کے پاس خراب ہو گئی۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ آٹو رکشا مل گیا ورنہ شاید اور دیر ہو جاتی۔" اتنا کہہ کر وہ کپڑے بدلنے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

جب رات کو کھانے کے بعد رنجنا سونے کے لئے اپنے کمرے میں پہنچی تو اُس نے دیکھا وہ حسبِ معمول کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا ہے۔ مگر یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ وہ جب بھی کمرے میں آتی وہ کسی سوچ میں ڈوبا ہوا ملتا یا ٹیلی ویژن دیکھ رہا ہوتا۔ چنانچہ اُس سے کوئی بات نہ ہوتی۔ وہ اُسے سونے کی تلقین کرتی مگر معلوم نہیں وہ کب سوتا تھا۔ کیونکہ وہ تھکی ماندی اُسے سمجھاتے سمجھاتے نہ جانے کب سو جاتی تھی۔

اُس کی اس عادت سے وہ ہمیشہ متفکر رہتی مگر اُسے کچھ نہیں آتا تھا اُسے کیسے سمجھائے۔ اسی دوران ایک دن اُس کی چچیری بہن شاردا اپنے شوہر ڈاکٹر سچدیوا کے ساتھ امریکہ سے دہلی آئی تو اُن سے ملنے اُن کے گھر آ گئی۔ جب انہوں نے ریا کو دیکھا تو وہ انہیں اتنی بھلی لگی کہ انہوں نے فوراً ہی اپنے بیٹے کی اُس سے شادی کی تجویز رکھ دی۔ رنجنا تو اس اچانک پیش کش سے سکتے میں آ گئی۔ کیونکہ اُس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اس قلیل مدت میں اُس کی بیٹی کی شادی بھی ہو سکتی ہے؟ کیونکہ وہ لوگ بہت امیر تھے۔ شاردا کے شوہر کا نیویارک میں اپنا نجی کلینک تھا اور اب اُس کے بیٹے نے بھی ڈاکٹری کی سند پانے کے بعد پریکٹس شروع کی تھی۔ وہ اس تجویز پر ہاں کرنا چاہتی تھی مگر اُس نے دیکھا کہ راجن کا چہرہ اُتر گیا ہے اور وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا ہے۔ اس پر شاردا نے اُسے یوں خیالوں میں ڈوبے دیکھ کر کہا۔ "کیوں جیجا جی! کیا میری بات آپ کو پسند نہیں؟"

راجن نے چونک کر اُن کی طرف دیکھا اور کہا۔ "نہیں تو ... مگر ...."

"مگر کیا؟" شاردا نے فوراً اُن کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

اب راجن سوچ میں پڑ گیا کہ انہیں کیا جواب دے؟ وہ تو اس تجویز سے اندر ہی اندر کانپ اُٹھا تھا۔ اُس نے امریکہ اور انگلینڈ میں شادی کر کے جانے والی لڑکیوں کے مصائب اور پریشانیوں کے کئی قصے سنے ہی نہیں تھے' اخباروں میں پڑھے بھی تھے۔ کتنے لوگوں کے ساتھ شادی کے نام پر غیر ملکوں میں بسے ہندوستانیوں نے دھوکا کیا تھا۔ مگر وہ انکار کرے تو کیسے کرے؟ وہ اسی کشمکش میں تھا کہ ڈاکٹر سچدیوا نے بڑے سلجھے ہوئے لہجے میں انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔ "دیکھئے راجن صاحب! ریا آپ کی ہی نہیں ہماری بھی بیٹی ہے اور آخر مل اور دوری میں کیا فرق ہوتا ہے؟ اور پھر آپ کی بھی صرف ایک بیٹی ہے اور میرا بھی ایک بیٹا۔ اس شادی سے آپ کو بیٹا مل جائے گا اور مجھے بیٹی۔"

ڈاکٹر سچدیوا کی بات راجن کو کچھ بھا گئی۔ اور پھر بیٹی کی شادی تو کرنی ہی تھی چنانچہ شادی کی اس تجویز کو اس نے بے دلی سے قبول کر لیا اور چونکہ اُن لوگوں کو دس دن کے بعد امریکہ واپس چلا جانا تھا اس لئے چند دنوں ہی میں شادی ہو گئی اور ریا بھی کچھ مدت بعد سسرال چلی گئی۔ اُسے ہوائی اڈے پر رخصت کرتے وقت جب راجن کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تو رنجنا نے سوچا شاید یہ اُس کے آخری آنسو ہیں۔ کیونکہ اب وہ اپنی بیٹی کی فکر سے آزاد ہو گیا ہے اور بیٹی اچھے شریف اور امیر گھرانے میں شادی کے بعد سسرال چلی گئی ہے۔ مگر اُس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا کیونکہ وہ اب بھی اُسی طرح اُداس رہتا حالانکہ اُس

(بقیہ: سہا ہوا آدمی)

کی بیٹی، داماد اور اُس کے گھر والے ہر ہفتہ فون پر خیر و عافیت کی خبر دیتے رہتے تھے مگر اُس کی اداسی تھی کہ جوں کی توں قائم رہی۔ وہ اسی طرح رات دیر تک جاگتا کسی سوچ میں ڈوبا رہتا۔ جانے اُس کی بیٹی پر کیا بیت رہی ہوگی؟ اُس کے سسرال والے اُس سے کیا سلوک کرتے ہوں گے کہیں وہ لوگ ٹیلی فون پر جھوٹ تو نہیں بولتے؟

اُسے یوں فکر و غم میں مبتلا دیکھ کر رنجنا کو کچھ نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ لاکھ سمجھانے پر بھی اُس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ایک دن وہ اسی چنتا میں ڈوبا ہوا تھا کہ امریکہ سے ڈاکٹر سجید پیا کا فون آیا جسے سن کر اُس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ فون سننے کے بعد اُس نے فوراً راجن کو اُس کے دفتر فون کیا اور بغیر کوئی تمہید باندھے کہا "مبارک ہو۔"

"مبارک؟ کس بات کی مبارک؟"

"ریکھا کے ہاں بیٹا ہوا ہے۔ آپ نانا بن گئے ہیں۔"

اچانک یہ خبر سن کر اُسے کچھ نہیں آ رہا تھا کہ رنجنا سے کیا کہے۔ اسی طرح کچھ تا دیر چپ رہنے کے بعد اُس نے صرف اتنا کہا "اچھا میں گھر آتا ہوں۔"

لیکن جب تک وہ گھر پہنچا تو فون کا زمانہ ہونے کی وجہ سے یہ خبر رشتہ داروں اور پاس پڑوس میں جنگل کی آگ کی طرح ہر طرف پھیل چکی تھی۔ اور جب وہ گھر پہنچا تو کئی رشتہ دار اور پڑوسی مبارکباد دینے کے لئے جمع ہو چکے تھے۔ گھر میں خوب چہل پہل تھی۔ عالمِ مسرت میں رنجنا سب کی خاطر تواضع مٹھائی، کوک اور چائے سے کر رہی تھی۔ آتے ہی وہ بھی اُس کا ہاتھ بٹانے میں مصروف ہو گیا۔ جب رات ہو جانے پر سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تو رنجنا تھکن سے چُور چُور ہو چکی تھی۔ رسوئی میں برتنوں کو سنبھالنے کے بعد اُس نے جلدی سے نائٹ گاؤن پہنا اور سونے کے لئے اپنے بیڈ روم میں چلی گئی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ آج راجن نہ تو جاگ رہا تھا اور نہ ہی ٹیلی ویژن دیکھ رہا تھا بلکہ وہ گہری نیند میں سویا ہوا تھا اور اُس کے خراٹوں کی آواز سارے کمرے میں گونج رہی تھی۔

☆

خودساختہ ناخدا!

گلزار جاوید

بزرگوں نے سچ کہا ہے.....! پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آ جاتے ہیں.....! کونسا الزام ہے جو اُس کے سر نہیں جاتا.....! کونسی رسوائی ہے جو اُس کے حصے کا حصہ نہیں بنی.....! کون سی ذلت ہے جس کا اُسے سامنا نہیں رہا.....! خود کی زندگی سان پر چڑھائی سوجھ جاتی.....! اپنوں اور بیگانوں کو مشکل میں الجھانے سے باز نہ آیا.....! اس پہ بھی شوقِ آوارگی بس نہ ہوا تو منبر پہ چڑھ دوڑا.....! بھونپو کی آواز میں گلے کا تمام زور اور سینے کی تمام تپش انڈیل کر دل و دماغ کا غبار اس جادوگری سے بکھیرنا کہ نوعمر و ناپختہ ذہن کے ساتھ زمانہ سازی کے دعوے دار بھی کچے دھاگے میں بندھے چلے آتے.....! ہر کوئی اس کی لے میں لے ملا کر اس کے سُر سے سُر اسی طرح ملانے لگتا جس طرح قوالوں کے چیلے اُستاد کے ایک مصرعہ کو ہو کے گیت کی مانند گھنٹوں کھینچتے ہیں.....!

بات اکیلے جادوگری کی ہوتی تو شاید اس قدر فساد برپا نہ ہوتا.....!

مخلوقِ خدا اُس کے سحر میں اس درجہ دیوانگی و فرزانگی کی مرتکب نہ ہوتی.....!

بات ایک سے زائد کی ہوتی تب بھی اندیشے میں اس کا جواز فراہم نہ ہوتا.....! دو چار دس بیس سو پچاس کی تعداد بھی اس قدر شر نہ پھیلا سکتی.....! ہزار دو ہزار مل جاتے تب بھی مقابلے کا جادو اِس سحر کی کیل نکال سکتی تھی.....! بات آگے بہت آگے نکل چکی ہے.....! یعنی لاکھوں تک پہنچ چکی ہے.....! ایک، دو، دس، بیس نہیں نصف کروڑ کا ہندسہ عبور ہونے کو ہے.....! انسانی ذہن کی کارفرمائی یہاں تک بھی اپنی صلاحیتوں سے مایوس نہ تھی.....! اب تو.....! چرند پرند، پھول، پودے، کھیت، کھلیان، گلی، محلے، کوچہ، بازار، منڈی، مسجد، مکتب، ہسپتال، لائبریری، قبرستان اور شمشان بھی اس کی دہائی دینے لگے ہیں.....! ہر کوئی جادوگر کی جادوگری کے سحر میں گرفتار اور اسی کے گیت گانے میں مگن ہے.....!

ہمارے گھر پہ کیا موقوف.....! گھروں کا کُل اثاثہ اُن دنوں انسان کی بنیادی ضرورت تک محدود ہوا کرتا تھا.....! کسی گھر میں گھڑے پہ رکھی گھڑونچی مٹی کے پیالے کے بجائے تانبے کے کٹورے سے سجی ہوتی تو اُس گھر کی خوشحالی کے ڈھول دور تک سنائی دیا کرتے.....! اور جس گھر سے ریڈیو کی آواز گونجنے لگتی اُس گھر کے مکینوں کی خوش بختی کے ساتھ مستقبل کی بابت طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہونے لگتیں.....!

قول کم علمی، وہم، محدود وسائل، سوہم، ناتمام خواہشیں.....! جادوگر کی دکان چمکانے کے لئے کافی تھے.....! بھاگتی دوڑتی صبحیں، ٹھہرتی سی دوپہریں اور ڈھلتی پگھلتی شاموں میں جب بھی گھر کے کام کاج سے مہلت ملتی وہ ریڈیو کا بٹن آن کر کے اپنی تنہائیوں کی انجمن سجانے اور گئے وقت کو پکارنے کی کوشش کرتی جس میں اُس کے خواب، اُس کے ارمان، اُس کی امنگیں، اُس کی طلب، اُس کی تڑپ، اُس کی خلش، ساز و آواز میں ڈھل کر اُس کے گرد وہ ہالہ تان لیتے جو اُس کی جائے امان بن جاتی.....! جہاں کھویا ہوا وقت لوٹ آتا.....! جہاں بیتا ہوا بچپن پلٹ آتا.....! جہاں منہ زور جوانی بانہیں پسار دیتی.....! جہاں رگوں میں دوڑتا لہو سرگمی پر اُتر آتا.....! جہاں دلوں میں پلنے والے ارمان شوخ غنچوں کا روپ دھار لیتے.....! جہاں تمام اندیشے، مصلحت اور وسوسے اپنی موت آپ مر جاتے.....!

در فضا برقی لہروں کو آواز دیتی تھی.....! ان لہروں کے بہت سے سوار باری باری کبھی دل کو جھنجھوڑتے، کبھی دماغ کو دبوچتے، کبھی سارے وجود کو لرزا جاتے.....! اللہ جانے یہ جادوگر کا کمال تھا کہ اُس سے ذہنی ہم آہنگی، جب بھی وہ ریڈیو آن کرتی یا تو پہلے سے وہاں جادوگر کا راج ہوتا یا کچھ ہی دیر میں اُس کی جادوگری نمودار ہو جاتی.....! اپنے دل کا درد و کرب، دوسرے دلوں میں انڈیلنے کا جو ہنر و ملکہ اُسے حاصل تھا شاید ہی کسی اور کو ہو.....!

میں جب بھی اکیلی ہوتی ہوں تم چپکے سے آ جاتے ہو
اور جھانک کے میری آنکھوں میں بیتے دن یاد دلاتے ہو

پہلے سے گلابی رنگت یک دم سُرخی مائل ہو جاتی.....! آہستہ خرامی کا شکار دورانِ خون تیز رفتاری پہ مائل ہو جاتا.....! سارے گاما کی مدھم لے پہ دھڑکنے والا بے بس قیدی، مغربی دھن کی بے ہنگمی کا نمائندہ بن جاتا.....! وہ جھٹ سے آگے بڑھتی اور کھٹ سے ریڈیو کا بٹن دوسری جانب گھما کر گھر کے خاموش کونوں، کھدروں کو مشکوک نظروں سے دیکھنے لگتی.....! جی میں اطمینان کی کیفیت آتے ہی ریڈیو کا بٹن پھر سے آن کر دیتی.....! جادوگر کا جادو سر چڑھ جاتا اور وہ آنکھیں موند کر چارپائی پر لیٹ کر جادوگر کی لے میں لے ملا کر خیالوں کی اونچی نیچی ناہموار گھاٹیوں میں خود کو کھونے لگتی.....!

☆

جدید سائنس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی عمر کا بچہ بھی موسیقی کا الگ مزاج اور الگ ذائقہ رکھتا ہے.....! ایک بچہ اگر [illegible] سانگ میں ترتیب دیئے گئے گیت پر کلکاریاں بھر رہا ہے تو دوسرا بچہ اسی گیت کو سن کر تھک رہا ہے.....! دوسرے لمحے راگ جے جے ونتی میں ترتیب دیا کوئی گیت گونجتا ہے تو ٹھٹکنے والا بچہ کھلکھلانے لگتا ہے.....! جادوگر بڑا ماہر اور کائیاں فنکار تھا.....! وہ بھلا کیونکر اس امر سے بے خبر ہو سکتا تھا.....! ماں کی خاموشی، بالک اُداسی، شکمِ مادر میں بھی میرے لئے ناقابلِ برداشت ہو جاتی.....! کبھی

کبڈی کھیلا اور کبھی گھوڑ دوڑ میں حصہ لے کر میں اپنی ناراضگی کا اظہار کیا کرتا.....! لیٹ بیٹھ' کبھی ٹہل کر وہ میری ناراضگی دور کرنے کی کوشش کرتی.....! کبھی کبھی اپنا ابھرا ابھرا پیٹ سہلا کر مجھے منانے کی سعی کرتی.....! ووڈوبھا کو ٹکڑوں کی پڑ پونگ پر ایک طرح سے وہ بے بس ہو جاتی.....! ہارے ہوئے جواری کی طرح بوجھل قدموں سے چل کر پھر سے جادوگر سے امداد کی طالب ہوتی.....!

تیری نگاہوں کی تھکن تیری نگاہوں کا سکوت
درحقیقت کوئی رنگین شرارت ہی نہ ہو!
میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہوں
وہ تبسم' وہ تکلم تیری عادت ہی نہ ہو

اب طبیعت روں ہو جاتی.....! دل مچلنے لگتا.....! ماں کے چہرے کا تبسم دیکھنے کے لئے.....! ابھی دن ہیں.....! ابھی کئی دن ہیں.....! ماں کے حقیقی آغوش سے لطف اندوز ہونے کے لئے.....! پر یہ جادوگر.....! بڑا ہی اذیت پسند ہے.....! لو ہے کے چنے چبا کر خود تو سخت جان ہو چکا ہے.....! اوروں کی سخت جانی کا امتحان لینے پر کیوں مصر ہے.....! یہ کب باز آئے گا لوگوں کے جذبات سے کھیلنے اور انہیں مجروح کرنے سے.....؟ اس کو اندازہ ہے.....! میرا خیال ہے نہیں.....! ورنہ تب بھی یہ اپنے عمل سے باز نہ آتا.....!

ریڈیو بند ہو گیا ہے.....! درد اور بڑھ گیا ہے.....! ماں پڑوسن کو بلانے گئی ہے.....! پڑوسن دائی کی تلاش میں ہے.....! دائی' ماں کو درد سے نجات دلانے کی سعی کر رہی ہے.....! میں نہیں مانتا.....! کیوں مانوں.....! میرے جذبات.....! میرے احساسات.....! میرا اشتیاق.....! سب کس نے مجروح کیا ہے.....! جادوگر نے.....! میں ہر قیمت پر اپنی آمد کے اعلان کا متمنی ہوں.....! میرے اس عمل سے کسی کو کوئی نقصان پہنچتا ہے تو اس کا ذمہ دار قطعی طور پر جادوگر کو ٹھہرایا جائے گا.....! درد کی شدت اور بڑھ گئی ہے.....! کچھ اور پڑوسنیں آ چکی ہیں.....! میری آمد کا اعلان ہو رہا ہے.....! پہلی چیخ کو خوشی کی نوید بنانے کے لئے کوئی آگے بڑھ کر ریڈیو کا بٹن آن کر دیتا ہے.....! میرے کانوں میں لوری کی آواز کے بجائے جادوگر کا کاشت دار پیغام گونج رہا ہے.....!

تو ہندو بنے گا نہ مسلمان بنے گا
انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا

نفرت جو سکھائے وہ دھرم تیرا نہیں ہے
انسان کو جو روندے وہ قدم تیرا نہیں ہے
قرآن نہ ہو جس میں وہ مندر نہیں تیرا
گیتا نہ ہو جس میں وہ حرم تیرا نہیں ہے

اس دنیا میں جلد از جلد آنے کی تمام تر بے چینی ماں کا تبسم بھرا چہرہ دیکھنے کے لئے تھی.....! جادوگر نے مجھے کس اذیت میں گرفتار کر دیا ہے.....! یہ ہندو کیا ہوتا ہے.....! مسلمان کسے کہتے ہیں.....! نفرت کس بلا کا نام ہے.....! یہ کہاں پائی جاتی ہے.....! انسان' انسان کو کیوں روندتا ہے.....! مجھے بھی کسی کو روندنا ہوگا.....! کیا مجھے بھی کوئی روندے گا.....! یہ قرآن کیا ہوتا ہے.....! مندر کہاں پایا جاتا ہے.....! گیتا کسے کہتے ہیں.....! حرم سے کیا مراد ہے.....! میرا ذہن گھوم رہا ہے.....! یہ.....! یہ جادوگر نے کیا کیا.....! کیوں.....! کیوں وقت سے پہلے مجھے بالغ کر دیا.....!

☆

آج پھر مجھے سہ جادا کہنے والی سیکنڈ کا منہ سوجا ہوا ہے آج پھر وہ درد سے کراہ رہی ہے.....! آج پھر ماں اس کے زخموں پر مرہم رکھ رہی ہے.....! جو نظر نہیں آ رہے ہاں پر لفظوں کا پھاہا رکھ رہی ہے.....! آج پھر سیکنڈ ماں کو اپنے اوپر ہونے والے ظلم کی داستان سنا رہی ہے.....! وقت بہت نازک ہے.....! میرا دل.....! میرا دل سیکنڈ کی بے بسی پر کر چی کر چی ہو رہا ہے.....! میں بچہ نہیں ہوں.....! مجھے تو جادوگر نے پہلے ہی روزنا لغوں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے.....! میں کچھ کرنے کے لئے مچلتا ہوں.....! مگر.....! جادوگر رکا کھڑا ہے.....!

عورت نے جنم دیا مردوں کو مردوں نے اُسے بازار دیا
جب جی چاہا مسلا کچلا' جب جی چاہا دھتکار دیا!
عورت سنسار کی قسمت ہے پھر بھی تقدیر کی ہیٹی ہے
اوتار پیمبر جنتی ہے پھر بھی شیطان کی بیٹی ہے
یہ وہ بدقسمت ماں ہے جو بیٹوں کی سیج پہ لیٹی ہے

میں وقت کو پیچھے لگانا چاہتا ہوں.....! کچھ بننا.....! کچھ سیکھنا.....! کچھ کر دکھانا چاہتا ہوں.....! کب تک.....! آخر کب تک میری ماں جادوگر کے سحر میں گرفتار رہے گی.....! کب تک جادوگر' کھٹی میٹھی گولیاں دے کر ماں کو جلاتا اور مارتا رہے گا.....! کب تک وہ خود کو ایک ماں' ایک بیوی' ایک بہن' ایک بیٹی کے بجائے یرغمال.....! صرف یرغمال گردانتی رہے گی.....! اب مجھے ہی کچھ کرنا ہوگا.....! کچھ کرنے کے لئے گھر سے نکلنا ضروری ہے.....! گھر میں ماں کا دامن تھامے میں تمام عمر کچھ نہ کر پاؤں گا.....!

اب میں نے باپ کی انگلی پکڑ کر چلنا شروع کر دیا ہے.....! میں ہر روز باپ کی انگلی پکڑ کر گھر کا سودا سلف لینے نکلتا ہوں' کبھی پنساری کبھی حلوائی کی دکان پر ندیدوں کی طرح ہر چیز پر تک جاتا ہوں۔ جب کبھی باپ کے ساتھ بازار' پنجرال' سے ملحقہ تنگ و تاریک گلی سے گزرتا ہوں جہاں گرمیوں کی شاموں میں ہاتھ کا پنکھا اور سردیوں کی راتوں میں کوئلے کی انگیٹھی لئے' کسمساتے جسم اور بے جان چہروں والی عورتیں' ہر روز نئے لباس اور نئے

تازے میں دکھائی دیتی ہیں.....! ایک دن.....! ایک دن.....! اچانک
ایک دن اُن کا نوں پر تالا پڑ جاتا ہے.....! اب نہ وہ عورتیں دکھائی دیتی ہیں نہ
اُن کے کسمسائے جسم اور نہ بے جان چہرے.....! میرے اندر کا بالغ مرد اُن
میں سے بہت سی عورتوں کو اپنی محبوبہ کے روپ میں دیکھنے کا عادی ہو چکا تھا.....!
کچھ دن میں اُن کا انتظار کرتا ہوں.....! اس پر بھی اُس بازار کی ویرانی دور نہیں
ہوتی.....! ایک دن میں اپنے باپ سے اُن عورتوں کے بارے دریافت کرتا
ہوں.....! میرا باپ مجھے بچہ جان کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگتا ہے.....!
کبھی کہتا ہے وہ اپنے گھر چلی گئیں.....! کبھی کہتا ہے دوکان کے مالک نے
انہیں بے دخل کر دیا.....! کبھی کہتا ہے اُن سب کی شادیاں ہو گئیں.....! ایک
بات.....! ہر بار.....! ایک بات مشترک ہوتی ہے.....! میرا باپ کچھ
گنگنانے لگتا ہے.....!

جوانی بھٹکتی ہے بدکار بن کر
جواں جسم سجتے ہیں بازار بن کر
یہاں پیار ہوتا ہے بیوپار بن کر

میری سمجھ میں نہیں آتا......! میں کہاں جاؤں......! کیا
کروں.....! ماں کے دوکاندار کرنے کی غرض سے باپ کی انگلی تھامی.....!
باپ.....! باپ ماں کی طرح ہی جادوگر کے سحر میں گرفتار ہے.....! وہ بے صرف
جادوگر کو گنگناتا رہتا ہے.....! جب بھی جادوگر ریڈیو پر قابض ہوتا ہے
جانو.....! باپ اپنے گردوپیش سے بے خبر ہو جاتا ہے.....!
اس جادوئی سحر اور اس جکڑ سے نجات کا ایک ہی طریقہ ہے.....!
ماں باپ سے الگ کوئی راستہ تراشا جائے.....! سکول سب سے بہتر ذریعہ اس
سحر سے نجات کا ثابت ہوا.....! الف ب سے لے کر ادام رحیم اور دلہن کے طوطا
جا رہے رٹنے ملوسال کے کتنے ہی اخبارے ہوا ہو گئے.....! جادوگر اور اس
کی جادوگری سے دو دو ہاتھ کرنے ماں باپ کو نجات دلانے کا عزم لیے
کوئی نئے میں گم ہونے کو تھے کہ ایک دن ہمت و شجاعت کا سبق پڑھاتے
ہوئے اُستاد نے چند شعر پڑھے.....!

مقدر کا لکھا مٹا نہیں آنسو بہانے سے
یہ وہ ہوتی ہے جو ہو کر رہے گی ہر بہانے سے
اگر جینے کی خواہش ہے تو مستوں کی طرح جی لے
کہ محفل ہوش کی سونی پڑی ہے اِک زمانے سے

ماں باپ کو جادوگر کے سحر سے نجات دلانے کے عزم میں.....! اُستاد کی رہائی
بھی شامل ہو چکی تھی.....! ایک عزم.....! ایک ولولہ.....! ایک جوش تھا.....!
کچھ کرنے.....! بلکہ..... کر گذرنے پر دل بے قرار رہتا.....! ابھی کچھ بس
میں نہ تھا.....! خواب تھے اور اُن میں اپنی پسند کے رنگ بھرنے کے سوا کوئی چیز
دسترس میں نہ تھی.....! طرح طرح کے مشاغل جو عام بچوں کا خاصا ہیں کشش
نہ رکھتے تھے.....! چنے گانے کا فن عروج میں آ رہا تھا جس کے باعث یوم آزادی
کے فنکشن میں سٹیج کو رونق بخشنے کے لیے ہمیں بھی منتخب کر لیا گیا.....! قرعہ
ہمارے نام کوئی گیت سنانے کا تھا.....! اُستاد سے دریافت کرنے پر جواب ملا
کوئی بھی چاہت گیت گا دینا اپنی پسند کا۔

تم اگر مجھ کو نہ چاہو تو کوئی بات نہیں
تم کسی اور کو چاہو گی تو مشکل ہو گی

ہم ابھی مصرعہ شروع نہ کر پائے تھے کہ سٹیج سے اُتار دیئے گئے.....! بعد میں معلوم
ہوا یہ سب جادوگر کی جادوگری ہے.....! کہ یہ گیت اُن دنوں زبان زد عام تھا
اور کام ہماشتوں کا منقول ٹھیا ذکی ہمیں گیت کے غیر شریفانہ ہونے کی پاداش
میں سٹیج سے اُتار دیا گیا اور آئندہ کے لیے سکول کے کسی بھی فنکشن میں حصہ لینے
کے پابند بھی ہوئے.....!

☆

معاملہ پہلے ماں کی حد تک تھا.....! بعد میں باپ اس حد میں شامل
ہو گیا.....! پھر اُستاد کی فکر ہوئی.....! اب اپنے ہی لینے کے دینے پڑ گئے
تھے.....! اس بار غصہ.....! جھنجلاہٹ..... انتقام کی کیفیت کے بجائے ایک
طرح کی اشتیاقی لذت سے پالا پڑ رہا تھا.....! یہ ذات شریف ہیں
کون.....! یہ ہم سے زیادہ ہماری زندگی میں دخیل کیوں ہیں.....؟ اس کے
بعد ایک طرح سے معمول بن گیا.....! زندگی کے ہر موڑ پر.....! ہر غم ہر خوشی
کے موقعہ پر قول جادوگر صاحب خود ہی وارد ہو جاتے نہیں تو ہم ارادی یا
غیر ارادی طور پر انہیں پکارنے لگتے.....! ہمیں نہیں یاد پڑتا کہ جادوگر نے کبھی
خوشی کے لمحات میں شامل ہو کر ہماری خوشی کو دو بالا کیا ہو..... البتہ..... غمی کی
کیفیت جب جب ہم پر طاری ہوتی تب تب جادوگر نے ہمارے غم کو گاڑھا کر
کے ہمیں اس کا عادی بنانے کی پوری پوری کوشش کی ہے.....!
جوانی کی پہلی دہلیز پار کرتے ہی ہماری زندگی میں محترمہ روایت
پرور پنجابی خاتون وارد ہوئیں اور اُن کے گھر والوں کی طرف سے ہمیں اپنے
ارادوں سے باز رہنے کی تاکید و تنبیہہ کی گئی تب ہم نے شانِ بے نیازی سے
جادوگر کا تیر اُن کے سینے کے پار کر دیا.....!

ہم سے دیوانے کہیں ترکِ وفا کرتے ہیں
جان جائے کہ رہے بات نبھا دیتے ہیں

جب یہی محترمہ ہماری مخلوط مزاجی سے اوب گئیں تو انہوں نے ملا جنید ناتھ
کے الوکے سمیت اشوک کو اپنی توجہ کا مرکز یہ سوچ کر بنا لیا کہ اس طرح وہ
ہمیں راہ راست پر لے آئیں گی.....! جادوگر نے یہاں بھی دو لفظوں میں ہم
سے ہماری تقدیر کا فیصلہ کرا ڈالا.....!

جو مل گیا اُسی کو مقدر سمجھ لیا
جو کھو گیا میں اُس کو بھلاتا چلا گیا

اپنی باری پر کانچ سے اس طرح اجنبیت کا اظہار کیا جادوگر نے جیسے مقروض کبھی کبھی قرض خواہ سے کیا کرتا ہے.....! ہماری باری پر لفظوں کے ہتھوڑے برسانے لگا.....! تین پیپروں میں فیل ہونے کے باعث ہم نے پڑھائی چھوڑ کر کوئی اور میدان آزمانے کا پکا ارادہ کر لیا تھا.....! گھر والے ہماری مستقل مزاجی کے قائل تھے.....! ایک شخص تھا تو جادوگر.....!

مقدر سے بگڑی ہوئی تقدیر بنا لے
اپنے پہ بھروسہ ہے تو یہ داؤ لگا لے

☆

ساتھ کا ذکر کیا کریں.....! تیز ہوا میں اُنگلی پر لٹکے کپڑے کی مانند تا عمر کبھی پھڑ پھڑاتی، کبھی بے دم ہواؤں کے دوش پہ ان دیکھے خلاؤں میں بھٹکتی رہی.....! جب کوئی آج انسانی مفاد سے بے وفائی کا مرتکب ہوتا.....!
ہم سے پہلے جادوگر آن موجود ہوتا.....!

وقت کے دن اور رات
وقت کے کل اور آج
وقت کی ہر شے غلام
وقت کا ہر شے پہ راج
آدمی کو چاہئے وقت سے ڈر کر رہے
کون جانے کس گھڑی وقت کا بدلے مزاج

جادوگر سے ہمارا تعلق عامل و معمول کی طرح کا ہے.....! آنکھ کھولنے سے پہلے آنکھ کھولنے کے بعد.....! شعور کی آمد سے پہلے شعور کی آمد کے بعد تک کا یہ سفر دو انجانے مسافروں کا سفر ہے.....! جس میں ایک کے دیوہیکل سایہ نے دوسرے کی پرچھائیں کو نادیدہ طور پر دیدہ کی قوت فراہم کی ہوئی ہے.....! بات اس حد تک رہتی تب بھی ٹھیک تھا.....! اب تو.....! اب تو پانی سر سے اونچا، بہت اونچا ہو چکا ہے.....! جادوگر کے حالی موالی، جادوگر کے معمول کو اپنا شکار جان کر اس طرح محبت کے شکنجے میں جکڑے رہتے ہیں کہ معمول، جادوگر کی جادوگری بھول کر اس کے حالی موالی کی ساحری میں گرفتار ہے.....! لاکھ کوشش.....! لاکھ جتن کے باوجود بھی محبت کی جوار بھاٹا کم نہیں ہو پا رہی.....! معمول ایک اور عاشق لاتعداد.....! جائے تو جائے کہاں.....! جائے تو کہاں جائے اماں.....!

☆

ایسا پہلے بھی کئی بار ہوا ہے.....!
کئی بار.....! زخموں سے چور لاشہ اپنے کاندھوں پہ اُٹھائے بے تنگ و مہر ہونا پڑا ہے.....! کئی بار.....! ہجر کی راتیں ہمارے لئے کانٹوں کی سیج بنی ہیں.....! کئی بار.....! اپنے ہی زخموں پر پھاہا رکھتے ہوئے خود پر رشک آیا ہے.....! کئی بار.....! آنکھ سے بہتے آنسوؤں نے ہمارا کتھارسس کیا ہے.....! کئی بار.....! آوارہ بادلوں کی ٹھنڈک ہمارے درد کا درماں بنی ہے.....! کئی بار.....! بادِ صرصر نے تھپکی دے کر ہمیں سُلایا ہے.....! کئی بار.....! بہتے دریا کی روانی نے روح کو تازگی بخشی ہے.....! کئی بار.....! چہچہاتے پرندوں نے زندگی کا احساس دلایا ہے.....! کئی بار.....! ماں کی گود میں ہمکتے بچے نے دل کو تقویت پہنچائی ہے.....! کئی بار.....! لہلہاتے کھیتوں نے قدرت کی ستائی کا قائل کیا ہے.....! کئی بار.....! پھولوں سے لدی ٹہنیوں نے عزم و حوصلہ بخشا ہے.....! کئی بار.....! ادھ کھلی کلیوں نے زندگی سے لڑنے کی تحریک دی ہے.....!

اس بار.....! اس بار ہمارا پور پور چور ہوا جاتا ہے.....!
کیوں.....! ہمارے انگ انگ میں درد کی میٹھی ٹیسیں اُٹھ رہی ہیں.....! کیوں.....! اپنا آپ ادھورا ادھورا نامکمل لگ رہا ہے.....! کیوں.....! تن بدن میں بے نام خلاؤں نے گھر کر لیا ہے.....! کیوں.....! یہ ہجوم ہماری تلاش میں ہے.....! کیوں.....! ان کے چہروں میں اتنی مماثلت ہے.....! کیوں.....! ان میں ہمارا ماضی جھلک رہا ہے.....! کیوں.....! میں ان کو پہچان نہیں پا رہا ہوں.....! کیوں.....! ان میں جادوگر سے اس قدر مشابہت محسوس ہو رہی ہے.....! کیوں.....! یہ مجھے ہو بہو جادوگر لگ رہے ہیں.....! کیوں.....! میں ان کے سحر میں گرفتار ہوتا جا رہا ہوں.....!

☆

میری بینائی تیز ہو رہی ہے.....! میرے قویٰ حساس ہو رہے ہیں.....! کچھ چہروں کے نقوش واضح ہونے لگے ہیں.....! ایک چہرہ.....! ہاں.....! ایک چہرہ.....! مانوس لگ رہا ہے.....! انسانیت، محبت، اخوت، بھائی چارگی اور وسیع المشربی اس چہرے پر اس قدر نمایاں کیوں ہے.....! ارے.....! ارے یہ تو.....! بہت مہربان، شفیق بھائی کیول دھر ہیں.....! کس محبت سے انہوں نے بازو وا کئے ہوئے ہیں.....! ان کے پہلو میں کانتا بھابھی کھڑی ہیں.....! انہوں نے ہاتھ میں لذیذ پکوان سے سجی تھالی اٹھائی ہوئی ہے.....! تیسرا چہرہ.....! یقیناً انیل دھر کا ہے.....! اس کی بند مٹھیوں میں پان کے گلوری بیڑے ہوں گے.....! ارے.....! یہ مانوس چہرہ.....! کس قدر سادہ کس قدر معصوم ہے.....! یہ یقیناً سونیا جی ہے.....! اس کا شکاسر ابھی تک دوستی کے انتظار میں ہے.....؟ بشارت اور ہما کی بند مٹھیوں میں چھپے جگنو ان کے چہروں کو کس قدر ضو دے رہے ہیں.....! عبادت اور دعا کی شرارتوں سے فرشتے بھی لطف اندوز ہو رہے ہیں.....!

پروفیسر سردار جھنڈا سنگھ کی خوش کلامیوں سے "تیرو صداقت" شاداب دکھلا رہا ہے.....! اوم پرکاش بجاج صاحب ابھی تک علی سردار جعفری کا کلام گنگنا رہے ہیں.....! رکشش بھارتی 'بڑھو بڑھو کے مہمانوں کا سواگت کر رہے ہیں.....! بھلا صاحب کے آنسو ابھی تک اُن کے اخلاص کی گواہی دے رہے ہیں.....! پروفیسر سلیکھ چند کنول کی ''آشیاں'' ابھی تک حسین ابھی تک جواں.....! پروفیسر ایس ایس تبسم کی "سونا لیزا" ابھی کی منتظر بھی کی مہرباں.....! ساحر کنول کی غزل کس قدر پرسوز کس قدر پُرفشاں.....! ڈاکٹر بلبیر شاہ کے ''بے بس پرندے'' سنا رہے ہیں لوریاں.....! ساگر سیالکوٹی کیوں نہیں ہیں دوریاں.....! ہرپال سنگھ بھی سعادت نصیب دشمناں.....! جیتندر سنگھ کا جوش ولولہ اب دلوں میں کہاں.....! مس واگھی کی شستہ اردو رہ گئی وہاں.....!

☆

پنجاب کی سوندھی مٹی میں گندھے مہان فنکار.....! ستیہ پال آنند نے پچھلے دنوں اپنی جنم بھومی سے رہائی کی بنتی کی تھی.....! آج وہی بنتی.....! ہم ساحر واسیوں نے اپنے الفاظ میں کر رہے ہیں.....! اے محبت کے امینوں.....! اے سوندھی مٹی کے گجھوں.....! اے ساحر کے متعلقوں.....! آپ نے جتنی عزت، مان، سمان ہمیں دیا ہے اس کے لئے ہمارا رُواں رُواں تمام جیالی آپ کے گیت گاتا رہے گا.....! ایک درخواست.....! ہاں.....! مگر.....! ایک درخواست پر غور ضرور کر لیجئے.....! اگر آپ ہر طرح خیریت سے ہوں.....! اگر آپ ساحر کی تھکان اُتار چکے ہوں.....! اگر آپ ذرا یکسو ہوں.....! اگر آپ کچھ فرصت ہوں.....! اگر آپ مائل بہ کرم ہوں.....! تو.....! ایک بار.....! صرف.....! ایک بار.....! اپنے کھیتوں، کھلیانوں، گلی کوچے، میدانوں، مندر، مسجد، دیاروں میں نکل جاؤ.....! کچھ دیر کے لئے.....! ہاں ہاں کچھ دیر کے لئے.....! فقط کچھ دیر کے لئے.....! چشم بینا کو کام میں لے آؤ.....! وہیں.....! کہیں.....! آپ کے گرد و پیش.....! ہمارا وجود بکھر گیا ہے.....! ہو سکے.....! ہو سکے تو اُسے سمیٹ لو.....! ہو سکے تو اُسے دبوچ لو.....! ہو سکے تو اُسے چوم لو.....! اس کے بعد.....! اس کے فوری بعد.....! انتہائی عجلت اور سرعت سے ہمارا وجود ہمیں لوٹا دو.....! کہ ہم پہلے ہی بڑی تشنگی کا شکار ہیں.....! اب.....! اور تشنگی ہمارے بس میں نہیں ہے.....!

بدلے میں آپ جو مانگو.....! ہم دینے کے لئے تیار ہیں.....! اپنا سب کچھ.....! ہاں ہاں.....! سب کچھ آپ پر وارنے کو تیار ہیں.....! آپ کا عطا کردہ گولڈ میڈل، شیلڈ، پلاک، پینٹنگ، شال اور دیگر تحائف آپ کے قدموں پر نچھاور.....! ایک بار.....! بس ایک بار.....! ہمارا کھویا ہوا وجود ہمیں لوٹا دو.....! سنا ہے.....! سب سے بڑے ستار راج میں ابھی بھی زور آور کا سکہ چلتا ہے.....؟ تو پھر اسے علامیانہ واسیوں.....! تمہیں تمہارے زور آور فنکار سعادت حسن منٹو کا واسطہ.....! تمہیں تمہارے دلبر شاعر ابن انشا کا واسطہ.....! تمہیں تمہارے عزیز صحافی حمید اختر کا واسطہ.....! تمہیں تمہارے پروفیسر موہن سنگھ کا واسطہ.....! تمہیں تمہارے ہری کشن چیٹرجی کا واسطہ.....! تمہیں تمہارے رتنو چیری کا واسطہ.....! تمہیں تمہارے بی آر چوپڑا کا واسطہ.....! تمہیں تمہارے دھرمیندر کا واسطہ.....! تمہیں تمہارے.....! تمہارے.....! ساحر لدھیانوی کا واسطہ.....! ہمیں ہمارا آپ لوٹا دو.....! لوٹا دو.....!

لوٹا دو کہ تمہیں درگا ماتا کے مندر کا واسطہ.....! لوٹا دو کہ تمہیں جامع مسجد کا واسطہ.....! لوٹا دو کہ تمہیں گلوری چرچ کا واسطہ.....! لوٹا دو کہ تمہیں مشن ہائی سکول اور اس کے طلبا کا واسطہ.....! لوٹا دو کہ تمہیں پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری اور اس کی لاکھوں کتابوں کا واسطہ.....! لوٹا دو کہ تمہیں کیپو ہسپتال اور اس کے مریضوں کا واسطہ.....! لوٹا دو کہ تمہیں ٹائیگر سفاری اور اس کے مکینوں کا واسطہ.....! لوٹا دو کہ تمہیں رورل میوزیم اور اس کے مخطوطات کا واسطہ.....! لوٹا دو کہ تمہیں راکھ باغ اور اس کے پھول پودوں کا واسطہ.....! لوٹا دو کہ تمہیں دونوں قبرستان اور ان کے دفینوں کا واسطہ.....! لوٹا دو کہ تمہیں شمشان اور ان کے خزینوں کا واسطہ.....! لوٹا دو کہ تمہیں گیتا کا واسطہ.....! لوٹا دو کہ تمہیں بائبل کا واسطہ.....! لوٹا دو کہ تمہیں قرآن کا واسطہ.....! لوٹا دو کہ تمہیں گرو گرنتھ کا واسطہ.....!

☆

کیا ایسا ممکن ہے.....؟ کیا ایسا بس میں ہے.....؟ کیا ایسا.....؟ کیا.....؟ اے.....؟ سا.....؟ گر نہیں.....! تو اے شریف انسانوں.....! آگے بڑھو اور عہد کرو.....! عہد کرو اور آگے بڑھو.....! کہ اب.....! کہ اب کوئی زور آور.....! طالع آزما.....! دیو ہیکل.....! دیو قامت.....! اپنی انگیٹھی دہکانے کے لئے ہمارے لہو کا خراج مانگے تو نہ صرف تمام ساحر وادی.....! بلکہ.....! پاپو وادی.....! ٹاکر وادی.....! لیا وادی.....! شیرو وادی.....! لیاقت وادی.....! ابرو وادی.....! قاطرو وادی.....! بچو وادی.....! نواز وادی.....! یک قلب و یک جان ہو کر.....! ہر تعصب سے بالا ہو کر.....! انسانوں کا ایک ٹھٹ بن جائیں گے.....! ایسا ٹھٹ.....! جس سے.....! جس سے ٹکرا کر ہر قسم اور ہر نوع کا خود ساختہ خدا اپنی موت آپ مر جائے گا.......!!!

☆

ایک نظم

(سراج کے نام)

حمایت علی شاعر

میں کینیڈا سے کراچی میں آ گیا ہوں پھر
وہ شہر ... میری محبت کا جو امین بھی ہے
مری حیات، جو ہے محوِ خواب پگرنگ[1] میں
مری حیات، مرے گھر میں جو مکین بھی ہے

میں اس کو دیکھتا رہتا ہوں صبح و شام یہاں
وہ اپنے بچوں میں دن رات ہے مگن کتنی
وہ کینیڈا ہو کہ امریکہ ہو کہ پاکستان
وہ ہر جگہ ہے مگر مجھ سے ہے لگن کتنی

یہاں بھی اس کے ہیں لختِ جگر، وہاں بھی ہیں
وہ ایک ماں ہے، خدا کی طرح ہے ہر دل میں
وہ اپنی قبر میں آسودہ اپنے گھر کی طرح
"چراغِ راہ" ہے لیکن ہر ایک منزل میں

وہی تو ہے جو مری ہم سفر ہے عمر تمام
وہی تو ہے جو مری زیست سے عبارت ہے
جو سب میں ہو کے بھی تقسیم "ایک" ہے اب تک
جو اپنی ذات میں "توحید" کی علامت ہے

[1] کینیڈا کا قبرستان

رباعیات

نامی انصاری (کانپور، بھارت)

تحریر میں کچھ جان نہیں ہوتی ہے
اسلوب کی پہچان نہیں ہوتی ہے
جب آ نہ سکے ہونٹوں پہ اندر کی بات
تقریر بھی آسان نہیں ہوتی ہے

دلکش ہیں جو آغاز، کہاں سے لاؤں
روشن ہیں جو افکار، کہاں سے لاؤں
غالبؔ کی طرفدار ہے دنیا ساری
میں جرأتِ انکار کہاں سے لاؤں

خوشبو کا شجر، آبِ رواں ہے اردو
زرتاب ہے وہ ملک، جہاں ہے اردو
یہ پریم کا سنگیت ہے، میراؔ کا بھجن
امرت کی طرح میٹھی زباں ہے اردو

ٹوٹے تو قلم اور بنا لیتے ہیں
ہارے تو علم اور بنا لیتے ہیں
دن میں جو بکھر جاتے ہیں ذرّہ ذرّہ
ہم شب میں صنم اور بنا لیتے ہیں

کل جوش میں باقی نہ رہی حدِ ادب
ہم کہہ گئے یاروں کو رقیبانِ طرب
پھر وہ بھی ہوا جو نہ کبھی ہوتا تھا
بوتل پہ مری ٹوٹ پڑے سب کے سب

پونم کا جب چاند اٹھا آہستہ
تارے بولے "کچھ اور ذرا آہستہ"
معلوم نہیں کتنی قیامت گزرے
کھلتے کھلتے ترا بندِ قبا آہستہ

مسیحا کی تلاش

بلراج کومل (دہلی بھارت)

تم کو شکوہ ہے کہ دنیا بد سے بدتر ہوئی
وہ توازن جو عناصر میں رواں صدیوں سے تھا
پہلے کچھ بگڑا بالآخر کھو گیا
وہ ندی جو جلوہ شفاف تھی
ایسی آلودہ ہوئی
زندگی کے سب درخشندہ مظاہر موجِ تیرہ میں بہا کر لے گئی
ایک دو کا ذکر کیا عفریت لاکھوں اور ہزاروں میں
سبھی آبادیوں پر حکمراں ہوتے گئے
جسم و جاں کے سارے رشتوں اور ساری آبروؤں کی
برہنہ دھجیاں بکھری ہوئی تھیں چار سُو
آسماں میں کرگسوں کے جھنڈ تھے
جب اترتے تھے زمیں پر
اشتہاؤں کا فساد
ہر حدِ تسکیں سے تھا
ماورا

یہ زاغ
تم یہ کہتے ہو کسی انسان کے بس کا نہیں
اب کوئی راہِ شفا باقی نہیں
روز و شب کرتے ہو تم
انتظار
انتظار
اس مسیحا داستانی اس مسیحا کا نئے اوتار کا
آسماں سے عین ممکن ہے جو اترے گا زمیں پر
زندگی کے ہر رُخِ تاریک کو کر دے گا روشن
اپنے نوریں لمس کے اعجاز سے
انتظار
یہ تمہارا انتظار

کتنی صدیوں سے تھا جاری اور جاری آج بھی!
سانحہ ایسا ہوا
کرگسوں کے درمیاں
آسماں کچھ ایسا بنجر ہو گیا
اب کسی تازہ مسیحا کے اترنے کا کوئی امکاں نہیں
اور مسیحا جس کے تم
منتظر صدیوں رہے
اک تلاشِ رائگاں میں آج تک الجھے رہے
وہ تمہاری ذات میں تھا جاوداں
کاش تم پہچان سکتے اس کو بن جاتے
طلوعِ نور
موجِ انبساط
حرفِ راحت
روشنی کا باب سیلِ آفتاب
کاش تم!
کاش تم!

جوابوں کے دائرے سے پرے

رفعت سروش

وہ ایک یادِ محبت کے فلسفے کی طرح
دل و دماغ کو مسحور کرتی رہتی ہے
وہ اک سوال جو ازل سے جو مشکل
ہر اک زمانے میں کرتا رہا ہے جو مبہوت
وہ اک سوال جوابوں کے دائرے سے پرے
کبھی ہے رنگ، کبھی نور ہے، کبھی خوشبو،
کبھی خیال، کبھی روح ہے، کبھی ہے بدن،
اس اک سوال کا ہی نام تھا وہ پیکر بھی
جو میرے لمس کی بھی دسترس سے دُور رہا
نظر بھی چھو نہ سکی جس کی جلوہ ریزی کو
وہ کب کا ہو چکا معدوم، بن چکا ہے یاد
مگر ہے ذہن میں پیچیدہ فلسفے کی طرح

یومِ آزادی

پروفیسر سُلیکھ چندر کنول (ہریانہ)

کہنے کو کئی سالوں سے آزاد ہو گئے
آباد ہو گئے، کئی برباد ہو گئے
دلشاد ہو گئے، کئی ناشاد ہو گئے
ٹھگی، فریب، دھوکے کے اُستاد ہو گئے

دُکھوں کی زندگی سے ہم بیزار ہو گئے
قسمت کے اپنے آپ ہم معمار ہو گئے
آزاد ہو گئے مگر غربت پڑی رہی
فکرِ معاش کی میرے پا میں کڑی رہی
نخوتوں، بد دماغی کی آندھی چڑھی رہی
بد بوئے امتیاز مغز میں اڑی رہی
بعضوں کو لیڈری کی ہی مستی چڑھی رہی
کوشش بڑی ہوئی، رہی ناکام ہر گھڑی

قسمت سے ہوا جیل کی کھانی تھی گھنٹہ بھر
ایثار بے بہا کیا، روں مل گیا ثمر
کچھ تم سے تُو تُو مَیں مَیں کی اُن سے اگر مگر
تقریر کی نعرے لگے، ہوتی ہے یوں بسر
ہاروں سے جھکا رہتا ہے اُن کا سدا ہی سر

گر یہ نہ ہوتے دوستو! آفت تھی ملک پر
ایک وقت کھانا کم کھاؤ کہتے ہیں چیخ کر
میزوں پہ ہاتھ مار کر دانتوں کو پیس کر
خود دعوتیں اُڑاتے ہیں آنکھوں کو میچ کر
چلتے ہیں پیٹ پر سے وہ کُرتوں کو کھینچ کر
لو دیکھئے ہمارے بھی کیسے ہیں مہرباں
انسانیت کے بھیس میں پلتے ہیں یہ حیواں!

ساحر لدھیانوی

(۲۴ اپریل ۲۰۰۰ء جشنِ ساحر کے موقع پر لدھیانہ بھارت میں کہی گئی)

سرور انبالوی

سحر کی طرح پیشانی تھی، دل تیرا منور تھا
زمیں پر پاؤں تھے لیکن بلندی پر مقدر تھا
اُگائے ہیں گلستانِ سخن میں پھول کیا تُو نے
کہ لفظ و معنی کا معیار اونچا کر دیا تُو نے
حدیثِ دلبری آئینہ ہے تیرے تفکر کا
کہ اِک اِک شعر ہے غماز تیرے قلبِ مضطر کا
رہیگا فن ترا زندہ، تری شعلہ بیانی سے
ہویدا ہے ترا سوز دروں تیری کہانی سے
لہو سے وقت کے ماتھے پہ تُو نے نظم وہ لکھی
مقابل تاج کے گویا حدیثِ زندگی رکھدی
دلوں میں تیری یادوں کے دیے اب بھی فروزاں ہیں
تری رنگیں بیانی سے فضائیں کیف ساماں ہیں
ہر اک دل میں تری یادیں، تری تکریم ہے "ساحر"
کہ تیرے نام سے اِس شہر کی تعظیم ہے "ساحر"
یہ بستی تیرے فکر و فن سے رخشندہ ہوئی کیسی
یہاں کے رہنے والے یاد کرتے ہیں تجھے اب بھی
ابھی تک آندھیوں میں تیری عظمت کے دیے روشن
عقیدت کے گلابوں سے بھرا سب نے ترا دامن
نگارِ شعر، تیرے شعر تو روشن ستارے ہیں
کہ چمپا پھول جمنا اور گنگا کے کنارے ہیں
وفا و مہر کی خونِ جگر سے داستاں لکھدی
جبینِ تاج پر تُو نے صدائے خونچکاں لکھدی
یہی وہ داستاں ہے جس میں تیرا دل دھڑکتا ہے
سرورؔ انبالوی "ساحر" سے ہندوستاں مہکتا ہے

لدھیانہ   ۲ بھارت کے دو مشہور شہر   تاج محل آگرہ

ایک نیا سراپا

ناصر زیدی

کل رات کو عجیب سی اک بے کلی رہی
اُس کے تصورات میں جھپکی نہ آنکھ بھی،

گھٹتا رہا ہزار کی گنتی میں اُس کا نام
جیسے ازل سے ہو کوئی ناشاد و تشنہ کام

کیا شکل تھی بھلی سی، جسے بھولتا نہیں
اے کاش اُس کو دیکھ نہ پاؤں میں پھر کہیں

اک بار دیکھ لینے سے حالت تباہ ہے
اُس پر نگاہ دوسری ڈالوں گناہ ہے

مرمر سے ہے تراشا ہوا وہ حسیں بدن
جچتا ہے اُس کے جسم پہ ہر ایک پیرہن

مجھ کو غرض نہیں ہے عذاب و ثواب سے،
پڑھتا ہوں اُس کو عشق کے تازہ نصاب سے

رانی ہے وہ خیال کی، سپنوں کی، چاہ کی!،
پھر کس لئے سبیل کوئی رسم و راہ کی؟

میں جس بستی میں رہتا ہوں

سید عارف

میں جس بستی میں رہتا ہوں
وہاں پر زندگی حرکت نہیں کرتی
کسی آسیب کی صورت
فقط موہوم سے سائے لرزتے ہیں
سکوت مستقل کی دھند میں ڈوبے ہوئے شام و سحر کروٹ نہیں لیتے
گلی کوچوں میں وحشتناک سناٹے
مسلسل دندناتے ہیں
ہر اک منظر پہ مرگ ناگہاں کا خوف طاری ہے
فنا پہ رقص جاری ہے
عجب بے اختیاری ہے
اک ایسے سربریدہ شہر کا باسی ہوں میں عارف
جہاں جسموں کی شاخوں پر سروں کے پھل نہیں آتے
جہاں لوگوں کو چہروں کے تکلف کی ضرورت ہی نہیں پڑتی
جہاں آواز پابند سلاسل رکھی جاتی ہے
جہاں پر سانس لینے کے لئے پہلے اجازت لینی پڑتی ہے
میں جس بستی میں رہتا ہوں
وہاں ہر منکر آئین شب غدار ہوتا ہے
جو سچ بولے سزائے موت کا حقدار ہوتا ہے
سر دربار جو اپنی انا کو بیچ ڈالے
صاحب کردار ہوتا ہے
میں اس بستی میں رہتا ہوں
جہاں لفظوں کی عزت بھی
ہوس ناکی کی سولی پر لٹکتی بیسواؤں کی طرح
اشراف کے ہاتھوں
ہزاروں مرتبہ لٹتی ہزاروں مرتبہ نیلام ہوتی ہے
جہاں لفظوں کو بھی جسموں کی طرح
پامال کرتے نوچتے
برباد کرتے لوٹتے اور پھینک دیتے ہیں
کمین قریہ مقتول ہوں
میری بھلا پہچان ہی کیا ہے
میرا ہونا نہ ہونا ایک جیسا ہے
کہ اک مدت سے اپنے خال و خد کا پیرہن پہنا نہیں میں نے
اور اپنے آپ کو دیکھا نہیں میں نے
کہ میں تو شہریار جبر و نخوت کی ثنا خوانی کے
زنداں میں سسکتا ہوں
میں اپنے فیصلے کرتا نہیں ہوں صرف سنتا ہوں
کسی کے خواب بنتا ہوں
کہیں سے حکم آجائے تو میں اپنے ہی بچے
آگ کے طوفان میں خود جھونک دیتا ہوں
میں اپنی بستیاں خود پھونک دیتا ہوں
مجھے ان بستیوں میں کس نے پھینکا ہے
مرا آئینۂ پندار و غیرت کس نے توڑا ہے
کسے پوچھوں مری قسمت میں
دشت ظلم پہ بیعت کے یہ تاریک موسم کس نے لکھے ہیں
مرے ماضی کے خد و خال دھندلے ہو گئے ہیں
اور میرے دیروز کی سب روشنیوں کو
مرے امروز کی تاریکیوں نے نوچ ڈالا ہے
ہوس کی سرکش و منہ زور اندھی رات نے
مرے تیقن کے اجالوں کو
مرے کردار کے سارے حوالوں کو
میرے جذبوں مرے احساس کی لو کو
مرے خوابوں کو اغوا کر لیا ہے
اور مرا موجود ناموجودگی کے
تیرہ و تاریک ملبے میں سسکتا ہے
مری تاریخ کے آنگن میں اک کہرام برپا ہے
صف ماتم بچھی ہے
ہر ورق کی آنکھ نم ہے
اور استفسار کرتی ہے
کہ میرے ساتھ کس نے یہ بھیانک کھیل کھیلا ہے
مجھے کس نے اجالوں سے اندھیروں میں دھکیلا ہے

کون کہتا ہے!

(عراق، فلسطین، افغانستان اور کراچی کے حالیہ
قتلِ عام کے حوالے سے ایک تاثراتی نظم)

ضیاء الحق قاسمی

کون کہتا ہے کہ انسان اشرف المخلوق ہے
جس کے ہاتھوں میں فقط بارود ہے بندوق ہے
گرم کر رکھا ہے اس نے ظلم کا بازار..... کیوں
تیز کر رکھی ہے اُس نے جبر کی تلوار کیوں
خود ہی انساں کاٹتا ہے گردنیں انسان کی
اس نے اپنائی ہیں ساری خصلتیں شیطان کی
اس کے جبر و ظلم پر شیطان بھی حیران ہے
اشرف المخلوق تھا کیا وہ یہی انسان ہے
اس کو اپنی حرکتوں پر شرم تک آتی نہیں
اس کے اندر کی خباثت کیوں نکل جاتی نہیں
اُس کو انساں کہلوانے کا کوئی بھی حق نہیں
یہ درندہ ہے ذرا سا بھی کسی کو شک نہیں
اس کے منہ کو لگ چکا ہے پاک انسانوں کا خون
اس کے ہاتھوں پر لگا ہے قیمتی جانوں کا خون
یہ درندہ ہے مگر چہرہ ہے اک انسان کا
یہ نمائندہ ہے دنیا میں بڑے شیطان کا
آؤ مل کر اس کے چہرے کا نقاب الٹا کریں
آؤ اس کے ٹیڑھے پن کو سب کے سب سیدھا کریں
ہے پریشاں ایک دنیا اس کے قتلِ عام سے
چہرۂ انسانیت پر داغ ہے اس نام سے
یا الٰہی اشرف المخلوق بندے ہیں کہاں

گل مہر

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

سرخ آگ کی لپٹوں سا دہکتا
اس سال خوب کھلا ہے
ایک بھی پتہ نہیں!
پورا پیڑ پھولوں سے لدا ہے
اس کا گدرایا تن......
تازہ گرم خون کی طرح دمکتا ہے
لال زبانیں لپلپاتی ہیں
چاروں طرف بکھری گرد
تکوار، پٹرول اور کلاشنکوف
میزائل، توپ، بزری اور بحری بیڑے
اور تپتی گرمی میں........
اُگتے لال سورج جیسا گل مہر
ہر طرف کھلا ہے.......
نئی صدی کے شروعاتی چند سال میں!!

سالگرہ کے پھول

قیصر نجفی

معذرت خواہ ہوں اے میرے صنم
میں نے جو پھول چُنے تیرے لئے
وہ تجھے دے نہ سکا
اب کے یہ پیار کی سوغات تجھے مل نہ سکی
اور ترے دل کی کلی کھل نہ سکی

میں تری سمت چلا تھا کہ گلی کے اس پار
ایک سیلاب لہو کا تھا رواں
اک جواں سال مسیں بھیگ رہی تھیں جس کی
تر بتر خوں میں پڑا تھا بے جاں
دہشت و خوف کی چادر اوڑھے
لوگ سہمے ہوئے ٹھہرے تھے قریں
زیر لب سب یہ مگر کہتے تھے
بے گنہ تھا یہ جواں

میں نے وہ پھول نچھاور کئے اس پیارے جواں
ایک اُس انساں پر
جانور بھی جسے سمجھا نہ گیا
اور جو قتل کئی بار ہوا

موت کی اب کے چلی ہے جو ہوا
کتنی سفاک ہے کیا بتلاؤں
سوچتا ہوں کہ خوشی سالگرہ کی تیری
موسم مرگ میں کس طرح منانے آؤں
معذرت خواہ ہوں اے میرے صنم

گیت

سوہن راہی

اُجلی اُجلی میری چُنریا
کورا کورا رنگ تھا جس کا
دگی دگی بکھری ہے
سر سے کیسے اتری ہے اب یہ میری چُنری ہے۔
تن بندھن کو توڑ نہ پاؤں
آنسوؤں ندیا ڈوبی جاؤں
کون ڈگر یا بابل گاؤں
بسرا ساتوریا کا گاؤں
روٹھے پل کی ہر اک تکلی
سوچ گگن میں اُبھری ہے۔ اُجلی اُجلی میری چُنریا۔
جس ڈھولی میں عمر بتائی
جس میں جیون جوت جلائی
جس دھڑکن میں گونج ہے میری
وہ ہی مجھ کو راس نہ آئی
جس میں سندر سانجھ سویرے
وہ ہی میری نگری ہے۔ اُجلی اُجلی میری چُنریا۔
جس نے مجھ کو سراپ دیا ہے
جیون کو بن باس کیا ہے
اور میں نے اپنے ہاتھوں سے
رشتوں کا سب زہر پیا ہے
راہی جس سے تلک کیا تھا
وہ مانگ کیا مانگ ہے۔ اُجلی اُجلی میری چُنریا۔

بوکاٹا

پروفیسر خیال آفاقی

اس سے پہلے کہ ڈور کٹ جائے
اور تیری پتنگ پھٹ جائے
اپنا مانجھا سمیٹ لے جاناں
اپنی چرخی لپیٹ لے جاناں
ایک فرصت نکال کر کچھ دیر
اک نظر من کی آرسی میں ذرا
جھانک کر دیکھ لے کہ تو کیا ہے؟
تو بسنتی نہیں ہے لیلیٰ ہے
دیس تیرا نہیں ہے گنگ و جمن
قیس کا دشت ہی ہے تیرا وطن
تو مگر کھیل میں ہے ایسی مگن
کہ تجھے کوئی بات یاد نہیں۔
ہاں مگر جب بھی ہوش آئے گا
یہ تخیلہ تجھے رلائے گا
پر بہت دیر ہو چکی ہوگی
تیرا مانجھا الجھ چکا ہوگا
ڈور بھی تیری کٹ چکی ہوگی
اور پتنگ کٹ کے پھٹ چکی ہوگی
وقت پھر اپنی روشنائی سے
لوحِ عبرت پہ لکھ رہا ہوگا
"اس فلک کے تلے' زمیں اوپر
جس نے جو بویا اس نے وہ کاٹا"
اس لئے سوچ! وقت ہے اب بھی
اس سے پہلے کہ پیچ پڑ جائیں'
رات کا مانجھا اور دن کی ڈور
دونوں آپس میں ہی الجھ جائیں
اور اڑنے سے پہلے ہی گڈی
بے پرو بے کمان ہو جائے
میری یہ بات مان لے جاناں
اس حقیقت کو جان لے جاناں
تیرا رستہ نہیں گلی کوچہ
تیری منزل نہیں ہے چوبارا
یہ اڑانیں نہیں ہیں تیرا مقام
تیرا منصب نہیں ہے "بوکاٹا"

زندگی کے رنگ

تبسم اخلاق ملیح آبادی

ساتھ چلتا ہے تو چل
یا ڈگر اپنی بدل
کہکشاں قدموں میں ہے
موت تو رستہ بدل
تو صدف ہے یاد رکھ
ذات سے موتی اگل
زندگی خاموش! چپ
ہو گئے اعصاب شل
یاں غموں کی بھیڑ ہے
ایسی دُنیا سے نکل
نفرتوں کی باڑھ کو
اپنے پیروں سے کچل
جان لیوا کس قدر
تیرگی کا ایک پَل
سب کی اپنی مشکلیں
سب کے اپنے اپنے حَل
بن کے خوشبو پھیل جا
رنگ میں تتلی کے ڈھل
مال و زر ہے ان دنوں
ہر پریشانی کا حل
زندگی کے رنگ کو
تو ہتھیلی پر تو مَل
کب تجھے سوچا نہیں
کوئی لمحہ؟ کوئی پَل؟
تو نہ ہو جب سامنے
آنکھ بن جاتی ہے تھل

آدمی کو آدمی کھانے لگا

بھگوان داس اعجاز

کہتا کار تُو چل اُدھر، چلیں احمد آباد
وہیں کریں گے ہم کہیں، کہتا نگر آباد
پہنچا کیسے شہر میں، پریشان مہمان
لوگ سبھی ہیں سر کٹے ہو کیسے پہچان
ہمسائے کا گھر جلا خوش تھے میرے لال
لپٹ گئی اپنا جلا، کیوں نا ہوئے نہال
منظر تھا شمشان کا، دیکھا چاروں اور
ملبوں کے ڈھیروں تلے، تھا روح فرسا شور
شرپسند کچھ تھے وہاں، تبھی تو بگڑی بات
پنگا دنگا بن گیا، جلا نگر گجرات
بیگانوں سے کیا گلہ، گھر میں ہے غدار
آس پاس رکھئے نظر، آنکھیں رکھیے چار
ایک تماشہ بن گئی، گھر باہر کی جنگ
لوگ دیکھتے شوق سے، کٹتی ہوئی پتنگ
اک دوجے کے خون کے پیاسے ہیں شیطان
ہمسائے تھے دیوتا، کون بھر گیا کان
بنے گاؤں کے چودھری، اندھے کانے لوگ
دو فرقوں میں بٹ گئے، وہاں سیانے لوگ
لگا سبھی کچھ داؤ پر، دین دھرم قانون
سڑکوں پر بہنے لگا، انسانوں کا خون
جس نے تیرے تیر سے، جلتے تیاگے پران
تو اس کا نزدیک سے، چہرہ تو پہچان
مرنے والا کون تھا تو اتنا تو جان
وہ مکان کس کا جلا، کس کی جلی دکان
یہ مندر ویران ہے، وہ مسجد ویران
کھلے عام قاتل پھرا، چپ کیوں تھا بھگوان

دوہے

کاوش پرتا پگڑھی (بھارت)

چندن بن کو کھا گئی، دھو دھو کرتی آگ
جوہی رانی کا لٹا کیسے آج سہاگ

آخر اس میں بحث کیا، کیا قد کیا آکار
اپنی رچنا کو اگر، پوجے رچنا کار

چمتکار ہی کو جگت، کرتا ہے پرنام
ہم کو تم کو کس لیئے کوئی کرے سلام

لٹتا رہا وہ عمر بھر دن میں بار مبار
آخر دیہاتی رہا، میرا شہری یار

کہاں کہاں گھومے نہیں، بدل بدل کر بھیس
ہم نے اپنے آپ کو ڈھونڈا دیس بدیس

آج مرے ہی ساتھ کیا، سدا رہی یہ بات
جیتے جی فنکار کے، بچے رہے اناتھ

کاوش صاحب شہر میں، پھیلا کیسا روگ
ننگے ہو کر رات دن، ناچ رہے ہیں لوگ

تم مرے پاس مرے تب آ جانا

علی آذر

جب اندھیاری ہو رات بہت
اور بگڑ گئی ہو بات بہت
آنکھوں میں ہو برسات بہت
چبھتی ہو دل میں مات بہت
تم پاس مرے تب آ جانا
من آنگن میں جب شام ڈھلے
امبر کا سورج ہاتھ ملے
پُروائی جانے کہاں چلے
جب سینے میں اک آگ جلے
تب پاس مرے تم آ جانا
جب روٹھے پھولوں کا موسم
ہر جائی ہو جائے ہم دم
جب سانس چلے مدھم مدھم
تنہائی کا جب ہو عالم
تب پاس مرے تم آ جانا
آنکھوں سے منزل اوجھل ہو
جو رستہ ہو وہ دلدل ہو
کاندھوں پر زندگی بوجھل ہو
صدیوں پر بھاری ہر پل ہو
تب پاس مرے تم آ جانا
جب اپنے کنارا کرنے لگیں
سائے سے تمہارے ڈرنے لگیں
انجانے بن کے گزرنے لگیں
جو ساتھ تھے سارے بکھرنے لگیں
تب پاس مرے تم آ جانا

یادوں کی تثلیث

شگفتہ نازلی

پھر وہی اجنبی سا چہرہ
انجانے سے موڑ پہ ٹھہرا
یادوں کی دُھند میں لپٹا سا!

چار دیواری میں گھٹی ہے
چاندنی جیسی اک صُورت
یادوں کی چادر کو اوڑھے!

مہک وہی پھر آئی ہے
پگ پگ پہ بکھرائے پھول
یادوں کی سوغات لئے!

رات سُہانی ہوتی ہے
جس کے پھیلے آنچل پہ
یادوں کے تارے دمکے ہوں!

وہ موسم تنہا کر دے
جب جذبوں کی شاخوں سے
یادوں کے پتے گرتے ہیں!

ذہن شگفتہ رہتا ہے
جب کوئی سُندر سی سوچ
یادوں کی کھڑکی سے جھانکے!

ہائیکوز

بزم آرا بزمی

جنگل رہتے ہیں
سانپوں سے بچتے ہیں تو
انساں ڈستے ہیں

☆

دولت سے ہے پیار
لوگ چلتے ہیں دیس پرائے
چھوڑے رشتے دار

☆

بنتا ہے شاطر
نظریں پھیرے ایماں سے
دولت کی خاطر

☆

انساں ارزاں ہے
اس کی گھٹتی قیمت سے
دھرتی لرزاں ہے

☆

کٹ جائے گی رات
خنکی، جگنو، چندا اور
تاروں کی بارات

☆

راہ بری کا روپ
رہزن بھر کر بیٹھے ہیں
پہچانو بہروپ

محبت تو زمانہ ہے

شبہ طراز

محبت خواب ہے..... شاید!
مگر یہ خواب تو آنکھوں کی اس دہلیز سے
باہر نہیں آتے۔
محبت کی کوئی سرحد نہیں ہوتی
محبت آس ہے... شاید ....!
مگر یہ آس تو ایک دن اچانک ٹوٹ جاتی ہے
محبت ٹوٹتی کب ہے؟
محبت راگ ہے.... شاید!
مگر ہر راگ ہی محتاج ہوتا ہے
کسی آواز کا.... یا ساز کا
محبت ساز پر .... آواز پر کب منحصر ہے؟
محبت اشک ہے.... تو اشک بھی
رخسار پر ہی سوکھ جاتا ہے
محبت تو سدا شاداب رہتی ہے....
محبت لفظ ہے تو حرف کا محتاج ہوتا ہے
یہی الفاظ منہ سے جب نکلتے ہیں
فضا کی وسعتوں میں ڈوب جاتے ہیں
محبت گم نہیں ہوتی ....
محبت راستہ ہے دوستی ہے یا اداسی ہے....
مگر رستے اچانک چھوٹ جاتے ہیں
تعلق ٹوٹ جاتے ہیں....
اداسی راستوں کے دوستوں کے چھوٹ جانے کا
بہانہ ہے....
محبت تو زمانہ ہے....
ازل سے ہے ابد تک اس سے
دل والوں کا....
ہر پل دوستانہ ہے....
محبت تو.... زمانہ ہے....!!

شہرِ مزاح کا شاہِ خوباں

محسن احسان

جس بچے نے یکم جنوری 1916ء کو چک عبدالخالق کے ایک غریب اور غیور گھرانے میں آنکھ کھولی تھی وہ اس نے دنیا کے آباد ترین اور امیر ترین شہر نیویارک میں 12 مئی 1999ء کو ہمیشہ کے لئے بند کر لی۔ ایسے لگا جیسے کائنات کی ایک روشن اور چمکتی ہوئی آنکھ بجھ گئی۔ ضمیر جعفری نے پورا وقت ادبی اور عسکری محاذوں پر بڑی جواں ہمتی اور حوصلہ مندی سے عزت و وقار اور احترام و محبت سمیٹتے ہوئے گزارا۔

زندگی سے اتنی مہلت کی بھی کب امید تھی
اپنی پیدائش میں اپنی موت کی تمہید تھی

میرا ضمیر جعفری سے نیاز مندی کا شرف نصف صدی سے زیادہ پر محمول ہے۔ ستمبر 1948ء میں ایبٹ آباد میں ایک بڑے مشاعرے کا انتظام ہوا جو پروفیسر شوکت واسطی اور کیپٹن ضمیر جعفری کے ہاتھ میں تھا۔ ایک نوآموز شاعر کی حیثیت سے بلاوا آ گیا۔ اس میں حفیظ جالندھری، عبدالحمید عدم، عبدالعزیز فطرت، مرزا محمود سرحدی، خمار دہلوی، کرم حیدری، کلیم جلیسری اور بعض دوسرے شعرا مدعو تھے۔ صدارت میرا کمانڈر میجر جنرل نذیر احمد نے کی۔ 11 ستمبر 1948ء کو قائداعظم نے رحلت فرمائی اس لئے ان کے سوگ میں پرچم سرنگوں اور بازوؤں پر کالی پٹی باندھنے کی ہدایت تھی۔ میرے پاس ایک تصویر ہے جس میں یہ بھی شعرا موجود ہیں اور میں اور طالب علم صادق ملک مرحوم دونوں زمین پر ضمیر جعفری اور حفیظ جالندھری کے قدموں میں بالترتیب بیٹھے ہیں۔ اس وقت سے لے کر ضمیر صاحب کی زندگی کے آخری لمحے تک میں نے یہی محسوس کیا کہ میں ان کے قدموں میں بیٹھا ہوا ہوں۔ مجھے ان کے ساتھ اندرون ملک اور بیرون ملک دونوں مقامات پر سینکڑوں مشاعرے پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ ہم سفری کے مواقع میسر آئے۔ وہ جب بھی ملتے والہانہ خلوص و محبت اور دوستانہ بے تکلفی اور خوشدلی کے ساتھ کہ عمروں کے تفاوت کا دور تک نشان نہ ملتا۔ میں نے ہمیشہ یہی محسوس کیا کہ ان کی شفقتیں، محبتیں اور عنایتیں مجھے میسر آئی ہیں۔ ضمیر جعفری نے سنجیدہ اور مزاحیہ شاعری دونوں میں بڑا نام کمایا۔ دونوں اسلوب میں بھرپور شاعری کی۔ اپنے قاری یا اپنے سامع کو کبھی مایوس نہیں کیا۔ فن کو فکر کی بالیدگی سے روشناس کرایا۔ ظرافت نگار کے لئے ظریف ہونا ہی ضروری نہیں باظرف ہونا بھی لازمی ہے۔ اور ضمیر جعفری میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود تھی۔ ظرافت نگاری اپنے لہو کی آگ میں مسلسل جلنے کے عمل کا نام ہے۔ مشتاق احمد یوسفی نے لکھا ہے کہ ”لکڑی جل کر کوئلہ بن جاتی ہے اور کوئلہ راکھ لیکن اگر کوئلے کے اندر کی آگ باہر کی آگ سے تیز ہو تو پھر وہ راکھ نہیں بنتا ہیرا بن جاتا ہے“۔ ضمیر جعفری اپنے اندر کی آگ میں اتنے تپے کہ وہ راکھ تو نہیں کوہ نور بن کر تاجِ ظرافت میں جگمگانے لگے۔ انہوں نے مصرعوں کی کاٹ، الفاظ کی نشست و برخاست، مقامی زبانوں کی آمیزش، پنجابی کلاسیکی شعرا سے استفادہ اور تشبیہات و استعارات کا برمحل استعمال ایسی خوبصورتی اور فنکارانہ چابکدستی سے کیا کہ ہر مصرع طاؤسی رقص کی مثال بن گیا۔ انہوں نے اپنے گہرے مشاہدے اور شوخی آمیز ذہانت سے جہاں زندگی کی بے اعتدالیوں اور کج ادائیوں کا مذاق اڑایا ہے وہیں انہیں اپنے آپ پر ہنسنے کے قرینے سے بھی آشنا کیا ہے۔ خلقِ خدا کے زخموں پر پھاہا رکھنا اور ان کی بیماریوں کی نشاندہی کرنا ایک مشکل کام ہے اور یہ مشکل کام ضمیر جعفری بڑی ماہرانہ دیانتداری کے ساتھ زندگی بھر کرتے رہے۔ ان زخموں کا علاج عطائی سیاستدانوں، کلائی بیوروکریٹوں، خدائی چاپلوسوں اور خدائی فوجداروں کے ہاتھ میں تو نہ تھا مگر ان کی ریاکارانہ کارکردگیوں کی پردہ کشائی ضمیر جعفری نے اپنا آخری فریضہ سمجھ کر ادا کیا۔ ہماری قوم میں محبتیں بانٹنا اور اسے چہکنے اور قہقہے لگا کر اس کے پھیپھڑوں کو توانائی عطا کرنے کا قرینہ اپنی ادبی ذمہ داری سمجھ کر نبھاتے رہے۔ عصری زندگی کے تمام مسائل کو موضوعِ سخن بنایا۔ اور اسے اپنے مخصوص رنگ میں پیش کیا۔ اپنا مذاق خود اڑانے کے لئے جس کلیجے اور جس شگفتہ ذہن کی ضرورت ہوتی ہے وہ ضمیر صاحب کے پاس موجود تھا۔ ان کا مزاح مہذب بھی ہے باوقار بھی اور شائستہ بھی۔ ان کی نظم ذیل کا سفر ہماری ریلوے کی بے کسی و بے بسی کی بہترین عکاسی کرتی ہے۔

نہ گنجائش کو دیکھو اس میں نہ تو مردم شماری کر
لنگوٹی کس خدا کا نام لے گھس جا سواری کر
عبث گنتی کی کوشش کر رہیں کتنے نفوس اس میں
کہ خلقے کا ہجوم اور تیرا بھی جلوس اس میں
یہ سارے کھیت کے گنے کٹا لایا ہے ڈبے میں
وہ گھر کی چارپائی تک اٹھا لایا ہے ڈبے میں
کھڑے ہے جو بیچارا آتش دان تو دیکھو
یہ قیمہ بے سروساماں کا ساماں تو دیکھو
وہ اک مدت میں پورا لاؤ لشکر باندھ لائے ہیں
یہ بستر میں ہزاروں تیر و نشتر باندھ لائے ہیں
صراحی سے گرا اوندھی سے دسترخوان لٹتا ہے
مسافر خود نہیں لٹتا مگر سامان لٹتا ہے
وہ حضرت جو عوام الناس میں گھل مل کے بیٹھے ہیں
رضائی میں جو یوں بیٹھے ہیں گویا سل کے بیٹھے ہیں
جبر کو خوش نہادی کی صلائے عام ہوتے ہیں
ہر سو تھوکنے کا عرض بھی انجام ہوتے ہیں
کسی نے یوں گھر پہ گفتگو پر زور ڈالا ہے
کہ جیسے اگلا اسٹیشن پشاور ہونے والا ہے

زمیں آباد کبھی اور غیر آباد کبھی ہے
تری تنخواہ کیا ہے غیر سے امداد کبھی ہے

وہ ہجرت بیچارہ مرحوم اپنے ساتھ کیا لائے
زر و زیور وہیں چھوڑ کر حق اٹھا لائے

اسی طرح ان کی دوسری نظمیں 'لاشمنٹ' 'عورتوں کی اسمبلی' 'موسیقی کا کرکٹ میچ' 'ماسٹر پیس' 'پاکستانی فلمیں' 'دستور' 'درس عبرت' 'مسٹر کھلا' 'آدمی' 'صاحب اولاد' 'سڑکیں بنیں کا سفر' 'پولی سوشکار' 'فرق' 'مسدس بے حالی' 'مسز ولیم' 'موت' 'محاذ جنگ' 'دودھ والی' 'دہرکتی' اور کئی دیگر ہماری سماجی' معاشرتی' سیاسی اور اخلاقی زندگی کے دیوالیہ پن کی عکاسی کرتی ہیں۔ سیاسی راہنما جھوٹے وعدے وعید کے ذریعے عوام کے ووٹ کے حصول کے لئے فریب کا ہر جال بچھاتے ہیں اور کامیابی کے بعد نہ اُن سے وعدے کا پاس رہتا ہے نہ دکھ درد کا احساس یہی حال مذہبی ٹھیکیداروں کا ہے کہ گفتار کے زیادہ اور کردار کے غازی کم ہوتے ہیں۔ ان کی ریاکارانہ اور متعصبانہ خطابت سادہ' ان پڑھ اور کم تعلیم یافتہ فرد کو تو روں کی دلدل میں پھنسا رہی ہے۔ مذہبی منافرت اور فرقہ واری کی ایک جھلک:

مساجد میں کہیں خطبہ یہ جھگڑا ابھی پا دیکھا
ہدی تیری ہے یا میری خدا تیرا ہے یا میرا

تو اِن فرقہ وارانہ سے مومن پر نہیں کھلا
تو اس تیری ہے یا میری خدا تیرا ہے یا میرا

ایک اور نظم انہوں نے امریکہ کی ریاست کولوراڈو کے صدر مقام ڈینور میں ایک ایسے کروڑ پتی افغان کے عالی شان کلب پر لکھی جس کا نام اس نے خیبر پاس رکھا اور جہاں امریکی اور دیگر غیر ملکی پری چہرگان برہنہ رقص و نغمہ کا جادو جگاتی ہیں اور بعض مسلمان ملکوں کے دولت مند رنگین وطن اور دنیا سے فرصت و فراغت کی زندگی بسر کرکے انہیں داد عشرت و عریانی دیتے ہیں۔ یہ نظم ہماری بے حسی' بے چارگی' بے ضمیری اور بے مروتی پر ایک کھلا طنز ہے۔ اس کا ہر مصرعہ طنز لطیف کا اندوہناک پہلو لئے ہوئے ہے:

خیبر پاس کی گردش کا وجام و سبو میں
'روشنائی' کا شب بھر
رقص برہنہ بدن کیا کہنا
خوش ذائقہ عربیں افغانوں
مرائی اوقات گروں کا
مخمور رقص کی لے مستی میں
ڈوب کے بہنا.... کیا کہنا
ہر جسم و خیال میں رہنا... کیا کہنا
بے حسی... بے غیرت لوگو
جسموں کے سوداگر لوگو
بھول گئے تم اس خیبر میں
اُس خیبر کو
جس کے پتھر لیے دروں میں
خون کا اک سیلاب رواں ہے
بھول گئے تم!
لاکھوں بھوکے ننگے بے گھر افغانوں کو
جن کے لہو نے ہر پتھر پر
ایک امر تحریر لکھی ہے
عظمت کی تفسیر لکھی ہے
صدیوں کی تقدیر لکھی ہے
بھول گئے تم
اُن زخمی کہساروں کو
جن سے گزر گئیں ' تیر انداز ان کی گلیاں
بھول گئے تم
شہدائے کے سوگ میں ڈوبے چناروں کو
اپنے بچھڑے ہمرازوں کو
چادر آب بہ مرغزاروں میں جو آگ لگی ہے
بھول گئے تم اُن شعلوں کو
امریکہ کیا راستو
جام پرستو
یہ جو "خیبر پاس" ہے لوگو
غیرت کا بن باس ہے لوگو
تم کو کچھ احساس نہیں ہے
بھٹکے لوگو
یہ بت خانہ اپنا خیبر پاس نہیں ہے

یہ نظم 20 ستمبر 1987 کو ضمیر جعفری نے اپنے بیٹے احتشام ضمیر کے گھر لکھی۔ اس میں جو کرب چھپا ہوا ہے اُس کا احساس صرف وہی کرسکتا ہے جس کے اندر غیرت و حمیت کی رمق باقی ہو۔ مجھے لگتا ہے ہماری حمیت کا پیڑ سوکھ رہا ہے اس کی جڑیں کھوکھلی ہورہی ہیں۔ ضمیر جعفری نے اقدار کی شکست و ریخت 'زندگی' ادب اور سیاست کی الجھنوں' ذاتی مفادات کی بھاگ دوڑ' سماجی عدم توازن' ناہمواریاں' بے اعتدالیاں' تعلیمی انحطاط اور اقربا پروری کو نشانہ بنایا۔ اُن کی نظر مسائل کے در پردہ کارفرما قوتوں تک پہنچ جاتی تھی۔

جب ایک صوبے میں اک سولہویں وزیر بنا
کسی نے پوچھا کہ مصرف تو ان کا سمجھانا
تو اک ظریف نے بے ساختہ کہا یہ ضمیر
حضور وہ ہیں جمہوریت کا جرمانہ

ایک اور مقام پر اس جذبات پر یوں طنز کیا:

قصرِ شاہی بلند ہے اتنا
اتنا اونچا تو آسماں بھی نہیں
خیر ہو بزمِ دوستاں کی خیر
جتنے عہدے ہیں کرسیاں بھی نہیں

اسی طرح 1954ء میں وزارتوں کے بننے اور ٹوٹنے کی ریل پیل کے زمانے میں جو کہا وہ آج کے حالات پر بھی صادق آتا ہے:

یہ وزارت خلوص کی تصویر
یہ حکومت حیات کی تدبیر
یہ سلامت رہے ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن ہزار وزیر

ایک اور شعر میں اسی بات کو اس طرح کہا

کچھ کھنچے ہیں' چند سالے ہیں
عہدے تقسیم ہونے والے ہیں

اسی طرح پہلے دستوری خاکہ جو منظور نہ ہو سکا تو ضمیر جعفری نے لکھا:

یہ کیا عجب سا دستور اے حضور تھا
کرسیاں کے لئے ہے تو دھڑ وہاں کے لئے
تصورات فرنگی ثقافت امریکی
خدا کا نام فقط تازۂ بتاں کے لئے
لگا کے جبہ و ریش و کلاہ چوپال کے
یہ قوم اک نمونہ ہے دو جہاں کے لئے

پاکستان کی سیاسی زندگی کی ساری بدعنوانیاں گمراہیاں' ناانصافیاں' نا آسودگیاں' محرومیاں' ستم ارزانیاں اور مہربانیاں اُن کی نظم و نثر کی تقریباً ہر درجن کتابوں پر بکھری پڑی ہیں۔ ان میں قومی سطح پر ہونے والی اخلاقی اور روحانی دیوالیہ پن کی جھلکیاں موجود ہیں۔ ان کا مشرقی تہذیب و اقدار سے لگاؤ اور مغربی تمدن کی نئی تہذیب اقدار کی زوال پذیری ان کا خاص موضوع تھا۔ وہ واقعہ کے کمزور اور قبیح پہلوؤں کا سنجیدہ الفاظ میں ایسا خاکہ کھینچتے تھے کہ .... ضمیر جعفری نہ تو لیڈر تھے جو قوم و ملک کی سیاسی رہنمائی کرتے نہ واعظ و خطیب کہ اپنے وعظ اور زورِ خطابت سے ملت کو سیدھی راہ پر ڈال دیتے نہ کوئی فلسفی تھے کہ فلسفیانہ گتھیوں کو سلجھاتے چلے جاتے نہ ماہرِ نفسیات تھے کہ انسان کی نفسانی اور جنسی خواہشات اور جبلتوں کی تاویلیں کرتے۔ وہ تو شاعر تھے اور بڑے کاٹ دار شاعر تھے معاشرے کی ناہمواریوں پر تیر برساتے تھے وہ منافقت تعصب رشوت خوری بے انصافی اور دیگر سماجی برائیوں کی طرف اشارے کرتے تھے۔ انہوں نے کتنی جرأت مندی سے یہ سوال پوچھا تھا:

رشوت بھوک جہالت اور بے کاری سے
اپنی سادہ لوحی یا غیر ضروری عیاری سے
خانہ جنگی کالی منڈی قاتل تیرہ بازاری سے
لوگو ہاتھ بلند کرو اپنا زیرِ پسند کرو مرو گے کس بیماری سے

مشرقی اور مغربی دنیا کے درمیان سائنسی اور صنعتی ترقی پر جو فرق پایا جاتا ہے' انہوں نے چار مصرعوں میں کس خوبصورتی سے سمیٹا ہے:

ہر نئی ایجاد نے اس بات کی تصدیق کی
یہ جہان آب و گل اک دستِ کوزہ گر میں ہے
پوچھتے ہو ایشیا کا اور امریکہ کا فرق
جو ہمارے گھر میں ہے ان کے عجائب گھر میں ہے

ضمیر جعفری نئی نسل کی بے راہروی اور کج فکری پر کڑھتے تھے لیکن اس الجھن کو بھی بڑے شائستہ انداز سے انہوں نے نظم غلط فہمی کے تین مصرعوں میں یوں ادا کر دیا۔

پیرہن کو آئینہ دار بدن سمجھا تھا میں
الاماں' ریشم کے اس دوشیزہ پیراہن کی چھب
اچھے خاصے مرد کے بچے کو زن سمجھا تھا میں

مرزا محمود سرحدی ضمیر جعفری کے پرانے دوستوں میں تھے۔ جعفری صاحب مرزا کے طنز کے بھی قائل تھے مرزا نے اسی مضمون کو اپنے انداز میں یوں کہا

کیا کہوں گیسو بنانے میں وہ کتنے فرد ہیں
پشت کی جانب سے عورت سامنے سے مرد ہیں

مشتاق احمد یوسفی نے چارپائی اور کلچر پر ایک بڑا دلچسپ مضمون لکھا ہے وہ کہتے ہیں:

"چارپائی ایک ایسی خود کفیل تہذیب کی آخری نشانی ہے جو نئے تقاضوں اور ضرورتوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے نت نئی چیزیں ایجاد کرنے کی قائل نہ تھی بلکہ ایسے موقعوں پر پرانی چیزوں میں نئی خوبیاں دریافت کر کے مسکرا دیتی تھی۔ اس عہد کی رنگا رنگ مجلسی زندگی کا تصور چارپائی کے بغیر ممکن نہیں۔ اس کا خیال آتے ہی ذہن میں بہت سے سہانے منظر ابھر آتے ہیں۔ اجلی اجلی ٹھنڈی چادریں' خس کے پنکھے' کچی مٹی کی سن سن کرتی کوری صراحیاں' چھڑکاؤ سے بھیگی زمین کی سوندھی سوندھی لپٹ اور آم کے لدے پھندے درخت جن پر آموں کی بجائے لڑکے لٹکے رہتے ہیں اور ان کی چھاؤں میں جوان جسم کی طرح کسی کسائی ایک چارپائی جس پر دن بھر شطرنج کی بساط یا رمی کی پھڑ جمی اور جو شام کو دسترخوان بچھا کر کھانے کی میز بنا لی گئی ذرا غور سے دیکھئے یہ وہی چارپائی ہے جس کی سیڑھی بنا کر سگھڑ بیبیاں مکڑی کے جالے اور چلبلے لڑکے چڑیوں کے گھونسلے اتارتے ہیں۔ اسی چارپائی کو وقت ضرورت پٹیوں سے بانس باندھ کر اسٹریچر کے قابل بنا لیتے ہیں۔ اسی طرح مریض جب کھاٹ سے لگ جائے تو تیماردار حسبِ ضرورت اس کے وسط میں بڑا سا سوراخ کر کے اول الذکر کی مشکل آسان کر دیتے ہیں۔ اور جب ساون کی کالی کالی گھٹائیں اٹھتی ہیں تو ادوان کھول کر لڑکیاں دروازے کی چوکھٹ اور والدین چارپائیوں میں جھولتے ہیں۔ اسی پر

بیٹھ کر مولوی صاحب تختی کے ذریعے اخلاقیات کے بنیادی اصول ذہن نشین کراتے ہیں۔ اس پر نو مولود بچے ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں چند مہینوں میں آنکھیں کھول کر اپنے والدین کو دیکھتے اور روتے ہیں اور اس پر دیکھتے ہی دیکھتے اپنے پیاروں کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔"

ضمیر جعفری نے دو اشعار میں چارپائی کے بارے میں اپنے تاثرات یوں بیان کئے ہیں:

چارپائی کے یہ معنی ہیں کہ تن آسانی نہ ہو
خانہ آبادی بجائے خانہ ویرانی نہ ہو
وقت کی رہزن ہے یہ یا رنج کا مدفن ہے یہ
بالخصوص اقوام مشرق کی بڑی دشمن ہے یہ

ضمیر جعفری کے ہاں نہ موضوع کی یکسانیت ہے نہ تکنیک کی۔ جب انہیں لندن میں گھٹنے کے آپریشن پر چار لاکھ کا بل ادا کرنا پڑا تو وہ کہہ اٹھے:

کل ادا شاید یہ گھٹنا ہے مرے مرنے کے بعد
میرے بچے میرا گھٹنا بیچ کر کھاتے رہو

ضمیر جعفری کو عزت و احترام بخشنے کے لئے جب جہلم کی ضلعی کونسل نے یہ فیصلہ کیا کہ ان کے نام کی ایک سڑک چک عبدالخالق میں تعمیر کی جائے تو اس وقت کے بیکر ضمیر جعفری نے کتنے دکھ بھرے انداز سے یہ لکھا کہ:

شکریہ جہلم کی ضلعی کونسل کا شکریہ
رکھ دیا ہے اک سڑک کا نام میرے نام پر
جن سڑکوں گاموں میں کھیلا ہے میرا بچپن ضمیر
اس مسافت کی رفاقت دور تک رکھتا ہوں میں
یوں دیا آخر مری خانہ بدوشی نے خراج
گھر تو میں رکھتا نہیں لیکن سڑک رکھتا ہوں میں

مجھے یہ معلوم نہیں کہ چک عبدالخالق میں ضمیر جعفری کے نام کی سڑک تعمیر ہوئی یا نہیں۔ اور اگر تعمیر ہوئی تو اب اس سڑک کی حالت کیسی ہے لیکن اس وقت ان کی ایک نظم یاد آرہی ہے خدا کرے یہ سڑک ایسی نہ ہو۔

زمیں پر آدمی کی اولیں ایجاد یہ سڑکیں
پرانے وقت کے اجداد کی اولاد یہ سڑکیں
مرمت کی حدوں سے ذرا کہ ملیامیٹ یہ سڑکیں
ہمارے شہر کی مادر پدر آزاد یہ سڑکیں
دکانوں سے سرک کر آگئے بازار سڑکوں پر
کھڑے مدتوں کے "بائو انبار" سڑکوں پر
کبڈی کھیلتے ہیں ارشد و ابرار سڑکوں پر
یہاں رمضان گھر میں ان کے برخوردار سڑکوں پر
سوا روٗ دیکھتا ہیں صاحب اولاد یہ سڑکیں

ضمیر جعفری نے جہاں طنز و مزاح کے نوکیلے نشتر چلائے ہیں وہیں محبتوں کے نغمے بھی الاپے ہیں۔ وطن کے حضور عقیدتوں کے نذرانے پیش کئے ہیں بے شمار ملی نغمیں ترانے اور گیت دئے ہیں۔ ملک و ملت کی آبرو بڑھانے کے لئے اپنے قلم اور حرف کو استعمال کر کے ادبی محاذ پر ایک بہادر سپاہی کی طرح لڑے ہیں۔ ان کا "زیور وطن" کے نام سے شائع ہونے والا یہ مجموعہ ہماری قومی اور ملی شاعری میں بڑا خوبصورت اضافہ ہے۔ انہیں اپنی ماں اور گاؤں سے اتنی محبت تھی کہ اس کتاب کا انتساب کرتے ہوئے لکھا:

"مجھے میری والدہ محترمہ سیدہ سردار بیگم مرحومہ اور میرے گاؤں چک عبدالخالق نے جنم دیا۔ میں اپنی تخلیقات کو ان دونوں ماؤں کے نام منسوب کرتا ہوں۔"

اس مجموعے میں ان کی سرزمین سے سچی محبت کی دل گداز سچائیاں ہر ہر لفظ سے جھانکتی ہیں۔ وہ اپنی غزلوں، نظموں، گیتوں اور مضمون کو جب دلکش ترنم سے پڑھتے تو ان کے انداز کے والہانہ پن کی دل آویز تصویریں آنکھوں میں نقش ہو جاتیں۔ انہوں نے ایڑیاں اٹھا کر بلندیوں کی طرف لپکنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اپنی زمین پر پاؤں جما کر افلاک کو دسترس میں لانے کا حوصلہ پیدا کیا ان کے ہاں فکر و خیال کی جگالی نہیں ملتی بلکہ جذبہ و احساس کی تازگی اور خوشبو ہر ہر رگ رگ میں اترتی محسوس ہوتی ہے:

مری پاک سرزمیں مری پاک زمیں
مرا فخر مرا دم مری جاں ہے تو
مری ہمت مری چھب مری جہاں ہے تو
سدا خوش رہے سدا خوش تجھے
خون سے گا جیسے کا ہر قطرہ خون پسینے کا
ترے کوہ گراں شہروں کو تری نہروں کو تری کی لہروں کو
چپے دستوں کم سید قوں کو ان کھیتوں ان کھلیانوں کو
تری بستیں اور پیاں ہوں گی تری گلیاں وسدا ہوں گی
ترے پھلت اور حسیں ہوں گے تری شامیں اور جوں ہوں گی
تری مانگ گلوں سے بھر دیں گے تجھے جگمگ جگمگ کر دیں گے
سدا خوش رہے سدا خوش تجھے مری پاک زمیں

ضمیر جعفری کو بچھڑے چار برس ہو گئے ہیں لیکن ان کی تر و تازہ باتیں، ان کی یادیں، ان کی شگفتہ تحریریں دل موہ لینے والی غزلیں، کتنی اور نوکیلی طنز و ظرافت سے بھرپور نظمیں زبان و بیان کی چاشنی الفاظ و تراکیب کا دلچسپ امتزاج اور ان کی وسیع القلبی ہماری زندگیوں کا ناقابل فراموش سرمایہ ہیں۔ وہ بڑی باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔

دل ربیں صوم و دستار رہیں میکدہ
تھا ضمیر جعفری بھی اک مزیدار آدمی

(اسلام آباد میں چوتھی برسی کے موقع پر پڑھا گیا)

محمد حسن عسکری کی تنقید

تحسین زہرا

محمد حسن عسکری اردو کے ایک اہم نقاد تھے۔ اتنے اہم کہ ان کے نام سے ایک مکتبِ فکر وجود میں آیا جس کے اہم ارکان میں سلیم احمد، سجاد باقر رضوی، شمیم احمد، جمیل احمد خان، جمال پانی پتی اور سراج منیر شامل ہیں۔

محمد حسن عسکری اردو تنقید پر نصف صدی سے زیادہ عرصہ چھائے رہے لیکن دیگر ناقدین کی طرف سے اُن پر یہ اعتراض مسلسل وارد ہوتا رہا کہ اُن کے تنقیدی نظریات میں استحکام نہیں ملتا اور اُن کے ادبی (تنقیدی) نظریات میں تیزی سے تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔

محمد حسن عسکری نے 1943ء میں "میرا بہترین افسانہ" کے عنوان سے اُس دور کے چودہ بہترین افسانوں پر مشتمل ایک انتخاب مرتب کرتے ہوئے اُس کے دیباچہ میں لکھا تھا:

"میں صرف آرٹ چاہتا ہوں، صرف وہی آرٹ خواہ اُس میں سماجیات، سیاسیات یا دوسری فضولیات کی بھی آمیزش / آلائش ہو مگر سب سے پہلے اُسے آرٹ ہونا چاہیے۔"

ان سطور کو لکھنے سے تین برس قبل 9 نومبر 1939ء کو اُن کے پہلے افسانے "کالج سے گھر تک" کی تکمیل عمل میں آئی۔ (اشاعت: "ادبی دنیا" اگست 1940ء)

ان سطور کو لکھنے کے بعد انہوں نے لینن کی کتاب "سیاست اور انقلاب" طباعت اول: 1943ء کا ترجمہ کیا۔

1943ء میں ہی اُن کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "جزیرے" شائع ہوا۔ 1947ء میں افسانوں کا دوسرا مجموعہ "قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے" نکلا۔ اسی زمانے میں میکسم گورکی کی مختصر کتاب "میں ادیب کیسے بنا" طباعت اول: 1943ء کو ترجمہ کیا اور 1944ء سے شاہد احمد دہلوی کے دہلی سے شائع ہونے والے ادبی مجلّے "ساقی" میں ادبی کالم نگاری شروع کی۔ یہ اُن کی تنقید سے متعلق ابتدائی تحریریں تھیں جنہیں اُس دور کے ناقدین نے باقاعدہ تنقیدی مضامین سمجھ کر اُن کا خوب خوب مضحکہ اڑایا۔ مثال کے طور پر کلیم الدین احمد نے اپنی کتاب "اردو تنقید پر ایک نظر" کے آخری حصے میں انہیں اردو کا نامور نقاد شمار کر کے یہ لکھا کہ: "وہ صرف اعلان کرتے ہیں، تنقید نہیں کرتے ہیں۔" ("اردو تنقید پر ایک نظر" مطبوعہ عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور طبع دوم جون 1965ء صفحہ 369)

کلیم الدین احمد لکھتے ہیں: "مارکسی فلسفہ کی کاٹ عسکری صاحب کے تاثرات سے نہیں ہو سکتی اور عسکری صاحب کے پاس تاثرات کے سوا کچھ بھی نہیں۔" (ایضاً صفحہ 370)

ایک مقام پر تو کلیم الدین احمد نے یہ لکھ دیا کہ اگر محمد حسن عسکری اتنے صاحبِ مطالعہ شخص ہیں اور انگریزی پر اتنی دسترس رکھتے ہیں تو اردو میں تنقید کیوں لکھتے ہیں، انگریزی میں تنقید کیوں نہیں لکھتے۔ (ایضاً صفحہ 388)

عسکری کے بارے میں کلیم الدین احمد کی آراء کو اس حوالے سے معاصرانہ چشمک بھی قرار دیا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں انگریزی زبان و ادب کے استاد تھے اور جس طرح کی تیزی محمد حسن عسکری میں تھی اسی طرح کی کلیم الدین احمد میں بھی تھی۔ محمد حسن عسکری کی ابتدائی تنقیدی تحریریں "جھلکیاں" کے عنوان سے اُن کی وفات کے بعد رسالہ "ساقی" سے جمع کر کے شائع کی گئیں۔ اُن کا پہلا تنقیدی مجموعہ "انسان اور آدمی" 1953ء میں، جب کہ اُن کا دوسرا تنقیدی مجموعہ "ستارہ یا بادبان" 1963ء میں شائع ہوا۔ تنقید کا تیسرا مجموعہ "وقت کی راگنی" کے عنوان سے 1979ء میں نکلا جب اُن کو فوت ہوئے ایک سال گزر چکا تھا۔ عسکری صاحب کے یہ وہ مضامین تھے جو "ستارہ یا بادبان" کی اشاعت کے دوران لکھے گئے اور جن کا اختتام مودودیت کے تصور کے سلسلے میں ڈاکٹر وحید اختر کے ساتھ اُن کے ایک ادبی تنازعے کے ساتھ ہوا۔ یہ ادبی تنازعہ "شب خون" الٰہ آباد بھارت میں سامنے آیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عسکری صاحب ایک طرف تو پاکستان کی سیاست میں ذوالفقار علی بھٹو کو نجات دہندہ اور رہنما سمجھنے لگے تھے اور دوسری طرف مولانا اشرف علی تھانوی کی تعلیمات کے زیرِ اثر تصوف کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر وحید اختر کے اختلافی مضمون کے جواب میں محمد حسن عسکری نے یہاں تک لکھ دیا کہ اردو ادب کے سب سے بڑے نقاد تو مولانا اشرف علی تھانوی ہیں اور اُن کی تعلیمات کی روشنی میں دنیا بھر کے ادب کو سمجھا جا سکتا ہے۔ یقیناً عسکری صاحب کی اس رائے کو پڑھ کر اُس دور کے ناقدین چکرا گئے ہوں گے کہ اب عسکری صاحب کس جانب چل پڑے ہیں اور اس کا اختتام کہاں ہو گا، تان کہاں ٹوٹے گی۔ اس کے بعد عسکری صاحب نے تنقید نہیں لکھی البتہ چپکے چپکے مولانا اشرف علی تھانوی کے مدرسے کے طالب علموں کے لیے ایک کتاب لکھ ڈالی۔ جس کا عنوان تھا "جدیدیت" (یعنی مغربی گمراہیوں کا خاکہ)

محمد حسن عسکری کے ادبی کالموں کے مجموعے "جھلکیاں" کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ 1943ء تا 1947ء تک اُن پر بیک وقت مختلف تنقیدی افکار و نظریات مرتب ہو رہے تھے یعنی ایک طرف تو وہ "فن برائے فن" کے سب سے بڑے علمبردار والٹر پیٹر سے متاثر تھے تو دوسری جانب عمرانی تنقید کے وہ ابتدائی اصول ساں بیو اور ٹین سے اثرات قبول کر رہے تھے۔ اُن کے ادبی کالم "جھلکیاں" کے مضمون جدید شاعری مطبوعہ "ساقی" 1944ء میں ساں بیو اور ٹین کے اثرات کی جھلک دکھائی دیتی ہے لیکن اسی زمانے میں وہ "آرٹ برائے آرٹ" کا نعرہ بھی بلند کر رہے تھے اور اُن کے خیال میں مذہبی اور سماجی معاملات کا ادب میں دخول غیر واجب تھا جب کہ عسکری کے معترضین یہ کہتے ہیں

کر افلاطون سے لے کر ترقی پسند نقادوں تک فن کی کسی نہ کسی عقیدے یا نظریے کا پابند ضروری رہا ہے۔ مثال کے طور پر مشہور زمانہ مصوری کے شاہکار "مونا لیزا" کے خالق لیونارڈو ونسی کے مصور کردہ انجیل کے چرچ "ماسٹر" مائیکل اینجلو کے بنائے ہوئے حضرت عیسیٰ اور مریم کے مجسمے، اجنتا اور الورا کے غاروں میں دیویوں اور دیوتاؤں کی شبیہیں اور دانتے کے دو شاہکاروں "ڈیوائن کامیڈی" اور "پیراڈائز لاسٹ" ایسے شاہکار ہیں جو مذہبی اثرات کے بغیر جنم ہی نہیں لے سکتے۔

تنقید کیا ہے؟

ابتدا میں عسکری صاحب کے نزدیک ادب میں جمالیاتی اقدار ہی سب سے بڑی چیز ہیں اس لیے وہ فراق گورکھپوری اور پروفیسر حیتن چند ادیب کے شاگرد رہے اور یہ دونوں انگریزی کے استاد الٰہ آباد یونیورسٹی میں عسکری صاحب کی ذہنی تربیت کرتے رہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ابتدا میں عسکری صاحب، ای ایم فورسٹر، آئی اے رچرڈز اور ایف آر لیوس کی تنقیدیں پڑھ کر ادب کی طرف آئے۔ اسی حوالے سے اُن کا مضمون "فراق صاحب کی تنقید" عسکری صاحب کو سمجھنے میں مدد کرتا ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ فراق صاحب نے ہی انھیں کارل مارکس اور مارکسی تنقید کے نام سے آشنا کیا اور آگے چل کر فراق صاحب نے مارکسی نقطۂ نظر سے دور ہٹ جانے کا مشورہ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ عسکری صاحب اس مضمون میں لکھتے ہیں:

"آخر تنقید کا مقصد کیا ہے؟ سیاسی پمفلٹ کا قائم مقام ہونا؟ فارکو فرائڈ اور ہیولاک ایلس سے واقفیت جتانے کا موقع دینا؟"

عسکری صاحب یہ جانتے تھے کہ تنقید، اخلاقیات اور جمالیات سے ہوتی ہوئی نفسیات تک پہنچی اور اس کے بعد تنقید دیگر علوم میں بھی داخل ہو گئی اس لیے عسکری صاحب کے تنقیدی مضامین میں فرائڈ، ٹیلر، ژونگ اور ورانج کے علاوہ ہیولاک ایلس کے ساتھ ساتھ دنیا جہان کے علوم کا مطالعہ بھی دکھائی دیتا ہے۔

اس چیز کی وضاحت نہایت ضروری ہے کہ جب عسکری صاحب "نئی تنقید" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو اس سے اُن کی مراد تنقید نگاری کا "امریکی اسکول" ہوتا ہے۔ وہ آئی۔ اے رچرڈز کی کتاب "پریکٹیکل کریٹی سزم" کو "امپریکٹیکل کریٹی سزم" قرار دیتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ: "وہ واقعی بڑا نقاد ہے اور میرے دل میں اُن کی بڑی عزت ہے۔"

عسکری صاحب تنقید کا مقصد "روح کی تہم" اور "وجدانی کیفیت" تصور کرتے ہیں ابتدا میں عسکری صاحب تاثراتی اور جمالیاتی نقاد تھے لیکن وہ رومانی تنقید کی خامیوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ عسکری صاحب لکھتے ہیں:

"رومانی نقادوں کی خرابی یہ تھی کہ وہ اپنے تاثرات کی وضاحت کرنے کے بجائے انھیں دھندلا بنا دیتے ہیں۔" (مضمون: جدید شاعری سے اقتباس")

عسکری صاحب اپنے مضمون "ادب یا علاج افتراء؟" میں لکھتے ہیں: "ادب ایک مسلسل تجربہ ہے قانون یا تحریریات نہیں۔" (مطبوعہ 1954ء)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ 1954ء تک آتے آتے ادب کے کسی مستقل نظریے کے قائل نہیں رہے تھے اس بات کو یوں سمجھنا چاہیے کہ عسکری صاحب 1954ء تک آتے آتے ادبی نظریہ سازی میں اس حوالے سے خود کفیل ہو گئے تھے کہ فلابیئر کی "مادام بواری" ستاں دال کی "سرخ و سیاہ" اور پرسپر میریمے کی "سرخ و سیاہ" کو ترجمہ کرتے ہوئے ان تینوں ناولوں نے تنقیدی سطح پر انھیں جو کچھ سکھایا وہ انھوں نے ترجمے کے فن پر بات کرتے ہوئے لکھ دیا۔ اسی طرح میر تقی میر کے مطالعے اور "طلسم ہوشربا" کا انتخاب کرتے ہوئے انھیں جو کچھ سوجھا وہ بالکل ایک نیا تجربہ تھا اور عسکری صاحب کو بطور نقاد اس کا بہت فائدہ ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ میر کو غالب سے بڑا شاعر قرار دیتے ہیں۔ دیکھیے اُن کے دو مضامین: "میر جی" اور "میر صاحب"۔

تنقید کا منصب / مقصد:

اس حوالے سے عسکری صاحب کا مضمون "تنقید کا منصب" 1954ء بہت اہمیت رکھتا ہے۔ 1954ء میں عسکری صاحب نے یہ نعرہ لگایا کہ ادب پر جمود طاری ہو گیا ہے لہٰذا ہمیں فوری طور پر اس جمود کو توڑنا ہوگا۔ اسی مضمون میں انھوں نے کہا تھا کہ: "تنقید کا تعلق اپنے زمانے سے ہونا چاہیے۔"

یعنی اپنے دور کے ادب پر تنقیدی نظر ڈالنے کی ضرورت ہوتی ہے اور نقاد کا کام ہے کہ لکھنے والوں کو مشورے دے۔ اسی مضمون میں انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہمیں اس جمود کو توڑنے کے لیے مغربی ادیبوں کا براہ راست مطالعہ کرنا چاہیے خود انھوں نے براہ راست مطالعہ کیا تو اُس سے یہ نتیجہ نکالا کہ اردو ادب میں چھوٹے چھوٹے اور آسان جملے لکھ کر ہم نے اپنی زبان اور لفظیات کو محدود کرنے کے ساتھ ساتھ وہ صلاحیت بھی کھو دی ہے جو پیچیدہ خیالات کو قلمبند کرنے کے لیے ضروری ہوتی ہے اس لیے گستاؤ فلابیئر کی طرح کے طویل جملے لکھنے کی ضرورت ہے جس کی مثالیں ناول "مادام بواری" میں ملتی ہیں اور جس طرح ستاں دال نے اپنے ناول "سرخ و سیاہ" میں فکری الجھاوں کو بخوبی بیان کیا وہ صلاحیت اردو زبان و ادب میں بھی پیدا ہونی چاہیے۔

اُن کی کتاب "انسان اور آدمی" میں شامل دو مضامین "انسان اور آدمی" اور "آدمی اور انسان" کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عسکری صاحب کا انسانی نفسیات اور انسانی ساجیات کا مطالعہ کتنا گہرا تھا۔ اس موضوع کی طرف عسکری صاحب کی توجہ فرانسیسی نقاد دوا موٹو کا ایک مضمون پڑھ کر ہوئی۔ ان دونوں مضامین میں عسکری صاحب نے آدمی کو انسان سے افضل قرار دیا ہے۔

"فن برائے فن" کی نیا دور بحث عسکری صاحب نے فرانس کے

زوال آمادہ شاعروں کے حوالے سے کی ہے اور اس حوالے سے اُن کا ہیرو "بدی کے پھول" کا مصنف بودلیئر ہے لیکن یاد رکھیں کہ انہوں نے صرف بودلیئر کو ہی پڑھا عسکری صاحب کے ہاں ہمیں تھیوفل گوتیئے کے حوالے بھی ملتے ہیں جن کا کہنا ہے کہ: "اپنی ماں کو اس وقت بیچو جب وہ جوان ہو"

عسکری صاحب کے ہیرو بودلیئر نے مذہب، اخلاقیات، سماجی ذمہ داری اور انسانی تعلقات کی نفی کرنے کے بعد فن برائے فن کے لیے صرف ایک ہی معیار قرار دیا تھا...... اور وہ تھا حسی یعنی خالص جمالیات۔ محمد حسن عسکری نے اپنی تنقید میں داخلیت پسندی کو بھی سرمایہ بنایا۔ الگ بات ہے کہ داخلیت پسندی کی طرف اشارہ سب سے پہلے امداد امام اثر نے اپنی کتاب "کاشف الحقائق" میں کیا تھا۔ اردو میں داخلیت پسندی کی اصطلاح 1940ء کے عشرے میں سامنے آئی۔ جب ترقی پسندوں نے داخلیت پسندی کے حوالے سے میر تقی میر اور محمد حسن عسکری کو رد کرنا شروع کیا۔ جب کہ عسکری صاحب کہتے ہیں:

"اگر ژونگ کی بات مانیں تو داخل بینی کے سوا انسانی حقیقت تک پہنچنے کا کوئی اور طریقہ ہی نہیں۔"

داخل بینی اور خارج بینی کی بحث میں عسکری صاحب نے ہمیشہ ایک داخل بین وکیل کا کردار ادا کیا۔ عسکری صاحب کے نزدیک، "داخلیت پسندی آدمی کا فطری رجحان ہے۔"

بالکل ایسے ہی جیسے دو بڑے جذبوں کا ہونا یعنی نفرت اور محبت۔ لیکن 1954ء تک آتے آتے جب انہوں نے "داخلیت پسندی" کے عنوان سے مضمون لکھا تو اُن کا یہ موقف تبدیل ہو چکا تھا۔ یہ مضمون "ستارہ یا بادبان" میں شامل ہے۔

1948ء میں انہوں نے سعادت حسن منٹو کے ساتھ مل کر ایک ادبی پرچے کا اجرا کیا اور "اردو ادب" کے عنوان سے دو شمارے مرتب کیے ان پرچوں میں انہوں نے واضح طور پر کہا کہ ادب کو اتنا تو مقصدی ہونا چاہیئے کہ اپنے علاقے کی ضروریات کو سمجھے۔

اس لیے انہوں نے پاکستانی ادب کا نعرہ بلند کیا اور یہ کہا کہ پاکستانی ادب میں پاکستانیت جھلکنی چاہیئے۔

یہ جو کہا جاتا ہے کہ بطور نقاد عسکری صاحب نے تنقیدی نظریہ سازی کرتے ہوئے اپنا موقف بار بار تبدیل کرتے رہے تو وہ درست ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو میں تجزیاتی تنقید کا آغاز اگر الطاف حسین حالی سے ہوا تو محمد حسن عسکری اس راہ کا دوسرا سنگ میل ثابت ہوئے۔ عسکری صاحب کے نظامِ تنقید کو سمجھنے کے معاملے میں اکثر ناقدین سے غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔

بقول ڈاکٹر مرزا حامد بیگ: "یونیورسٹیوں کے تدریسی ناقدین نے بھی اُن سے نیا دھن تو کچھ نہ کچھ ضرور استفادہ کیا۔ بے شک کچھ ناقدین نے اُن سے فکر سازی سیکھی ہے اور ایک خاص قسم کی نثر ہی کو مستعار لیا۔ لیکن کچھ لیا تو بصورت دیگر ہمیں نادر ابوالیث صدیقی اور حنیف فوق کی مَس تنقیدی آرا ہی دیکھنے کو ملتی...... عسکری صاحب نے یورپی مغرب کے مبلغ ہونے کا الزام اپنے سر لے کر ہمیں مغربی ادب سے متعارف کروایا۔"

("میرے ہونہار استاد محمد حسن عسکری" مطبوعہ "بادبان" 2003ء کراچی)

کلیم الدین احمد نے تو انہیں "مغرب کا دلال" تک کہہ دیا تھا۔ جہاں تک ادب کی زندہ روایت کے شعور کا تعلق ہے تو اِس سلسلے میں بھی ہم ٹی ایس ایلیٹ کے بعد عسکری صاحب کے ہی شکر گزار ہیں۔

(بقیہ: سہاجا ہوا آدمی)

کی بیٹی، داماد اور اُس کے گھر والے ہر ہفتے فون پر خیر و عافیت کی خبر دیتے رہتے تھے مگر اُس کی اداسی تھی کہ جوں کی توں قائم رہی۔ وہ اُسی طرح رات دیر تک جاگتا کسی سوچ میں ڈوبا رہتا۔ جانے اُس کی بیٹی پر کیا بیت رہی ہوگی؟ اُس کے سسرال والے اُس سے کیا سلوک کرتے ہوں گے کہیں وہ لوگ ٹیلیفون پر جھوٹ تو نہیں بولتے؟

اُسے یوں فکر و غم میں مبتلا دیکھ کر رتنا کو سمجھ نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ لاکھ سمجھانے پر بھی اُس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ایک دن وہ اسی چنتا میں ڈوبا ہوا تھا کہ امریکہ سے ڈاکٹر چندو کا فون آیا جسے سن کر اُس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ فون سننے کے بعد اُس نے فوراً راجن کو اُس کے دفتر فون کیا اور بغیر کوئی تمہید باندھے کہا "مبارک ہو۔"

"مبارک؟ کس بات کی مبارک؟"

"دیپا کے ہاں بیٹا ہوا ہے آپ نانا بن گئے ہیں۔"

اچانک یہ خبر سن کر اُسے کچھ نہیں آرہا تھا کہ رتنا سے کیا کہے۔ اسی طرح کچھ لمحے چپ رہنے کے بعد اُس نے صرف اتنا کہا "اچھا میں گھر آتا ہوں۔"

لیکن جب تک وہ گھر پہنچا تو فون کا زمانہ ہونے کی وجہ سے یہ خبر رشتہ داروں اور پاس پڑوس میں جنگل کی آگ کی طرح ہر طرف پھیل چکی تھی۔ اور جب وہ گھر پہنچا تو کئی رشتہ دار اور پڑوسی مبارک باد دینے کے لئے جمع ہو چکے تھے۔ گھر میں خوب چہل پہل تھی۔ عالمِ مسرت میں رتنا سب کی خاطر تواضع مٹھائی، کوک اور چائے سے کر رہی تھی۔ آتے ہی وہ بھی اُس کا ہاتھ بٹانے میں مصروف ہو گیا۔ جب رات ہو جانے پر سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تو رتنا تھکن سے چُور چُور ہو چکی تھی۔ رسوئی میں برتنوں کو سنبھالنے کے بعد اُس نے جلدی سے نائٹ گاؤن پہنا اور سونے کے لئے اپنے بیڈ روم میں چلی گئی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ آج راجن نہ تو جاگ رہا تھا اور نہ ہی ٹیلیویژن دیکھ رہا تھا بلکہ وہ گہری نیند میں سویا ہوا تھا اور اُس کے خراٹوں کی آواز سارے کمرے میں گونج رہی تھی۔

☆

''وشواس گھات''

پروفیسر قیصر نجفی

اردو کی نئی بستیوں میں تخلیق ہونے والا ادب کمیت و کیفیت ہر دو اعتبار سے یقیناً وہ معیار پیش کرتا ہے، جو ایک دبستان تشکیل دینے کے لئے ناگزیر تصور ہوتا ہے۔ لندن میں مقیم جتیندر بلو اسی نئے دبستان کے ایک نمائندہ فنکار ہیں۔ وہ بیک وقت افسانہ نویس بھی ہیں اور ناول نگار بھی۔ ہمارے ہاں یوں تو متعدد ایسے فنکار پیدا ہوئے ہیں، جنہوں نے افسانہ اور ناول دونوں اصنافِ ادب میں طبع آزمائی کی ہے مگر ان میں معدودے چند ایسے ہیں، جنھیں بلا تردد ہر دو اصناف کی آبرو قرار دیا جا سکتا ہے۔ جتیندر بلو کا شمار ایسے ہی فنکاروں میں ہوتا ہے۔ وہ جتنے اچھے افسانہ نویس ہیں، اتنے ہی اچھے ناول نگار ہیں۔ ان کے اب تک چار افسانوی مجموعے ''پیچان کی نوک پر''، ''جزیرہ''، ''نئے دیس میں''، اور ''انجانا کھیل'' جبکہ تین ناول ''پرائی دھرتی اپنے لوگ''، ''مہانگر'' اور ''وشواس گھات'' کے نام سے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ ''وشواس گھات'' ان کا تیسرا ناول ہے، جو حال ہی میں اشاعت پذیر ہوا ہے۔

جتیندر بلو بنیادی طور پر افسانہ نویس ہیں یا ناول نگار، یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے۔ البتہ یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ کہانی کاری ان کی فطرتِ ثانی ہے۔ ان کی جتنی بھی مختصر کہانیاں معرضِ تخلیق میں آئی ہیں، وہ ایک طرف کہانی کاری میں ان کی جبلی خصوصیات کی نشان دہی کرتی ہیں اور دوسری طرف افسانہ نگاری کے فن پر ان کی مکمل گرفت کی چغلی کھاتی ہیں۔ فکری و نظری طور پر وہ ادب برائے زندگی کے مؤید ہیں اور اپنے افسانوں کا مواد گرد و پیش کی زندگی سے حاصل کرتے ہیں۔ بنا بریں ان کے افسانوں کے پلاٹ ایسے احوال، واقعات اور تجربات سے ترتیب پاتے ہیں، جو ہماری زندگی میں آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ جتیندر بلو کی افسانے کے فنی تقاضوں پر گہری نظر ہے۔ خاص کر کشمکش (crisis)، نقطۂ عروج (climax) اور انجام کے حوالے سے ان کے افسانے فنی شہکار ہیں۔ پیچیدہ مسائل سے جنم لینے والی کشمکش (crisis) کی منزل پر کرداروں کی سیرت کے صحیح خد و خال نمایاں کرنے کے فن میں تو انھیں یدِ طولیٰ حاصل ہے۔ جب کہ واقعات کی بنت اس ہنرکاری سے کرتے ہیں کہ نقطۂ عروج (climax) تک پہنچتے پہنچتے قاری کو مسحور spell bound کر دیتے ہیں۔ جتیندر بلو نہ صرف قاری کے تجسس کو انگیخت کرنے کے فن سے واقف ہیں، بلکہ حزنیہ، طربیہ، حیرت افزا غرض کسی بھی قسم کے انجام کو قابلِ قبول بنانے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ ہمارے نزدیک قاری کو یہ باور کرا دینا کہ اس سے زیادہ مناسب اور برمحل انجام ممکن نہیں، بڑے افسانہ نگاروں کا ہی شعار ہے۔

مقامِ حیرت ہے کہ جتیندر بلو اپنی افسانہ نگاری سے کبھی مطمئن نہیں رہے۔ اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ وہ افسانے کے فنی تقاضوں پر پورے نہیں اترے بلکہ بقول غالب۔

بقدرِ ظرف نہیں ہے یہ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

وہ افسانے کے medium کو اپنے تجربۂ علمی کے اظہار کے لئے ناکافی خیال کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک مختصر کہانی زندگی کی ایک قاش ہے اور مکمل زندگی کی تعبیر کرنے سے قاصر ہے۔ ''وشواس گھات'' کے پیش لفظ بعنوان 'ناول بن جینا بھی کوئی جینا ہے'' میں ناول نگاری کی طرف اپنے بڑھتے ہوئے رجحان کی توجیہ پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

''یہ سلسلہ میری طویل کہانی ''جزیرہ'' سے شروع ہوا تھا۔ اس سے قبل میں برسوں تک مختصر کہانیاں لکھتا رہا، جو ہندو پاک کے رسائل میں شائع ہوتی رہیں۔ ان کی بدولت ہی ادب میں میری کچھ پہچان بنی اور چھوٹی موٹی شہرت بھی نصیب ہوئی۔ لیکن میں مطمئن نہیں تھا۔ ہر کہانی مکمل کرنے پر نہ تو مجھ کو روحانی تسکین ملا کرتی اور نہ ہی ذہنی تشفی۔ ایک ہی خیال مجھ پر طاری رہتا کہ کہانی کو تو بین الاقوامی سطح پر زندگی کی ایک قاش (A slice of life) قرار دیا گیا ہے اور میں بھی دیگر افسانہ نگاروں کی طرح اسے لکھ کر قاری تک پہنچا دیتا ہوں۔''

یہ بیان جتیندر بلو کے فن اور شخصیت دونوں کا تعارف قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس بیان کی یوں بھی اہمیت بڑھ جاتی ہے کہ اس کے ذریعے ان کی ناول نگاری کے محرکات تک پہنچنا آسان ہو گیا ہے۔ انہوں نے اپنی ایک طویل کہانی ''جزیرہ'' کو اپنی ناول نگاری کا محرک ہی نہیں، خشتِ اول بھی قرار دیا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ''جزیرہ'' نے جب ان کے اندر ایک ناول نگار کی موجودگی کا انکشاف کیا تو انہوں نے ایک ناول اور ایک طویل ناولٹ ''پرائی دھرتی اپنے لوگ'' اور ''مہانگر'' کے نام سے لکھ ڈالے۔ ان دونوں کتابوں کو یوپی کی اردو اکادمی نے انعام سے بھی نوازا۔ تعجب خیز امر یہ ہے کہ ان کے نزدیک یہ بھی کوئی بڑا معرکہ نہ تھا۔ ''وشواس گھات'' کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔

''یہ بھی سچ ہے کہ میں نے سن ستر اور اسی کی دہائی میں ایک ناول اور ایک طویل ناولٹ ''پرائی دھرتی اپنے لوگ'' اور ''مہانگر'' لکھا تھا اور ان دونوں کتابوں کو یوپی اردو اکادمی نے انعام سے بھی نوازا تھا۔ لیکن میرے نزدیک وہ کوئی بڑا معرکہ نہ تھا، جس پر میں ناز کرتا۔ میں ان تخلیقات میں پیش کردہ حالات، ہیئت، کرداروں کے ابھرے جذبات اور فنی اعتبار سے زیادہ مطمئن نہ تھا۔''

مجموعی طور سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جیتندر بلو مختصر کہانیوں کی طرح ناول نگاری کی اپنی ابتدائی کاوشوں سے بھی مطمئن نہیں تھے اور یہ بے اطمینانی شاید اس تضاد کے سبب تھی جو کم و بیش ہر تخلیق کار کے اندر موجود ہوتا ہے...
ہمیں افسوس ہے کہ سوائے ان کے افسانوں کے ہم جیتندر بلو کے دیگر ناولوں کا مطالعہ نہیں کر سکے ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری پر تو ہم نے مضمون کے آغاز میں مختصر سا تبصرہ کیا ہے لیکن "وشواس گھات" کے علاوہ دوسرے ناولوں کے بارے میں اپنی کوئی رائے پیش کرنے سے قاصر ہیں۔

ایسے ناول انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں جو آغاز سے اختتام تک کشش و دلچسپی کی فضا قائم رکھنے میں کامیاب ٹھہرے ہیں۔ "وشواس گھات" ان میں سے ایک ہے۔ یہ ناول موضوعیت، معروضیت، زبان و بیان پر قدرت، تجربے کی وسعت، مشاہدے کی گہرائی، حیات شناسی، نفسیات آگاہی اور سب سے بڑھ کر عصری شعور کے حوالے سے صف اول کے ناولوں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے۔ اپنے حرف آغاز "ناول بن جاتا بھی کوئی جاتا ہے" میں جیتندر بلو نے اپنے جس فکری و فنی اجتہاد کی طرف اشارہ کیا ہے "وشواس گھات" اس سب پر محیط ہے۔ ایک نازک موضوع پر انہوں نے جس فنی مہارت سے ناول کا مضبوط پلاٹ استوار کیا ہے، واقعات کا تانا بانا بنا ہے اور کردار نگاری کا مظاہرہ کیا ہے، وہ یہ باور کرانے کے لئے کافی ہے کہ ناول نگاری کے حوالے سے ان کا اضطراب فطری اور با جواز تھا۔ خصوصاً کردار نگاری سے متعلق ان کے بیانات کو بے تکلفی تصور کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی انہیں dictation گردانا جا سکتا ہے۔ بلاشبہ "وشواس گھات" میں انہوں نے جو کردار اپنے تجربے، مشاہدے، تخیل اور محسوسات کے زور پر پیش کئے ہیں، وہ سب کے سب اپنے دکھوں، محرومیوں، خواہشات، جذبات، جنگی تضادات اور انسانی رشتوں کے ساتھ ناول میں ابھر کر سامنے آئے ہیں۔

"وشواس گھات" کا سب سے مضبوط اور جاندار کردار ناول کا ہیرو دیوکی ہے، جو اوائل عمری ہی میں وشواس گھات betrayal کا شکار ہو جاتا ہے مگر ناول کے آغاز سے لے کر انجام تک ایک چٹان کے مانند اپنے آدرشوں اور اصولوں پر ثابت قدم رہتا ہے۔ وہ مشرقی تہذیب کی ایک زندہ علامت ہے اور اپنے طرز عمل سے رشتوں کے احترام کا وہ نمونہ پیش کرتا ہے جو مشرق کی دین ہے۔ اپنے بڑے بھائی رما کانت (جسے وہ والد کا رتبہ دیتا ہے) کا فریب طشت از بام ہو جانے کے باوصف وہ اس کے احترام میں سر مو فرق نہیں آنے دیتا بلکہ زندگی کے میدان کارزار میں اس کی استقامت و استقلال کے آگے جھکا جاتا ہے۔ ہر چند عجیب و غریب جسمانی ساخت کے علاوہ دیوکی کے کردار و شخصیت کا کوئی منفی پہلو سامنے نہیں آتا تاہم جیتندر بلو نے اسے مافوق الفطرت کردار بنانے کی سعی نہیں کی ہے بلکہ ہر کردار کے ارتقا میں زمینی حقائق اور انسانی جبلت کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ جیتندر بلو کا یہ قول کہ:

"جب وشواس گھات اپنے عروج پر پہنچ کر اپنی اصل شکل ظاہر کرتا ہے تو زیادہ تر لوگوں کا اعتماد دنیا، زندگی اور انسانیت سے اٹھ جاتا ہے۔ ان کی زندگی وہ خود میں گم خاموشی سے گزار رہے ہیں۔"

انسانی نفسیات کی صد فیصد صحیح عکاسی کرتا ہے۔ اس قول کی عملی تصویر دیوکی کے کردار میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جو باپ سمان بھائی رما کانت کے بعد اپنی جیون ساتھی تندلی سے (بھری دنیا میں ایک ہستی جس پر اسے وشواس ہوتا ہے) فریب کھاتا ہے تو وشواس گھات کی اس انتہا کو دیکھ لیتا ہے، جسے دیکھنے کے بعد دنیاوی عذاب بن جاتی ہے، زندگی اپنا مفہوم کھو دیتی ہے اور رشتے بے معنی ہو جاتے ہیں۔

"وشواس گھات" کا دوسرا اہم کردار ناول کی ہیروئن تندلی کا ہے۔ تندلی شیکسپیئر کے ایک کردار Lady Macbeth کی طرح ایک ambitious خاتون ہے۔ بالخصوص عصر حاضر کے مادیت پرست انسان کی مکمل تمثیل ہے۔ آج کے انسان کا اپنا نظریہ حیات اور فلسفۂ وقت ہے، جس کی تفسیر و تعبیر جیتندر بلو نے تندلی کے ذہن میں پنپنے والی سوچ سے نہایت خوبصورت انداز سے کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"تندلی کے دل و دماغ پر وقت نے چھاپ اتنی گہری چھوڑ رکھی تھی کہ وہ اس کا ایک پل بھی ضائع کرنا اپنے کردار کے خلاف سمجھتی تھی۔ بیرون ملک سکونت اختیار کرنے پر اسے گہرا احساس ہو چکا تھا کہ مغربی زندگی کس قدر پیچیدہ اور تیز گام اور مصروف ترین ہے۔ مقامی لوگ "وقت" کو اتنی اہمیت کیوں دیتے ہیں اور لوگ باگ ان سے الگ کیوں نہیں ہو پاتے۔ یہ گن ہر ذی شعور اور لاشعور میں اپنا رول اتنی عزت سے ادا کرتا ہے کہ اسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں رہتا۔ ورنہ "وقت" اسے پچھاڑ ڈالتا ہے اور آسودگی آخری دم تک معدوم رہتی ہے۔"

تندلی ایک ایسا جیتا جاگتا کردار ہے، جو ہم اپنے گرد و پیش میں آئے دن دیکھتے ہیں۔ بیرون ملک جانے کا craze آج تیسری دنیا کے باشندوں میں جس عروج پر ہے، پہلے کبھی نہ تھا۔ نیز اپنی ہی ذات کو محور بنا کر ردعمل تشکیل دینے کا رجحان عام ہے۔ شہرت، نام و نمود اور دولت بلکہ بے انتہا دولت کا حصول نصب العین حیات کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ حرص و ہوس زر کی تکمیل کے لئے عزیز ترین رشتوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے کا کلچر عالمی سطح پر فروغ پانے لگا ہے۔ یہ تمام باتیں تندلی کے کردار کے نمایاں خد و خال بن کر سامنے آتی ہیں، جنہیں اجاگر کرنے میں جیتندر بلو نے بڑی مشاقی دکھائی ہے۔ دیوکی اور تندلی کے علاوہ رما کانت، اوما، ارچنا اور پال کے کردار بھی قابل ذکر ہیں۔ جو کسی نہ کسی حوالے سے جاذبیت و مقناطیسیت کے وصف سے متصف

ہیں۔ البتہ ناول میں پربھا کا کردار کہیں اضافی محسوس ہوا ہے۔ کیونکہ مرکزی یا کسی ذیلی کہانی سے اس کردار کی کوئی افادیت ظاہر نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں دیوکی (کہانی کے مرکزی کردار) سے اس کا کوئی سنجیدہ تعلق نظر نہیں آتا۔ خصوصاً دیوکی کی زندگی کے حالات پر وہ کسی بھی حوالے سے اثر انداز نہیں ہوتی۔

"وشواس گھات" ایک وسیع کینوس کا ناول ہے اور فکری و نظری اعتبار سے آفاقیت بکنار ہے۔ بظاہر جتیندر بلو ایک کہانی کار ہیں مگر اس ناول میں انہوں نے عمرانیات، مذہبیات، سیاسیات، اقتصادیت، نفسیات اور تاریخ کے علوم پر اپنی بے پناہ دسترس کا مظاہرہ کیا ہے اور جہاں کہیں بھی انہیں ان موضوعات کے تناظر میں خیال آرائی کا موقع ملا ہے، وہاں انہوں نے معلومات کے دریا بہا دیے ہیں۔ مغربی سوسائٹی اور اس کی تہذیب و معاشرت کا تو انہوں نے بڑے قریب سے مشاہدہ کیا ہے۔ "وشواس گھات" میں مغربی سوسائٹی کی تفہیم کراتے ہوئے وہ رقم طراز ہیں:

"اس سوسائٹی کی بنیاد individualism پر رکھی گئی ہے۔ کوئی بھی شخص کسی دوسرے کے معاملات میں دخل دینا پسند نہیں کرتا ہے۔ کوئی بھی دوسرے کی مدد نہیں کرتا۔ ہر کوئی اپنے مسائل خود حل کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اپنے لئے زندہ ہے..... یہی وجہ ہے کہ اس سوسائٹی کا فیملی یونٹ کمزور ترین پہلو قرار دیا گیا ہے۔"

دل نقد و نظر نے تسلیم کیا ہے کہ اردو ناول کو پریم چند نے حقیقت سے آشنا کیا اور اسے رومانوی فضا سے نکال کر مقصدیت کی راہ پر ڈالا۔ خصوصاً اس کے خمیر میں سیاسی اور اقتصادی مسائل کو بڑی فنکاری سے شامل کر دیا۔ پریم چند نے جس ناول سے اردو ادب کو روشناس کرایا تھا "وشواس گھات" اس کی ایک زندہ مثال ہے۔ بلکہ پریم چند سے جو فنی تقاضے پورے نہیں ہو سکے تھے، جتیندر بلو نے "وشواس گھات" میں وہ کما حقہٗ پورے کر دیے ہیں۔ اگرچہ "وشواس گھات" کا محرک یا موضوع کوئی سیاسی تحریک یا نظریہ نہیں ہے، تاہم بالواسطہ طور پر جتیندر بلو نے نہ صرف عالمی سیاسی منظر نامہ نہایت بالغ نظری سے پیش کیا ہے بلکہ عالمی سیاسی نظریات کی بھی مکمل تفہیم کرادی ہے۔ بات خواہ نازی ازم کی ہو یا کیپٹل ازم کی، کولونیل ازم کی ہو یا مارکسزم کی، جتیندر بلو کا قلم اس سرعت سے چلتا ہے کہ گمان گزرتا ہے جیسے وقت سے بھی آگے نکل گیا ہو۔ اس پر مستزاد انہوں نے تیسری دنیا کا دکھ جس کرب سے بیان کیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔

جتیندر بلو نے "وشواس گھات" کی ہیروئن تندلی کا تعارف ایک مصورہ کے طور پر کرایا ہے۔ انگلستان پہنچ کر تندلی مصوری میں بین الاقوامی سطح پر اپنی شناخت کرانے کے جنون craze میں مبتلا ہو جاتی ہے اور اسی جنون کے باعث وشواس گھات کا ارتکاب بھی کر بیٹھتی ہے۔ جتیندر بلو نے ناول میں فن مصوری پر بھی گفتگو کی ہے۔ مصوری کے تئیں دیوتندے ان کی آگہی متحیر کن ہے۔ لگتا ہے جیسے ان کے اپنے اندر ایک بہت بڑا مصور موجود ہے، جو ان کے ذہنی کینوس پر تصویر کاری کے عمل میں ہمہ وقت مصروف ہے اور نتیجتاً متنوع فن کی نادرہ تصاویر منعکس ہو کر صفحۂ قرطاس پر ابھر آتی ہیں۔ یہ تصاویر بیک وقت ان کی مصورانہ دانش کی بھی شہادت دیتی ہیں اور ان کے تخیل کی اونچی اڑان کو بھی ثابت کرتی ہیں۔ اس موقع پر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ بنیادی طور پر وہ ایک مصور ہیں یا فنکار۔

"وشواس گھات" میں جتیندر بلو نے بعض مقامات پر فلسفیانہ اسلوب بھی اختیار کیا ہے۔ خصوصاً "وقت" کے فلسفے پر انہوں نے دانشورانہ بحث کی ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے حکمت و معرفت کی باتوں سے قلب و روح کو بالیدہ بھی کیا ہے۔ درج ذیل جملے ان کی حکیمانہ سوچ کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔

☆ پیسا بھگوان سے بھی آگے نکل گیا ہے۔

☆ گھر میں دیوی کا ہونا رہنا بہت ضروری ہے کہ اس سے جیون کے کئی پہلو سمجھ میں آتے ہیں۔

☆ کار کی رفتار گزرتے وقت کی رفتار سے میل کھاتی ہے اور ان لمحات میں وہ خود سے، قدرت سے اور وقت سے براہ راست ملا کرتی ہے۔

ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے جہاں ان گنت قومیں، نسلیں، قبیلے اور خاندان آباد ہیں اور جن کی مذہبی، معاشرتی، تہذیبی اور ثقافتی قدریں جدا جدا ہیں۔ تقسیم کے بعد ان سب کو قومی دھارے میں ساتھ ساتھ رکھنا ایک ٹیڑھی کھیر تھی۔ تاہم اس گمبھیر مسئلے کا حل سیکولرازم میں تلاش کر لیا گیا۔ آج سیکولرازم بھارت کی سیاسی ہی نہیں قومی ضرورت بھی ہے۔ سیکولرازم کی اہمیت کا وہاں کے تخلیق کاروں کو بھی شدید احساس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اکثر تخلیقات میں براہ راست یا بالواسطہ طور پر سیکولرازم کا پرچار ملتا ہے۔ "وشواس گھات" میں جتیندر بلو نے بڑے شد و مد کے ساتھ سیکولرازم کے حق میں دلائل دیے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے تقسیم ہند، سقوط ڈھاکہ اور پاکستانی سیاست کا اپنے نقطۂ نظر سے جائزہ بھی لیا ہے۔

جتیندر بلو کی جمالیاتی حس ہمہ وقت بیدار و چوکنا رہتی ہے۔ وہ حسن فطرت کے کسی مظاہرے سے صرف نظر نہیں کرتے۔ "وشواس گھات" میں انہوں نے مظاہر فطرت کی جس جمالیاتی شعور سے منظر کشی کی ہے، وہ ان کے قلم کو موقلم ثابت کرتی ہے۔ منظر نگاری کے ایسے خوبصورت مرقعے خال خال ناولوں میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔

"وشواس گھات" بیانیہ انداز میں لکھا ہوا ایک ناول ہے۔ جتیندر بلو اس ہنر سے بخوبی واقف ہیں کہ کہاں بات پھیلا کر کہنی ہے اور کہاں اختصار سے

کام لیا ہے۔ انھیں جتنی مہارت مختصر نویسی میں حاصل ہے اتنی ہی جزئیات نگاری میں نصیب ہے۔ جزئیات نگاری ایک بہت مشکل فن ہے۔ یہ ایک ایسا دوا ہے جس میں ہار اور جیت کے مساوی امکانات ہوتے ہیں یعنی جزئیات نگاری عبارت میں جان بھی ڈال سکتی ہے اور اس کی روح کو فنا بھی کر سکتی ہے۔ جیتندر بلو نے افراد، اشیاء، ماحول، مقامات وغیرہ کی ان کے تاریخی، تہذیبی اور معاشرتی پس منظر کے ساتھ تفصیل بیان کر کے "وشواس گھات" کو ناول سے زیادہ افسانگی پیڑ لیا دیا ہے۔

اگر "وشواس گھات" کا فنی نقطۂ نظر سے اجمالی جائزہ لیا جائے تو ارباب علم و دانش اور صاحبان نقد و نظر درج ذیل فنی نکات سے صرف نظر نہیں کر سکتے۔

- ☆ "وشواس گھات" ایک مقصدی ناول ہے اور "ادب برائے زندگی" کا ترجمان ہے۔
- ☆ "وشواس گھات" کی پوری کہانی زندگی کو دیکھنے کا ایک عمل ہے جس میں زمانہ حال کو اہمیت دیتے ہوئے حالات و واقعات کا ماضی کے ساتھ رشتہ جوڑنے اور تہذیبی جڑوں کو تلاش کرنے کی کاوش کی گئی ہے۔
- ☆ "وشواس گھات" میں زمان و مکان کا تسلسل برقرار رکھا گیا ہے۔
- ☆ "وشواس گھات" میں ناول نگار نے بعض مقامات پر شعور کی رو کی تکنیک کا استعمال کیا ہے۔
- ☆ "وشواس گھات" میں اوضیت کے عنصر کو ابھارا گیا ہے۔
- ☆ "وشواس گھات" کے کردار حد درجہ متحرک اور با عمل ہیں اور وقت کے بہاؤ کے ساتھ حرکت کرتے ہیں۔
- ☆ "وشواس گھات" میں زمان و مکان کی وسعت کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔
- ☆ "وشواس گھات" کا اختتام قاری کے ذہن میں ناول کی تکمیل کا احساس پیدا کرتا ہے اور دیرپا تاثر قائم کرتا ہے۔

یادش بخیر

ساغر خیامی

کم خواب سے بدن وہ، وہ ریشمی ادائیں
سوزِ دروں سے جلنا داغوں کا دھائیں دھائیں
اٹھتے ہیں اور شعلے پھونکوں سے جو بُجھائیں
کیسا تھا وہ زمانہ کیسے تمہیں بتائیں
پردے پڑے ہوئے ہیں یادوں کی کھڑکیوں پر
تا حال مر رہا ہوں ماضی کی لڑکیوں پر

مہندی کے چور جکڑے جھولوں کی رسیّوں میں
سونے کا اک قلم تھا چاندی کی انگلیوں میں
لکھے تھے خط جو اُس نے گرمی کی چھٹیوں میں
رکھتے ہیں گرم دل کو شدت کی سردیوں میں
مہکا ہوا شگوفہ جیسے کسی چمن کا
کیا ذائقہ بتائیں اس جستی بدن کا

ساغرؔ کسے سُنائیں یہ عشق کا فسانہ
آہٹ ذرا سی پایا کوٹھے پہ دوڑ آنا
اُٹھا کچھ اس طرح پھر دونوں کا آب و دانہ
اب غیر کا نشیمن اس کا ہے آشیانہ
کب خیریت سے گزرے دن اپنی عاشقی کے
امی ہیں وہ کسی کی ابو ہیں ہم کسی کے

پنڈلی وہ گوری گوری پائل وہ سادی سادی
ہم سے محبتیں کیں اور کی کسی سے شادی
دونوں کی قسمتوں میں لکھی تھی نامرادی
رانی ہے وہ کسی کی اس دل کی شہزادی
رستے محبتوں کے کاٹے ہیں بلیوں نے
ہم جیسے کتنے ابو مارے ہیں امیوں نے

اب بھی ہے یاد دل کو وہ عشق کا زمانہ
وہ چاند سی ہتھیلی وہ پان کا بنانا
چونا کبھی لگانا کتھا کبھی لگانا
چٹکی سے پھر پکڑ کر میری طرف بڑھانا
اس پان کا نہ اُترا سر سے جنون اب تک
کھائی تھی اک گلوری تھوکا ہے خون اب تک

ہونٹوں پہ مسکراہٹ آنکھیں جھکی جھکی ہیں
بجلی گری ہے دل پر وہ جب کہیں ملی ہیں
ہم کون سے ہیں زندہ وہ بھی تو مر چکی ہیں
ہم بھی ہیں اب نمازی اور وہ بھی متقی ہیں
پہلو میں رکھ کے تکیئے برہا کی رات خوش ہیں
ہم دونوں اپنے اپنے بچوں کے ساتھ خوش ہیں

نذرِ جگر مُرادآبادی

ٹی۔ این راز (پنچکولہ بھارت)

یوں زندگی تباہ کئے جا رہا ہوں میں
پیری میں بھی ووآہ کئے جا رہا ہوں میں

بس کا تو اِس بڑھاپے میں کچھ بھی نہیں رہا
کیا کیا نہ پھر بھی چاہ کئے جا رہا ہوں میں

اُن گل رخوں پہ جو ہوئے کھنڈر میری طرح
حسرت بھری نگاہ کئے جا رہا ہوں میں

بیوی کی ڈانٹ ہے، کبھی افسر کی جھاڑ ہے
دونوں سے ہی نباہ کئے جا رہا ہوں میں

رشوت کسی سے لی بھی تو رشوت کسی کو دی
پیدا یہ رسم و راہ کئے جا رہا ہوں میں

کھا کر یہ زخم تازہ کرپشن کے تیر کا
اب ہائے ہُو اور آہ کئے جا رہا ہوں میں

افسر ہے اُسکے شعر ہیں کیسے نہ پوچھئے
چمچہ ہوں واہ! واہ! کئے جا رہا ہوں میں

چہروں پر جو تناؤ کے یہ سنسکار ہیں
ان کا سبھی پہ داہ کئے جا رہا ہوں میں

اے رازؔ بانٹتا ہوں مسرت کی دولتیں
یوں خود کو بادشاہ کئے جا رہا ہوں میں

ٹی۔ این راز (پنچکولہ بھارت)

(۱)

جب سے آیا ہے بڑھاپا سوجھتا کچھ بھی نہیں
روشنی کا اک پٹنا آنکھوں میں منظر رہ گیا
ایک اک الہڑ حسینہ ہمکو بابا کہہ گئی
ہر نشانہ آنکھ کا عینک کے اندر رہ گیا

(۲)

جلتا ہے جی جو باتیں ہوں گھٹیا معیار کی
دنیا نے میری مٹی بھی مرنے پہ خوار کی
چندے کے بَل پہ یاروں سے مسجد نہ جب بنی
اینٹیں چُرا کے لے گئے میرے مزار کی

(۳)

ہر ایک سادھو سنت کا اپنا جلال ہے
دھرم وکرم کی منڈی کا وہ اِک دلال ہے
بھگتنی کی زُلفیں دیکھ کر بولا مہاتما
دیوی! تمام دنیا ہی اِک مایا جال ہے

تخلیقِ عصر

نئی تصانیف کا تعارف ...... عطیہ سکندر علی

معراج نسیم

گرچہ آئینہ در آئینہ ہے پرسوز رخ دوست
ایسا تنہائی کا عالم ہے کہ جی جاتا ہے

وقت گزرنے کے ساتھ بہت سے محاورے، کہاوتیں اکثر غلط ہوتے جا رہے ہیں۔ خوشی اُس وقت بہت زیادہ ہوتی ہے جب ختم ہونے والے محاورے کی جگہ طاقتور روایت جنم لیتی ہے۔ ملک کے نہایت محترم دانشور شاعر جناب حامد علی شاعر کی اہلیہ محترمہ سال گذشتہ رحلت فرما گئیں تھیں۔ اس صدمہ جانکاہ کو نہ صرف حامد صاحب بلکہ اُن کی اعلیٰ تعلیم یافتہ اولاد نے انتہائی شدت سے محسوس کیا اور آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل کے محاورے کو غلط ثابت کرتے ہوئے محترمہ معراج نسیم صاحبہ کی نسبت تعزیتی تحریروں اور منظوم خراج عقیدت کو کتاب کے جامع میں اس سلیقے محبت اور عقیدت سے محفوظ کیا ہے کہ مدتوں اُردو ادب اس کتاب پر ناز کرتا رہے گا۔ کتاب کا بیشتر حصہ اہلِ خانہ کی تحریروں سے مزین ہے جس میں اول درجہ جناب حامد علی شاعر کی اُن نظموں کو حاصل ہے جو آپ نے اپنی رفیقہ حیات کی بے وقت رحلت کے ردِعمل میں کہیں ہیں۔ مرحومہ معراج نسیم صاحبہ خود بھی صاحب قلم تھیں اس لیے اُن کی یادوں کو محفوظ کرتے ہوئے اُن کی تحریروں کو بھی یکجا کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ قریب 37 صفحات پر مشتمل مرحومہ کی یادوں سے مزین عکسی البم بھی شاملِ اشاعت ہے۔ جس میں رنگین اور سادہ تصاویر بہت سے خوبصورت لمحات کو مقید کیے ہوئے ہیں۔ یوں تو اس منفرد کتاب کی اشاعت میں حامد علی شاعر صاحب کا پورا خاندان جذباتی طور پر شریک رہا ہے البتہ! اس کی باقاعدہ ترتیب، تدوین اور پیش کش کی ذمہ داری حامد صاحب کی صاحب زادی پروفیسر جاودان میر نے سر انجام دی ہے۔ زیرِ نظر کتاب 352 صفحات پر مشتمل ہے۔ جس کا ہر ہر ورق اور ہر ہر لفظ خود منہ سے بول کر ترتیب کنندگان کے جذباتی لگاؤ کی گواہی فراہم کر رہا ہے۔ اسی جذباتی لگاؤ کے باعث کتاب ہذا کی باقاعدہ مارکیٹنگ اور ترسیل بھی نہ ہو سکی ہے اور نہ 352 صفحات کی اس منفرد کتاب کی کُل قیمت مقرر کی گئی ہے۔ صرف مرتب کنندہ پروفیسر جاودان میر اور نگران جناب اوج کمال کے ناموں کے ہمراہ ذکی اینڈ سنز یعنی پبلشر کا نام درج ہے۔ البتہ! آپ کے اشتیاق کی تکمیل دنیائے ادب 623 مسکت طوز ریگل ٹریڈ سکوائر ریگل چوک، صدر کراچی 74400 سے با آسانی ممکن ہے۔

5 تاجِ جمال

تمہارا حسن تکمل وولا نا نجوم فر ...... ہمارا عشق فرومایہ بے نظری نظر

کچھ کام دل کے زیرِ اثر، کچھ دماغ، کچھ تجربے کے ردِعمل میں ہو جائیں تو صفا کرتے نہیں ہے حیرت، اشتیاق، رشک اُس وقت ہوتا ہے جب عمر کی تمام ساعتیں کسی مقصد تحریک یا ترپ کی نظر کرنے والا نظریاتی انسان، ہم آپ جیسا ایک دردمند عامی بن جاتا ہے۔ حضرت مولانا نعیم صدیقی مرحوم و مغفور کی تمام زندگی ہمارے سامنے کھلی کتاب کی مانند ہے مگر اُن کی خوابیدہ تمناؤں کا وشات اُن کی زندگی میں اس قدر منظرِ عام پر نہ آسکیں جس کی وہ متقاضی تھیں۔ آپ کے علم پرور اور علم دوست صاحبزادے جناب خالد صدیقی نے حضرت مولانا کی غزلیات کا انتخاب شائع کرا کے اردو شاعری کے کلاسیکی ورثے پر بڑا کرم کیا ہے ورنہ اس طرز اور اس مزاج کا کلام اب عنقا ہو گیا ہے۔

تیرے عشاق بھی کیا لوگ ہیں، کیا چاہتے ہیں
بُت سنگیں سے بہ اخلاص و وفا چاہتے ہیں

آواز کے نفسوں میں کلی آئی ہوئی ہے
بلبل، سو ختہ رنگ کی بیگانی ہوئی ہے

جو کچھ بھی تقاضا حسن کرے تھام کو سہنا پڑتا ہے
ہر زخم جگر کو ہنستا ہوا اک پھول بنانا پڑتا ہے

جس جگہ جائیں پر اہلِ جنوں، نصبِ صلیب
جس طرف دیکھیں دلِ زندہ ہے ہنرمندوں کے لئے

دل ہے کہ اشعار کی اس جنت میں خوطہ زن رہنے پر بضد، وقت ہے کہ ہوا کے گھوڑے پہ سوار فیصلہ آپ کی تقدیر کا یعنی آپ کے ذوق کی تسکین کا آپ کے اپنے ہاتھ میں ہے جب چاہیں، جس قدر چاہیں ذہن و قلوب کو گرما اور بہا سکتے ہیں اور مولانا نعیم صدیقی صاحب کے ذوقِ جمال کی داد دے کر "شعاعِ جمال" کو مرلو سکتے ہیں۔ آپ کا یہ عمل ہر طرح حق بجانب ہو گا اور قدر کے زمرے میں ہی شمار ہو گا جس کے صلے میں آپ کی ذہنی و قلبی تہذیب یقینی ہے۔ قریب اڑھائی سو صفحات کا پیارا اور مجلد شعری نسخہ جسے جناب حفیظ الرحمٰن احسن صاحب نے بڑی جانفشانی سے ترتیب دیا ہے فقط -/130 روپے کے عوض الفیصل ناشران کتب، اردو بازار لاہور پر آپ کی توجہ کا منتظر ہے۔

پارپے

ہمارے عہد کے دانشور افسانہ نگار جناب جوگندر پال کا مختصر ناول ہے جس میں کہانی در کہانی کی نسبت جوگندر پال صاحب کی خلاقی کو صفحہ در صفحہ نمایاں کرتی ہوئی قاری کو ایک اور ہی دنیا میں لے جاتی ہے جہاں وہ اپنے گرد و پیش سے کٹ کر خود کو ہوا کے دوش پہ محسوس کرتا ہے۔ قصہ کے بیان میں

انسانی نفسیات، اُس کی کج کجی اور جبلّتی تعریفی خود بہ خود کھر کھر کر پڑھنے والے کو گدگداتی ہوئی برقی لہروں کی مانند انسانی اعصاب کے لئے تحریکی کا کام غیر محسوس طریقے پہ انجام دے جاتی ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے!

"جو لڑکا اپنے ماں باپ، بھائی بہن، کسی کا بھی اپنے کو نہ جانا ہو اس کا گھر کہاں ہوتا ہے؟ لوگ کہتے ہیں جو اپنے ماں باپ یا گھر سے کم ہاں کو نہ پہچانتا ہوا ہے ہم آدمی کی اولاد میں کیکر شامل کرسکتے ہیں۔"

یہ الفاظ ناول کے ایک کردار بابا الو کی زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ اب ذرا ایک نسوانی کردار کی زبان بھی سنیئے! "مجھے بی بی مت کہو" چاچی نے اپنا دوپٹہ سر سے جھٹک دیا "کسی کچہری سے بھی واسطہ پڑا ہے" وہ اپنے مرد کے ساتھ جُڑ کر کھڑی ہو گئی۔ "ہم لوگ بیدا ضروری ہیں پائی پائی کا حساب چکائے بغیر اپنا دم بھی نہیں نکلنے دیتے" "تھوڑی سی سیر "پار دیے" کی اور کیجئے!" "ہاں اور میری خاموشی کی دگنی فیس دی" کھلکھلا کر ہنستے ہوئے وہ گویا اپنے سر کا بوجھ اُتار رہی ہو۔ ہندوستانی بڑے بودے لوگ ہیں۔ اتنا بولتے ہیں اور بولتے بولتے خود کو اتنے دھیان سے سنتے ہیں گویا ساری دنیا وہ خود آپ ہی ہوں۔" دراصل "پار دیے" آزادی کے متوالوں کی کہانی ہے جو اب ہمارے معاشرے میں باقی نہیں رہے اور اگر خال خال کہیں بچے بھی ہیں تو اپنے ہی معاشرے میں قطعی اجنبی بن کر رہ گئے ہیں۔ یہ وہ پروانے ہیں جو کسمپرسی جاتے ہیں کہ انہوں نے اس قدر حساس و دل گرفتہ موضوع اس قدر اختصار سے بیان کیا کیوں ضروری جانا مگر یہ بھی ہے ایک الگ دنیا اور الگ احساس کی ناآسودگی کا حامل ہے۔ نہایت عمدہ طباعت اور دیدہ زیب جلد کے ہمراہ فقط ایک سو پچاس روپیہ میں مثالی پبلی کیشنز B-252 کمالی سیل سٹریٹ کلکتہ سے دستیاب ہے۔

■ سے ہوتے ہیں وہ ما ے

جناب خالد ندیم ایک ہونہار، سخت جان، اور وسیع کے مضبوط قلمکار ہیں۔ جس محنت، جاں فشانی اور تحریک سے انہوں نے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اور اُن کی قابل احترام بیگم صاحبہ حمیدہ اختر رائے پوری کے نام مشاہیر کے خطوط اکٹھے کیے اور جس ذوق شوق سے اُن کی ترتیب، تدوین اور ترجمہ کیا وہ بہت ہی قابل داد ہے۔ بلاشبہ جناب خالد ندیم نے یہ تمام مشقت پی ایچ ڈی کے مقالے کی جستجو میں کی ہے مگر جس عرق ریزی اور احتیاط سے یہ کام انہوں نے سر انجام دیا ہے اس کے طفیل اردو ادب کو اپنے ایک ماہر کی بابت بہت اہم دستاویز ہاتھ آ گئی ہے حالانکہ اس سے قبل بھی ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی نسبت مکتوبات پر مشتمل تخلیقات منظر عام پر آ چکی تھیں اس کے باوجود جناب خالد ندیم نے پھر سے اس کام کا بیڑہ اٹھایا اور پہلے سے مطبوعہ خطوط سے قطع نظر اردو، ہندی، انگریزی میں تحریر کیے گئے بے شمار اہم خطوط کو یکجا کرکے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اور اُن کی بیگم صاحبہ کی بابت اُن کے ہم عصر احباب اور ناقدین کی

آرا منظر عام پر لا کر ایک احسن فریضہ انجام دیا ہے جس کی تحسین کے ساتھ تقلید بھی اگر کی جائے تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ اختلاف رائے سے ہی علم کے قرینے دریافت ہوا کرتے ہیں۔ ہمارے خیال میں تو جناب خالد ندیم نے اپنی کاوش میں قطعی کوئی تساہل نہیں برتا ہے پھر بھی اہل علم کا فرض بنتا ہے کہ وہ سن 2004 کی اس اہم تحقیق پر توجہ فرمائیں اور اپنے نقد و نظر کے ذریعہ کتاب کے خالق اور اس کی صلاحیتوں کو بڑھاوا دیں۔ قریب دو صفحات کی یہ با معنی کتاب جس میں بابائے اردو مولوی عبدالحق، قاضی عبدالغفار، زمان داس چتر ویدی، پریم چند، دیوان سنگھ مفتوں، مجاز، ساغر نظامی جیسے اساطین ادب کے مکتوبات شامل ہیں صرف ایک صد روپیہ کے عوض تخلیقات، علی پلازہ، مزنگ روڈ لاہور، مکتبہ دانیال، صدر کراچی، ایاب پبلشرز، بھٹی روڈ، راولپنڈی پر دستیاب ہے۔

● تمنا کا اگلا قدم

پروفیسر عبدالقوی ضیا اردو زبان و ادب کے قابل احترام قدر دانوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ آپ نے لکھنؤ، کراچی اور کینیڈا کے قیام میں دامے درمے سخنے اپنے آپ کو ہمہ وقت اس زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے لئے وقف کر دیا تھا۔ خرابی صحت اور نامساعد حالات بھی اُن کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکے۔ آج کینیڈا جیسے مغربی ملک کی یونیورسٹیوں میں اردو زبان کی تعلیم و تدریس پروفیسر قوی ضیا مرحوم کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ پروفیسر صاحب جسمانی طور پر ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں مگر اُن کی حیات و کارناموں پر مشتمل مبسوط کتاب "تمنا کا اگلا قدم" ہمارے لئے پروفیسر عبدالقوی ضیا کو موجود رکھنے کے لئے کافی و شافی ہے۔ اس قلمی جستجو اور لگن کے ذمہ دار معروف شاعر، نقاد، محقق ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی ہیں۔ ایک طرح سے ڈاکٹر صاحب اپنے دور کے جوہری کا کردار نبھا رہے ہیں۔ جب جہاں کوئی جوہر نایاب نظر آتا ہے ڈاکٹر مناظر عاشق فوری طور پر اُسے کتاب کے جامے میں مقید کر لیتے ہیں۔ اس طرح سے نہ صرف زیر بحث شخصیت بلکہ تحقیق و جستجو کے حامل مشتاق احباب بھی فیضیاب ہوا کرتے ہیں۔ "تمنا کا اگلا قدم" دو سو چھپن صفحات کی ایسی مجلد دستاویز ہے جس میں پروفیسر عبدالقوی ضیا کے حیات و کارناموں کے تقریباً سبھی گوشوں کو منور کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی، جناب سلطان جمیل نسیم، سید معراج جامی، محترمہ عطیہ خان، محترمہ فہمیدہ ضیاء الدین، ڈاکٹر داؤد رہبر، شاعر لکھنوی، پروین کمار اشک، حمایت علی شاعر، پروفیسر ممتاز حسین، ڈاکٹر اشتیاق عالم اعظمی، ڈاکٹر ستیہ پال آنند، ڈاکٹر فیروز مکرجی، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر حنیف فوق، ڈاکٹر شان الحق حقی، ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر انور سدید کے علاوہ ان گنت احباب کے رشحات قلم کتاب ہذا میں شامل ہونے کے ساتھ ساتھ نادر تصاویر اور مدیر "چہار سو" گلزار جاوید کی پروفیسر عبدالقوی ضیا سے براہ راست گفتگو بھی شامل ہے۔ دستیابی: اردو دنیا پبلی کیشنز دہلی گیٹ دریا گنج دہلی بھارت۔

قدرت کی عطا کردہ فیاضیوں سے لطف اندوز ہونا ایک طرح سے اپنے رب کا شکر بجا لانے کے مترادف ہے جب کہ اُس کی مہربانیوں کو اُس کے بندوں تک پہنچانا اور اُن کے دُکھ درد کو بانٹتے رہنا ایک طرح کی عبادت ہے محترمہ ناقبہ رحیم الدین قریاضف صدیقی نے اللہ کے بندوں اور اُن کے دُکھ سکھ میں شرکت کو اپنا نصب العین بنائے ہوئے ہیں۔ یہ چند اُن کا دائرہ کار قلمی اور سماجی ہے مگر اُن کی تڑپ چہار جانب اور ہمہ جہت ہے۔ ''گلہائے رنگ رنگ'' اسی تڑپ کا ایک ردِعمل ہے جس میں نہ صرف اپنے دور کے بلند قامت و بلند مرتبت اہلِ قلم کو قلمی خراج پیش کیا گیا ہے بلکہ اپنی تاریخ کی روحانیت، سیاست، سماجیت، تاریخ، جغرافیہ، ادب، شاعری سے بھی اَنمول موتی چننے کی کوشش کی گئی ہے سندھ کے عظیم صوفی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی، علامہ اقبال، حسرت موہانی، مولانا حسین کی گراں بہا خدمات و شخصیات پر کوئی نئی بات نہ کہتے ہوئے بھی بہت سی نئی جہتوں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اسی طرح مرزا غالب، جوش ملیح آبادی کے ساتھ اپنے دور کے چند ڈاکٹر وزیر آغا، اُمید فاضلی، اختر ہوشیار پوری، ممتاز مفتی، نسیم حجازی، شوکت واسطی، رشید نثار کی تخلیقات کو شفاف شیشے میں پاکیزہ قلمی کے ساتھ عمدگی سے نکھارا گیا ہے۔ اصل میں ''گلہائے رنگ رنگ'' محترمہ ناقبہ رحیم الدین کی قریب بیس سالہ قلمی کاوشات کا ثمر ہے جس میں مختلف شخصیات اور اُن کی تخلیقات پر تحریر کئے گئے مضامین یکجا کر کے قارئین اردو کو ایک تحفہ کی صورت پیش کئے گئے ہیں اب آپ پر منحصر ہے کہ آپ اس تحفہ گراں بہا سے جس قدر مناسب خیال فرمائیں حظ اُٹھائیں اور جس قدر ضرورت محسوس کریں نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھیں۔ ہمارا مقصد عمدہ لوگوں کے لیے عمدہ تخلیق کے تعارف تک محدود ہے پانچ سو سترہ صفحات، عمدہ نفیس کاغذ، خوش رنگ سرورق، مضبوط جلد اور اعلیٰ پرنٹ کی یہ رنگا رنگ کتاب صرف -/690 روپے کے عوض 9 جاپانی روڈ راولپنڈی کینٹ پر آپ کی توجہ کی منتظر ہے۔

☜ اردو ادب میں جس برق رفتاری سے سب اچھا ہے کی دوڑ لگی ہوئی ہے کون ہے جو اس سیلاب بلا کے مخالف تیرنے کی کوشش کرے؟ اس طوفان بلا بدراں میں سچی بات کہنا اول دشوار ہے اور اس بعد اُس کی اہمیت منوانا اُس سے بھی دشوار تر امر! اردو افسانہ ایک صدی کا سفر طے کر کے توانگی کے جس مقام پر ہے وہاں خوشگوار یادوں اور سدا بہار تخلیق کاروں کے ناموں کی ایک کہکشاں بڑی تابانی سے جگمگ جگمگ کر رہی ہے۔ ہمارے دور و ہمارے ہی عہد کے کہنہ مشق افسانہ نگار حمید شاہد کا تازہ افسانوی مجموعہ ہے جس کا عنوان ''مرگ زار'' تجویز کیا گیا ہے جسے ''اردو ادب'' کے نہایت روشن دماغ اور جانکاہ تخلیق کار جناب مبین مرزا کے ادارے نے شائع کیا ہے۔ ''مرگ زار'' میں کل پندرہ افسانے شامل ہیں۔ ہر افسانہ موضوع تحریک اور کرداروں کے لحاظ سے منفرد ہونے کے ساتھ گذشتہ دو تین سالوں میں مظلوم و مقہور لوگوں پر گذرنے والی داستانِ الم بیان کر رہا ہے۔ ہمارے بیان کی سچائی اپنے عہد کے بلند ترین فنکار بھی فراہم کر رہے ہیں۔ ''محمد حمید شاہد سچی اور کھری زندگی کی ترجمانی کا حق ادا کر رہا ہے وہ کہانی کہنے کے فن پر حیرت انگیز طور پر حاوی ہے... احمد ندیم قاسمی ''حمید شاہد کے بیان میں سادگی اور خلوص ہے خیالات میں ندرت ہے اس کا نقطۂ نظر مثبت ہے اور اس کی سچائیوں میں رنگ بے رس ہے.... ممتاز مفتی ''انھیں استعاراتی تفاعل کا ہنر آتا ہے وہ معانی انسلاکات پر قدرت رکھتے ہیں اور علامتی مفاہیم کا فن جانتے ہیں.... ستیہ پال آنند ''وہ عصری زندگی کے مصائب پر یوں قلم اُٹھاتے ہیں کہ عصریت اور ابدیت میں باہمی کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے.... پروفیسر فتح محمد ملک۔ اس کے علاوہ جناب منشا یاد، جناب رشید امجد اور ڈاکٹر اسلم فرخی بھی حمید شاہد کے فن افسانہ نگاری کی بابت بہت پُر اُمید دکھائی دیتے ہیں۔ پھر ہم اور آپ بھی کیوں نہ مستفید ہوں اور اولین فرصت میں ''اکادمی بازیافت'' کتاب مارکیٹ نمبر 17، گلی نمبر 3، اردو بازار کراچی سے رابطہ کریں جہاں محمد حمید شاہد کا خونِ جگر بشکل ''مرگ زار'' فقط 150 روپیہ کی ارزاں قیمت پر دستیاب ہے۔

☜ جیتے بولتے لفظ

ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی اب تک تحقیق، تنقید، انشائیے اور خاکہ پر مشتمل چار تخلیقات کا قلمی اثاثہ رکھتے تھے حال ہی میں ''جیتے بولتے لفظ'' کی اشاعت کے بعد اُن کی تخلیقات کی تعداد پانچ ہو گئی ہے جب کہ دو کی اشاعت عنقریب متوقع ہے۔ ''جیتے بولتے لفظ'' میں ساٹھ سے اوپر انشائیے شامل اشاعت ہیں جن میں بر دست ہمیں چند انشائیوں سے استفادہ کی مہلت مل سکی ہے۔ بھکو کا شریف، نالیاں، قہقہہ لگانا، سالمہ اور سفارش کے مطالعہ کے بعد طبیعت کافی ہشاش بشاش محسوس کرتے ہوئے زیرِ نظر سطور قلم ہو رہی ہیں۔ ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی زیادہ فلسفہ اور سنائی کے قائل نہیں ہیں جو کچھ جیسا محسوس کرتے ہیں، قلمی چاشنی جس کی مقدار بہت مناسب ہوتی ہے کے ہمراہ اپنے قاری کے سپرد کر دیتے ہیں۔ قاری پر منحصر ہے کہ وہ اُس سے کس قدر محظوظ ہو سکتا ہے یقیناً اس میں پڑھنے والے کے مزاج، ذہنی استعداد اور اُس کے گرد و پیش کا دخل بھی ہوا ہی کرتا ہے۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی پیش لفظ میں کہتے ہیں ''کنفیوشس کے نزدیک لفظ کا درست استعمال نظامِ اخلاق کی بنیاد ہے یقین کیجئے میں نے شعوری سطح پر لفظ کو پوری احتیاط اور لطف و مزے سے استعمال کیا اور بقدر ظرف لفظ کے وسیلے ہی سے اخلاق و اقدار کی ترویج کی ہے آئیے! ڈاکٹر صاحب کے بیان کی تصدیق میں کتاب سرائے غزنی مارکیٹ اردو بازار، لاہور، ملتان کتاب گھر، چوک گھنٹہ گھر، ملتان، بیب اینڈ سنز، غزنی کا ڈگل حسنت ملتان سے اپنی سہولت کے مطابق رجوع کرتے ہیں جہاں ڈاکٹر صاحب کی

کاوشِ قلم' پڑھتے ہوئے لطفاً' سبح دو صد روپیہ کے عوض ہماری نظر ہے۔

یقین

جس تیزی کے ساتھ "چاند" کے تخلیق عصر کو پذیرائی مل رہی ہے ہماری ذمہ داری بھی اسی قدر بڑھتی جا رہی ہے آپ جانتے ہی ہیں کہ یہ تنقید کے بجائے تعارفی سلسلہ ہے پھر بھی تبصرہ نگاری رائے کسی نہ کسی شکل میں ظاہر ہو ہی جاتی ہے۔ اس وقت ہمارے روبرو ماہنامہ "ادبی دنیا" کے چیف ایڈیٹر جناب عارف شفیق کا تازہ شعری مجموعہ "یقین" اپنی ہیبت سنوار رہا ہے۔ "یقین" میں شامل پانچ سو غزلیں قاری کی نظر تو ہیں ہی تخلیق کار بھی اپنی راتوں کی قربانی کا ثمر اور اپنے خونِ جگر کا جو جانے کا متمنی اگر ہو تو یہ خواہش بے جا ہرگز نہ کہلائے گی۔ البتہ! اس قدر مادی اور مفاداتی دور میں اتنی زیادہ تعداد میں غزلیں کہنا اور شائع کرنا بجائے خود حوصلے اور جرأت کا کام ہے جس سے اتفاق کرنا فوری طور پر ہمارے لئے ناممکن ہے۔ پانچ صد غزلوں کو کم از کم اشعار سے بھی ضرب دی جائے تو بھی تعداد ہزاروں پر جا کر رُکتی ہے چند غزلوں یا شعروں کا انتخاب کرنا اسی قدر دشوار ہے جس قدر ان کی تخلیق' در اصل قصور جناب عارف شفیق کا ہرگز نہیں ہے ہمارے دور اور اس پر گذرنے والی قیامتیں کسی بھی صاحب دل کو مضطرب کرنے کے لئے اس کی ذہنی و جسمانی استعداد سے بہت زیادہ ہیں۔ جو کچھ نہیں کر سکتا غم و غصہ کی کیفیت میں گرفتار ہے جسے قدرت نے کچھ کرنے کی توفیق بخشی ہے وہ بہت کچھ کہنے اور اس کہے کے پردے میں اپنا آپ بیان کرنے پر مُصر ہے اگر ہم عارف شفیق اور انہیں کی قبیل کے تخلیق کاروں سے ان کی زود گوئی کا سبب دریافت کریں تو وہ یہی کہیں گے کہ اتنا کچھ کہنے کے باوجود دل و دماغ کا بوجھ ہنوز برقرار ہے۔ شاید! انہیں کا یہ شعر ہمارے استدلال کی صحیح ترجمانی کر سکے۔

شہر کے بند جب سارے رستے ہوئے
لوگ زنداں میں تھے گھر میں رہتے ہوئے

پانچ سو چوالیس صفحات کے اس مجلد شعری مجموعے کی قیمت حیرت انگیز حد تک کم یعنی صرف دو صد روپیہ رکھی گئی ہے جو فرید پبلشرز اردو بازار کراچی سے دستیاب ہے

● سوانح اور سفر

خواتین کا استحصال قدیم یونان میں عورتوں کا کردار' یونانی تہذیب میں طوائفوں کا عروج و زوال' بابلی تہذیب' اسرائیلی تہذیب' انگلستان اور فرانس میں عورتوں کی سماجی و معاشرتی حالت' عرب عورتوں کے ابتدائی حالات' ہندوستان کی آریائی تہذیب میں عورتوں کا مقام' عورتوں کی تحریک مساوات و نجات' عورتوں کے حقوق کے بارے میں جان اسٹورٹ کے نظریات' مارکس اور دوسرے دانشوروں کے مطالعہ کا نچوڑ غرض وہ کونسا موضوع سخن ہے جس پر ڈاکٹر مناظر عاشق نے محترمہ زبیدہ داؤدی سے گفتگو نہ کی ہو اور ڈاکٹر صاحب کے ہر سوال کے جواب میں ان محترم خاتون نے مکمل شائستگی سے قطعی بے پرواہ ہو کر ہر سوال کا جواب نہایت تفصیل' تدبر اور دانش سے دیا ہے جس میں نہ صرف علم کے دریا کی جگہ پر علم کا سمندر بکراں اُٹھتا نظر آتا ہے ہر چند کتاب صرف اسی صفحات پر مشتمل ہے مگر انسان کی پُر پیچ تاریخ کا ایک ایسا آئینہ ہے جس سے ایک ہی وقت میں ان گنت موضوعات معاشروں' ملکوں اور براعظموں کی تاریخ' تہذیب' رہن سہن کے ارتقائی ادوار کی بابت' اس قدر علم دستیاب ہے جو بہت سی ضخیم کتب میں نایاب ہوتا ہے محترمہ زبیدہ داؤدی کا انداز بیان اور اس پر ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا طرزِ تحریر دو آتشہ پیدا کر رہا ہے۔ اگر آپ اپنے وقت کا بہتر مصرف چاہتے ہیں تو سبح ایک صد روپیہ کے عوض "سوانح اور سفر" ترسیل دنیا' دریا گنج دہلی بھارت سے فوری طلب کیجئے۔

یادیں باتیں

کچھ نہ کرنے والے اعتراض بہت خوب کیا کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے عمل سے کسی کو فائدہ پہنچنے کا بہت ہی کم امکان ہوتا ہے جب کہ کچھ نہ کچھ کرنے والوں کا عمل بہت سی راہوں کو منور کر رہا ہوتا ہے آپ کو اختیار ہے کہ آپ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی پر بسیار نویسی کا الزام عائد کریں' ہماری خواہش فن رنگ ہائے گو بہ گو کو عام کرنے کی ہے جس سے ایک عالم نہ سہی عالم اردو تو ضرور جگ مگ کر رہا ہے۔ "یادیں باتیں" اردو زبان و ادب کے گیارہ نہایت محترم اور قد آور بلند نامہ قلم کاروں کے ذکر واذکار کی ایسی دستاویز ہے کہ آپ ان سے مل کر بھی خود کو ان کی صحبت میں محسوس کریں گے بالخصوص نوجوان اور نو عمر اہل قلم کے لئے تو یہ ایک ایسا تحفہ ہے جس سے دل و دماغ کی تراوٹ کے ساتھ عملی میدان میں بھی آسانیاں مہیا ہو سکتی ہیں۔ "میری یادوں میں اپنے مختلف ماہرین کا اشتراک مثال ہے جن کی باتوں میں رفاقت ہے' ذوق کی آبیاری ہے' ادب اور ادیب کا تجزیہ ہے' اور فہم و ادراک کے معاملات کا تعلق ہے" ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی..... جن دیو قامت ادبا و شعرا کی یادوں سے یہ محفل سجی ہوئی ہے ان میں جناب فراق گورکھپوری' جناب جمیل مظہری' جناب نسیم انہونوی' جناب کلیم عظیم آبادی' جناب خلیل الرحمٰن اعظمی' جناب زیب غوری' جناب غیاث احمد گدی' جناب احمد جمال پاشا' جناب کالی داس گپتا رضا' جناب کلام حیدری اور جناب مناظر گیلانی ایک سو تیس صفحات' عمدہ طباعت' مضبوط جلد' امپورٹڈ کاغذ کی یہ نادر کتاب ایک سو تیس روپیہ کے عوض ترسیل دنیا پبلی کیشنز' دریا گنج دہلی بھارت سے دستیاب ہے۔

✽ کرام تبسم (فن و شخصیت)

جس طرح ہر انسان کے لئے ہر بات سے اتفاق ممکن نہیں اسی طرح ہمارے لئے بھی یہ امر حیرانگی کا باعث ہے کہ بہت سے جوش جذبوں کے

مالک تحقیق کاروں کے احباب نہ جانے کیوں عالم شباب ہی کو عالم کمال گردانتے یا تسلیم کرانے پر مجبور ہوا کرتے ہیں۔ الحمد للہ! جناب اکرام تبسم عمر عزیز اور قلم بسیط کے اس مقام پر متمکن ہیں جہاں کچھ کر گزرنے کے باوجود بہت کچھ کرنے کی تڑپ دل میں کروٹیں لے رہی ہوتی ہے۔ ہمارے خیال میں ابھی ان کی شخصیت کی بہت سی پرتیں کھلنے اور ان کے قلم سے بہت سے ادبی کارنامے سرزد ہونا باقی ہیں ان کے فن و شخصیت کو اس مرحلہ پر خراج پیش کرنا ہمارے خیال میں قبل از وقت ہے بہر حال یہ ہماری رائے ہے جس کے اظہار کا حق ہم نے استعمال کیا کتاب ہذا کو شائع کرنے والوں کے مقاصد اس سے مختلف بھی ہو سکتے ہیں۔ ایک سو بانوے صفحات کی اس کتاب کو جناب اشرف سلیم نے مرتب کیا ہے جس میں جناب اکرام تبسم کی بابت مختلف جرائد اور کتب میں شائع ہونے والے مضامین اور آرا کو یکجا کر کے جناب اکرام تبسم کے فن و شخصیت کو جانچنے کی سہولت مہیا کی گئی ہے۔ جن احباب نے اکرام تبسم صاحب کی بابت اظہار خیال فرمایا ہے ان میں سر فہرست پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر سحر انصاری، ڈاکٹر رشید امجد، فاطمہ ثریا بجیا، اظہر جاوید، سلطان رشک، اسلم کمال، محمود سعیدی، ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی، اشتر خاقانی اور حبیب جالب کے اسمائے گرامی نمایاں ہیں۔ دستاویز مطبوعات لاہور کے زیر اہتمام شائع ہونے والی یہ معلوماتی کتاب 130 روپے کے عوض کمرہ فلور نتا چیمبرز بنگالی گلی کچہری روڈ اردو بازار لاہور پر دستیاب ہے۔

وفا آواز دیتی ہے

قلم کو اپنا ظرف دکھلا دو ----- لاش کو سنگسار کے بیٹھ رہو
ہو گئے جمع سامعین تمام ----- بڑھ چلا ہے سکوت، خطبہ دو

دو ہزار چار کے افق پر ظہور میں آنے والے جناب اکرام تبسم کے تازہ شعری مجموعے کے فلیپ پر درج اشعار آپ کی نذر کر کے ایک طرح سے آپ کو دعوت مطالعہ دی ہے شاید اپنے نام کی معنویت کے اعتبار سے وفا آپ کو آواز دے رہی ہے۔ جی ہاں! ہوا جب اُسے ملنا میری جانب سے یہ کہنا تمہیں ڈھونڈ کے جزیرے سے محبت کے مسافر نے پھر ایک پیغام بھیجا ہے.... یہ نیا پیغام جناب اکرام تبسم کا ہے جس کا نام "وفا آواز دیتی ہے" جس میں نامور معروف شاعر جناب اسلم کمال کا سرورق اور مصنف کو شری خراج اور ہی انفرادیت کا حامل ہے ان ہی کا ایک جملہ ملاحظہ فرمایئے۔ اکرام تبسم ایک ایسا شاعر ہے جو اپنے شعری سرخوشی میں سرشار اور اسی طمانیت اور اسی اطمینان میں زندہ رہنا چاہتا ہے اسے یہ زندگی مبارک..... کتاب ہذا کے پیش لفظ میں جناب رؤف نیازی کا خیال ہے ارضیت اور روحانیت کی تمام جمالیات اپنی تمام تر پاکیزگی اور طہارت کے ساتھ ان کے یہاں دیکھی جا سکتی ہے.... "وفا آواز دیتی ہے" میں حمد و نعت، سلام، غزلیں، نظمیں شامل ہیں۔ ضخامت ایک سو اٹھائیس صفحات مجلد قیمت ایک صد روپیہ اور ملنے کا پتہ دستاویز مطبوعات اردو بازار لاہور ہے۔

٭٭٭ حرف کی شہزادی

ہم کہہ رہے اہل ادب سے کہ دوستو!
ہم سرزمین اہل محبت سے آئے ہیں
تاراج کی ہیں ہم نے جہالت کی ظلمتیں
ہم نے چراغ مہر و اخوت جلائے ہیں

قارئین ادب کو نوید ہو کہ ابھی اردو ادب کے دربسیط گشتا پر "سفر نامہ" بانیا ہی کا منتظر تھا کہ منظوم سفر نامے نے بھی اپنی آمد کا اعلان کر ڈالا اور یقیناً شاہدہ لطیف صاحبہ اس صنف ادب کی موجد نہ سہی اس کے ابتدائی کاروں کی ذکر رنگین کرانے کی حقدار ضرور ٹھہرتی ہیں۔ شاہدہ ایک اچھی نظر کے ساتھ بہت حساس دل بھی رکھتی ہیں۔ شانزے لیزے پر چلتے ہوئے چاروں طرف کا طوفان رنگ و نور و خوشبو دیکھنے اور محسوس کرنے کے ساتھ انہیں پاکستان کے بھوکے ننگے بچے اور خود فرانس کے مفلس یاد آتے ہیں..... جمیل الدین عالی

شاہدہ نے اس سفر میں قاری کو کسی اکتاہٹ کا شکار نہیں ہونے دیا۔ ان کی قادر الکلامی ان کے اظہار کو آسان بناتی چلی جاتی ہے..... عطاالحق قاسمی یہ تو ہمارے عہد کے دو نامور اور بلند قامت کا تحریر شاہدہ لطیف کو خراج تھا جب کہ حرف کی شہزادی آپ سے خود ملاقات کی مشتاق اور اپنے حسن کی داد کی طالب ہے جس میں "حرف کی شہزادی"، "تحفہ محبت"، "تقریب سے خطاب"، "ارض فرانس کے نام!"، "انقلاب فرانس"، "پیرس میں اہل ادب"، "پیرس کی تاریخ"، "پیرس کے حسین چہرے"، "شانزے لیزے" کے عنوانات سے سفر فرانس کی مشاہداتی روداد منظوم کی گئی ہے صفحات ایک سو چوالیس قیمتی امپورٹڈ کاغذ، دلکش اور دیدہ زیب سرورق کی مجلد کتاب سیٹ ایک صد پچاس روپیہ میں الحمد پبلی کیشنز لاہور سے طلب کی جا سکتی ہے اور اگر مصنفہ کے فن کی داد دینا مقصود ہو تو اوور سیز اپارٹمنٹ G-8 اسلام آباد سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔

کنول جمیل کا گیت

تمہیں میں نے پہلے بھی اک دن کہا تھا
یہ انساں کی سوچیں ہیں
صحراؤں میں بے سمت اونٹوں کی مانند
اڑتے ہوئے ریت کے ٹیلے ہیں
جن کا ٹھکانہ کہیں بھی نہیں ہے

خلیق الرحمٰن جواں عمر، جواں ہمت اور جواں جذبوں کا شاعر ہے جو قدرت کی سنائی میں انسانیت کی معراج دیکھنے کا متمنی ہے اگر کسی ساعت خوشی اس کا مقدر ہوتی ہے تو نظموں میں جل ترنگ بجنے لگتے ہیں جب کبھی اس کے برعکس ہوتا ہے تو انہی نظموں میں حسرت و یاس کبھی کبھی احتجاج بھی ابھرنے لگتا ہے۔

زندگی چند پردوں کے پیچھے چھپی
ایک تمثیل ہے
وقت کے کھیل میں جو بھی کردار ہے
ایک کلاکار ہے

ہر چند یہ نوجوان قلم کار شعری افق پر نمایاں مقام حاصل نہ کرسکا ہے مگر بے بہت امکانات کا حامل ملاحظہ کیجئے!

خود سے پہلے دفتر میں
میں جاتا ہوں ہر روز
دفتر جا کر خود کو گھر میں
بھول آتا ہوں ہر روز

غرض کنول کھیل کا گیت میں ان گنت نظمیں موضوع ہیت اور بنت کے اعتبار سے منفرد بھی ہیں اور قابل توجہ بھی اور ایک دور افتادہ دیہی ماحول کے پروردہ نوجوان کے قلم سے اس مزاج اور معیار کی شاعری سے اردو ادب کو کچھ نہ کچھ توقعات ضرور رکھنا چاہئے ۔وقت کی تیز رفتاری کو اگر ہم نے ذہن میں مقید کیا ہے تو اردو شاعری میں نظم اور اس کے جدید تقاضے بھی پیدنظر رکھنا ہوں گے اور ہمارے خیال میں ظلیق الرحمٰن یہ کوشش بڑے سلجھے انداز میں کررہا ہے۔

اینٹوں کی بستی میں
خوف جزیرے میں
ایک نگر تمہارا اک نگر ہمارا ہے
پانیوں کی سرحد پر سوکھی زمینوں پر
پھول کھِل کھلتے
لوگ جُڑ کر ملتے....

کتاب ہذا اسلئے ایک سو پچاس روپیہ کے عوض حرف اکادمی راولپنڈی پر دستیاب ہے

شعر و حکمت

شعر و حکمت کتاب چھٹے دور سوم علم و ادب کے قدیم مرکز حیدرآباد دکن سے محترمہ اختر جہاں کی ادارت میں کچھ عرصہ سے اشاعت پذیر ہو رہا ہے ایک ہزار صفحات پر محیط اس خاص شمارے کے مرتبین جناب شہریار اور جناب مغنی تبسم ہیں جنھوں نے پاک و ہند کے تمام ادبی مراکز کی نمائندہ تخلیقات کو نہایت سادگی سلیقے اور سجاؤ سے ترتیب دے کر ہم اور آپ کے ذہن کی بالیدگی کے لئے اتنا کچھ فراہم کردیا ہے کہ عرصے تک کوئی تازہ ادبی دستاویز نہ بھی میسر ہو تو یہ اہم ذخیرۂ ادب آپ کی محبت کو گرماتا رہے گا۔ شعر و حکمت کے اس خاص شمارے کا انتساب ہمارے عہد کے صاحب اسلوب شاعر جناب عرفان صدیقی کے نام ہے جو عارضی زندگی کی مسافت تمام ہونے کے بعد ابدی سفر پر روانہ ہو چکے ہیں۔ "شعر و حکمت" کی اس خاص اشاعت میں قاضی سلیم کے لئے خاص گوشہ مخصوص کیا گیا ہے جس میں قاضی صاحب کے مختصر حیات نامہ کے ساتھ جناب شمس الرحمٰن فاروقی شمیم حنفی ابوالکلام قاسمی قاضی افضال حسین شافع قدوائی قاضی جمال حسین عقیل احمد صدیقی عمر ہاشم سحر سعیدی اور جناب مغنی تبسم نے قاضی سلیم کے فن شخصیت اور خدمات پر اظہار کیا ہے تنقید و تحقیق کے باب میں لکھنے والوں کا سہرا جناب امتیاز احمد سید خالد قادری ناصر عباس نیر باقر مہدی شاداب رودولوی فردوس جاوید راشد انور راشد اور سکندر احمد صاحبان نے کھلائے ہیں۔ نظم کے باب میں بھی بہت تنوع ہے جس کی آبیاری جناب غلام حسین ساجد مسعود مرزا خبیب الرحمٰن باقر مہدی شفیق فاطمہ شعری بشر نواز راشد آزر مصحف اقبال توصیفی عبدالاحد ساز عامر عبداللہ علی ظہیر مہتاب حیدر نقوی اسلم مرزا رؤف خلش رفیق سندیلوی شاداب رضی فخر رضوی شکیب ایاز مظہر مہدی رحمت یوسف زئی حبیب حق مختصر فاطمہ تاج اظہار وارثی حبیب اجملی رفعت اقبال اور علی ظہیر غزلیات کا گلشن بھی نوع بہ نوع پھولوں سے مہکا ہوا ہے باقر مہدی مظہر امام عرفان صدیقی شہریار بشر نواز راشد آزر غلام حسین ساجد احسن رضوی مصحف اقبال توصیفی مہتاب حیدر نقوی کرشن کمار طور عالم خورشید حسن فرخ رؤف خلش منظور ہاشمی عشرت ظفر رحمت یوسف زئی راحت حسن معراج رعنا شاہد کلیم عامر عبداللہ قربان آتش انور سلیم ابرار احمد راشد انور راشد امتیاز احمد دانش شکیل مظہری اعجاز عبید عالم پرویز اظہار وارثی محسن جلگانوی تنہا تماپوری تاج پیامی شاہد اختر طارق متین مسعود مرزا رضوان رضا فاطمہ تاج اور سیما فریدی۔ افسانوں میں جناب قیوم راہی رشید امجد شوکت حیات بیگ احساس حبیب حق مظہر سلیم ام کلثوم قدیر زماں خالدہ حسن کے نام نمایاں ہیں۔ اس کے علاوہ گوشہ وہم پرکاش زل اور کچھ امتنان کا منتخب کلام بھی بڑی معنویت کا حامل ہے بھارت میں اس ضخیم اشاعت کی قیمت فی نسخہ چار صد روپیہ اور بیرون بھارت 20 امریکی ڈالر مقرر کی گئی ہے شعر و حکمت کے ہمراہ شاتی مرحوم کا ناول "کالا جل" مفت فراہم کیا جارہا ہے جس کی قیمت -/250 روپیہ ہے

پتہ: مکتبہ شعر و حکمت 6-3-659/2 کپاڈیا لین سوما جی گوڑہ حیدرآباد (A.P)500082 انڈیا۔

کالا جل

ہمارے درمیان موجود بڑے فنکار شانی کی تصنیف ہے جسے ہندی سے اردو میں جناب حیدر جعفری سید نے منتقل کیا ہے اور مکتبہ شعر و حکمت حیدرآباد نے شائع کیا ہے کالا جل تین نسلوں پر مشتمل سوتی تالاب کے کنارے بسے ایک خاندان کی کہانی ہے جو کہیں ملاحدہ بھی ہے کہیں مُردہ بھی ہے اور معاشرہ کا پایا ہو اطبقہ بھی ہے تین نسلوں پر مشتمل اس کہانی کو شانی نے تین

حصوں "لوٹتی لہریں"، "بھٹکاؤ"، "ٹھہراؤ" میں کچھ اس طرح سے بانٹا ہوا ہے کہ پڑھنے والے کو نہ چاہتے ہوئے بھی خیالی سفر از سرِ نو طے کرنا پڑتا ہے "لڑکی اور ایک ٹین تھا ہے شانی کے پاس بستر کی قدرتی خوبصورتی جنگل، پہاڑی میدان، دھوپ، پھول، خوشبوؤں بارش، ٹھنڈ اور قدرت کے بدلتے ہوئے سروں کو پکڑنے کی"..... راجندیا دو "فن اور ادب کی دنیا سے مردوں عورتوں کے تعلقات کے بارے طرح طرح کی خبریں آتی رہتی تھیں۔ شادی، شادی کے بعد عشق اور عشق کے بعد کسی اور سے شادی۔ ایک سوال من میں آتا تھا کہ یہ فن کا راور ادیب ایک جگہ ٹک کیوں نہیں پاتے؟ ایک دن باتوں باتوں میں یہ سوال میں نے پاپا کے سامنے رکھ دیا۔ بولے لا دیکھو بیٹے، جب کوئی لہر اپنی جگہ سے اٹھتی ہے تو وہ اپنے نیچے ایک گہرا گڑھا چھوڑتی ہے ان کے کہنے کا مطلب وہی تھا کہ اپنے تخلیقی عمل میں ڈوبے ہوئے فن کار اور ادیب کی زندگی میں بہت کچھ ٹوٹا چلا جاتا ہے".....صوفیا شانی، "کل شیر خان شانی کا ناول کالا جل انسان بالخصوص نوجوان شعراء کے لئے برف کی طرح گھلتے، پگھلتے انسانوں کا ایسا منظر نامہ ہے جسے اردو ادب میں ایک شاہکار کی حیثیت سے مدتوں یاد رکھا جانا چاہئے بلکہ صرف یاد رکھا جانا چاہئے، اس پر کھلے دل و دماغ سے سوچ بچار بھی جاری رکھنا چاہئے تاکہ بعد از وقت ہی سہی ہم حق بہ حق دار کی طور تو ادا ہو سکے۔ "کالا جل" ہمیں اور "شعر و حکمت" کے قاری کو مفت دستیاب ہوا ہے اگر آپ کے دل میں "کالا جل" کی نسبت اشتیاق در آیا ہے تو آپ مکتبۂ شعر و حکمت 6-3-659/2 کپاڈیا لین سوماجی گوڑہ حیدرآباد 500082 (A.R) انڈیا سے رابطہ کیجئے جہاں "کالا جل" صرف دو سو پچاس روپیہ کے عوض آپ کی دسترس میں آنے کا منتظر ہے۔ بیرون بھارت کے قاری اسے دس امریکی ڈالر کے عوض حاصل کر سکتے ہیں۔

● تمازت کم نہیں ہوتی

یہ اب تم جان لو شاہد کہ سب قسمت کے چکر ہیں
شجر کے سائے میں بھی جب تمازت کم نہیں ہوتی

جس قدر ماہ و سال کا گراف اونچا ہے جناب شاہد واسطی اس قدر بلند آہنگ فنی قد کا ٹھ نہ نکال سکے۔ وجہ اس کی مرنجا مرنج طبیعت اور قناعت پسندی ہے ان کے ہاں شعر کٹھالی میں ڈھلنے کے بجائے مٹی کی ہانڈی میں دھیمی آنچ پر پکایا جاتا ہے۔ دوسروں کو قائل کر نے یا میڈیا میں نظر آنے کے لئے دانستہ کوئی کوشش نہیں کی جاتی۔ "تمازت کم نہیں ہوتی" گئے وقتوں کی روایات کا عمدہ نمونہ ہے جس میں جا بجا ہمارے عہد کی نمائندگی، خوبصورتی، کہیں جگر دردمندی اور کہیں موقعوں پر گریہ کے انداز میں کی گئی ہے

خاک سے خاک یہ محبت کی
ہم نے تو بار بار ہجرت کی

جدا جانے یہ زت کیوں بے ثمر ہے
اسے اپنی نہ کچھ میری خبر ہے

جلی ایسی ہوتی ہے اب تری فرقت کے گھاؤ میں
کہ جیسے آگ دہکائی گئی ہو اک الاؤ میں

ہر کسی سے عدل کر احسان کرنا چھوڑ دے
یہ کہا کس نے کہ تو پہچان کرنا چھوڑ دے

"تمازت کم نہیں ہوتی" ایک سو بانوے صفحات پر محیط ہے جس میں نوجوان فنکار جناب جواز جعفری کا تیرہ صفحات پر مشتمل ابتدائیہ جناب شاہد واسطی اور ان کے فن کو سمجھنے میں بڑا معاون ثابت ہوتا ہے "شاہد واسطی کی شاعری ہماری نئی سوسائٹی کی بائیو گرافی ہے جسے شاعر نے فنکارانہ مہارت سے ہر زخ اور ہر پہلو سے آشکار کیا ہے..... جواز جعفری" تقریباً بیس صفحات پر پھیلی نظمیں بھی جناب شاہد واسطی کی دردمندی کی دلیل ہیں جس میں انہوں نے مرحوم احباب کو منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا ہے جناب شہرت بخاری، جناب آرش صدیقی، پروفیسر جیلانی کامران، جناب تاج سعید، ماجد اور خورشید گیلانی، جناب مبارک احمد، جناب سرور مجاز، جناب اسلم سحرائی اور جناب تجمل خلاقی اس فہرست کے نمایاں نام ہیں۔ سلیقے، قرینے اور نفاست کا نمائندہ یہ شعری تحفہ ماورا پبلشرز بہاولپور روڈ لاہور کے زیر اہتمام شائع ہوا ہے، جس کی قیمت صرف ایک سو پچاس روپیہ ہے

● سجے ہوئے کچھ دن ایسے ہیں

اپنی پسند اور افتادِ طبع کے مطابق جناب بشیر موجد نے فلمی گیت کے مصرع کو اپنی بائیو گرافی کا عنوان بنایا ہے مگر نہ فلم سے اس کا کوئی تعلق نہ ہے قبل اس کے جناب بشیر موجد "معصومانہ خطائیں"، "نوحۂ ماتم"، "بولتے رنگ سوچتی لکیریں"، "رنگ نیرنگ" تحریر کر کے قلمی قوت منوا چکے ہیں۔ "سجے ہوئے کچھ دن ایسے ہیں" یادوں اور باتوں کے علاوہ عکسی آہنگ کا ایک خوبصورت گلدستہ ہے جس میں کسی طرح کی رنگ آمیزی دانستہ ہرگز نہ کی گئی ہے۔ حالات و واقعات کو جوں کا توں صاف اور سلیس زبان میں سپردِ قلم کر کے حق بہ حق دار رسید کر دیا گیا ہے۔ تقریباً تین صد صفحات کی یہ کتاب بظاہر جناب موجد کی آپ بیتی ہے مگر قاری کے لئے اس میں اور بہت کچھ ہے مثال کے طور پر جناب موجد نے اپنی کہانی بیان کرنے کے لئے صرف ایک صد اسّی صفحات مستعار لئے ہیں جب کہ ایک صد نوای صفحات بلند قامت اہلِ قلم کی آراء پر مشتمل ہیں جن میں ساحر سے لے کر موجودہ عہد کے معتبر اہلِ قلم کی اس قدر بھرپور نمائندگی ہے کہ

آپ بیساختہ طور پر جناب بشیر سوجد کی شخصیت کی ہمہ گیری کے قائل ہو جاتے ہیں۔ "بچے ہوئے کچھ دن ایسے ہیں" کی بابت جناب احمد ندیم قاسمی فرماتے ہیں "وہ جب بھی مصوری کرتا ہے تو اس میں شاعری کرتا ہے اور جب شاعری کرتا ہے تو تصویر بنا جاتا ہے مگر اس کی تخلیقات پر ایک نظر ڈالنے سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ رنگوں اور خطوں کے عقب میں ایک شاعر موجود ہے..... کتاب مذکور میں سولہ صفحات پر مشتمل تصاویر بھی حسن اضافہ کے طور پر بہت ہی خوشگوار یادوں کو اپنے جلو میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ ان سب خصوصیات کے باوجود کتاب کی قیمت انتہائی کم ہے یعنی تین صد صفحات کی یہ بھرپور کتاب صرف ایک سو پچاس روپیہ میں خزن پبلشرز 35رائل پارک لاہور سے دستیاب ہے۔

بے بس پرندے

جب جب ہمارے دوہرے بھارت میں اردو زبان و ادب کی نسبت خوش اُمیدی ظاہر کی گئی تب تب ہم نے اس خیال سے اختلاف کو ضروری کرنا ضروری سمجھا مگر آج ' پنجاب کی دھرتی کے ایک غیر اردو داں سپوت ڈاکٹر بشیر سنگھ شاہ کے پنجابی ناول جس کا اردو میں ترجمہ جناب عبدالرشید قادری نے کیا ہے کے مطالعہ اور انسانی جسم و جاں کے ماہر ڈاکٹر شاہ کے اردو کی بابت پر جوش جذبات سے جان کاری کے بعد ہمارا جی چاہتا ہے کہ ہم اپنے خیال اور اپنی رائے پر نظر ثانی کریں۔ "میں اپنی اس کتاب کو اردو زبان میں چھپوانا چاہتا ہوں' میری خواہش ہے کہ پنجاب میں چونکہ اردو زبان اب تقریباً خاتمے کے قریب ہے اُسے زندہ رکھنے والوں کی فہرست میں ایک پنجابی داں ہونے کے باوجود میں بھی اپنا نام درج کروا سکوں اور میرا پیغام محبت اردو داں طبقے تک پہنچ جائے..... ڈاکٹر بشیر شاہ قدرت کی کوئی نعمت ہے جو ڈاکٹر شاہ کو میسر نہیں انھیں ہے تو انسانوں تمام انسانوں کے بیچ بھائی چارگی' مروت اور اخوت میسر نہیں ہے جس نے ڈاکٹر شاہ کو تمام تر آسائش میں بھی بے کل و بے قرار کیا ہوا ہے۔" شاہ جس نے یہ کتاب لکھ کر نہ صرف دونوں ممالک کی عوام کے جذبات کی ترجمانی کی ہے بلکہ کتاب کے نام "بے بس پرندے" کا حق بھی ادا کیا ہے۔ کتاب کی درد بھری اور دلوں کو جھنجوڑ دینے والی تحریر سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے دل میں ایک گہری تڑپ و فکر چھپی ہوتی ہے جو اس کتاب میں شروع سے آخر تک سر چڑھ کر جادو کی طرح دونوں ملکوں کے بے بس پرندوں کی سی کیفیت والی عوام کو ایک پیغام دے رہی ہے"..... چوہدری عبدالغفار' پیغام پیش لفظ سے ایک اقتباس اب ذرا ڈاکٹر شاہ کے الفاظ ملاحظہ کیجئے! ہر قوم' ہر مذہب اور ہر خطے میں سماج دشمن عناصر ہوا کرتے ہیں اور وہ ہمیشہ ہی اپنے فساد کے منتظر ہوتے ہیں کہ جس میں وہ جی بھر کر ہر طرح کی لوٹ کھسوٹ کر سکیں اور اس لوٹ کھسوٹ میں اُن کا مذہب یا فرقہ میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا کیونکہ اُن کا تو مقصد ہی لوٹ مار ہوتا ہے"...... "بے بس پرندے" سے اقتباس..... ڈاکٹر شاہ کا اپنا مطمح نظر' اپنا استدلال ہے جو کسی ذو زنجیر سے آپ کو اس پر قائل کرانہیں غور و فکر کی دعوت دینا چاہتے ہیں کہ وقت ابھی ہاتھ سے پوری طرح نکلا نہیں.....!

فروری 2004 میں شائع ہونے والا مشرقی پنجاب کا یہ ناول فقط ایک کتاب نہیں' ایک پیغام ہے غور و فکر کا ایک سوچ ہے' آگے بڑھانے کی ایک فلسفہ ہے لوگوں تک پہنچانے کا ایک سائنس ہے انسانی رشتوں کو بڑھاوا دینے کی۔ صفحات 280' قیمت 120 روپے ملنے کا پتہ مالیر کوٹلہ بک ڈپو جامع مسجد مالیر کوٹلہ' مشرقی پنجاب بھارت۔

⑤ رنگ نا

نہ پوچھو تصور میں کیا دیکھتی ہو	دیارِ حبیبِ خدا دیکھتی ہوں
سرِ آسماں جب اُٹھاتی ہوں نظر	ترے نور کا سلسلہ دیکھتی ہوں

ہر چند محترمہ رنا دہلوی کا آبائی تعلق کانپور سے ہے شعری افق پر نمایاں مقام حاصل کرنے کے بعد آپ نے دہلی کو مسکن بنایا اور خود بھی دہلوی ہو کر رہ گئیں۔ صنف نازک میں شاعری کے حوالے سے جو تجسس و اشتیاق پایا جاتا ہے محترمہ رنا بھی اسی شوق کی انتہا پر نظر آتی ہیں۔ آپ نہ صرف ادبی محفلوں' محافل اور مشاعروں کی مقبول شاعرہ ہیں بلکہ مستقبل کے حوالے سے بھی آپ کی ذات سے خوش اُمیدیاں قائم کرنا قطعی نامناسب نہیں ہے۔ آپ کی شاعری کا سب سے اہم اور نمایاں وصف آپ کا ترنم اور لحن ہے اسی باعث آپ کو مشاعرہ لوٹنے والی شاعرات میں شمار کیا جاتا ہے۔ آپ کے ہاں اپنے عصری احساسات کی ترجمانی احسن طریقے پر انجام دی جارہی ہے۔

ہر گلابی چہرے کو جانِ جاں سمجھتے ہیں
خود کو جانے کیا آخر نوجواں سمجھتے ہیں

روح کا کیا بھروسہ کیا جانے کب نکل جائے
جسم کو کرائے کا ہم مکاں سمجھتے ہیں

غرض محترمہ رنا دہلوی بہت مضبوط امکانات کی شاعرہ ہیں جن کی اثبات کے لئے انھیں سخت محنت اور ریاضت سے اپنا سفر جاری رکھنا ہوگا اور گزرتے وقت کے ساتھ خود کو وقت کی اہم آواز ثابت کرنا ہوگا۔ وہ خود بھی وقت کی رفتار سے آگاہ ہیں۔

ہر لمحہ جہاں حادثہ' ہوش نیا ہو
قائم وہاں کس طرح محبت کی فضا ہو

جب تم نظر آتے ہو تو ہو جاتا ہے سر خم
سچ یہ کہ تم قبلۂ ارباب وفا ہو

"رنگ نا" میں اس طرح کے بہت سے اشعار قاری کو اپنی جانب متوجہ کر رہے

ہیں اور اس نوجوان شاعرہ سے بہت سی توقعات وابستہ ہو رہی ہیں۔ آپ بھی اگر "رنگ نا" کی بابت پرشوق ہیں تو اولین فرصت میں انجمن نوائے حق 571 چھتہ قل گنج، کانپور معطر شعر و ادب 13 انچ بلاک پریم نگر جوگیشوری ایسٹ ممبئی 40 ۔ ایوان ادب پبلشرز 3028 گلی قصاری ترکمان گیٹ دہلی 6 سے اپنی سہولت کے مطابق رابطہ کیجئے جہاں "رنگ نا" صرف ایک سو پچاس روپیہ میں اپنے چاہنے والوں کی منتظر ہے۔

✱ اخبار اردو

اردو ادب کی کساد بازاری کے دور میں بھی "مقتدرہ قومی زبان" کا مجلہ "اخبار اردو" صاحب علم اور صاحب ذوق اہل قلم کے لئے ترویج ادب کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔ یوں تو "اخبار اردو" کا ہر شمارہ اردو جیسے اہم موضوع کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ چار سو چوالیس صفحے کی اس خاص اشاعت میں علم و ادب، سیاست، صحافت اور معاشرت کے تمام گوشوں کی نمائندگی کے حامل مقالات، معلومات اور تجزیے قاری کے لئے بہت ہی معتبر اور مستند ذخیرہ علم فراہم کر رہے ہیں۔ پروفیسر فتح محمد ملک کے کنانہ مقالہ "پنجاب کی مادری زبان اردو ہے" کے جلو میں حافظ محمود شیرانی، عین الحق فرید کوٹی، ڈاکٹر مہر عبدالحق، محمد اکرام چغتائی، صوفی غلام مصطفی تبسم، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر عبدالمجید سندھی، ڈاکٹر طاہر تونسوی، پروفیسر ڈاکٹر رویندر ترین، مخدوم الطاف حسین، حمید اللہ ہاشمی، ابا زند تنزیل، جمیل ہاشمی، نثار احمد ترابی، ڈاکٹر سعد اللہ کلیم، مرزا عبدالقادر، ڈاکٹر انوار احمد، شاہد احمد دہلوی، ڈاکٹر گوہر نوشاہی، محمد اسلم ضیا، سید مصطفی علی بریلوی، ڈاکٹر صفیہ بانو، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر ممتاز منگلوری، مولانا ناجور نجیب آبادی، شہرت بخاری، ڈاکٹر آفتاب احمد، احسن کاکوروی، عباس چغتائی، محمد اشرف کمال، رشید احمد سالم، محمد حسین بخشی، مجیب عالم، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، شیخ عبدالقادر، مولانا محمد حسین آزاد، ڈاکٹر سید عبداللہ، محمد حنیف شاہد، سلیم اقبال، ڈاکٹر نثار احمد قریشی، ابوالمعانی عصری، ڈاکٹر محمد ارشد اویسی، ڈاکٹر عطش درانی، رضیہ سلطان جان، محمد اکبر سجاد، ڈاکٹر محمود احمد غازی، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، حمید اللہ ہاشمی، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر عارف نوشاہی، ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، اسد فیضی اور ڈاکٹر وحید قریشی آپ ہی بتلایئے علم وفن کی اس قدر روشن کہکشاں کی بابت کوئی بھی مبتدی بھلا کیا کہہ سکتا ہے اور کیونکر کہہ سکتا ہے سوائے آپ کی توجہ مبذول کرانے کے! مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کے اس خاص شمارے کی قیمت صرف ایک صد روپیہ ہے جو کہ منی آرڈر یا بنک ڈرافٹ بنام مقتدرہ قومی زبان کے نام ارسال کر کے دستیاب ہو سکتا ہے۔

✱ اردو ادب (سہ ماہی)

ہمیں دستیاب تو اردو ادب (سہ ماہی) کے دو شمارے ہوئے ہیں۔ خواہش آپ کی توجہ شمارہ 323، جنوری فروری مارچ 2004 کی جانب دلانا ہے جیسا کہ آپ کے علم میں ہے اُردو ادب انجمن ترقی اردو (ہند) کا ادبی ترجمان ہے جس کے صدر پروفیسر جگن ناتھ آزاد و سیکریٹری کے تحت چھپتا اور جنرل سیکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم صاحب ہیں۔ مدیر اس نمائندہ ادبی دستاویز کے جناب اسلم پرویز ہیں۔ پہلا ورق کے عنوان سے مدیر نے جدید سندھی ادب کے تعلق سے شیخ ایاز کی شخصیت و فن پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ اصغر علی انجینئر کے انگریزی مضمون India Shining, Communal Darkness کو جناب اسلم پرویز نے "فرقہ واریت کے ظلمات میں دمکتا ہندوستان" کے عنوان سے منتقل کیا ہے اور قاری کو بہت دیر تک غور و فکر کے دریا میں متلاطم رکھا ہے۔ سلیم اختر صاحب نے مجید امجد کی شاعری پر "روح کی راکھ پر شعلوں کی شکل!" کے عنوان سے عمدہ مضمون باندھا ہے۔ انیس اشفاق صاحب نے "غالب کے شعری اسالیب کا ارتقا" کو بارہ صفحات میں نفاست اور نیابت سے قلم بند کیا ہے۔ جناب نیر مسعود نے "پرانا دفتری نظام" کے عنوان سے نئی طرز کا مضمون سپرد قلم کیا ہے۔ ڈاکٹر شریف حسین قاسمی نے حاجی علی مرزا متخلص بہ متون کے فارسی میں تحریر کئے گئے سفرنامہ کو موضوع قلم بنایا ہے اور خوب بنایا ہے۔ زاہد منیر عامر نے Reconstruction of religious thought in Islam کے عنواناتی مضمون کو علامہ اقبال کے حوالے سے "تشکیل جدید" کی یا پر دلی کے جامے میں تحریر کرتے ہوئے علم و ہنر کے دریا بہائے ہیں۔ حکیم سید ظل الرحمٰن صاحب نے حکیم احسن اللہ خان کی یادوں کو جامعیت کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ میں اور میرا خمیر کے عنوان سے فضیل جعفری صاحب نے خمیر نیازی کا خاکہ تحریر کیا ہے جس کی مدد سے جناب خمیر نیازی کے ساتھ اس دور کے بہت سے بلند قامت اہل قلم سے ملاقات کا وسیلہ فراہم ہوتا ہے اسی طرح مرزا خلیل احمد بیگ نے پروفیسر نثار الدین احمد کے حوالے سے ماضی کو عمدگی سے پکارا ہے۔ جناب گنگاپرساد ولی کے ہندی ترجمہ کو سرور الہدیٰ نے اردو میں ترجمے سے منتقل کیا ہے جو کہ بلغاریہ کا افسانہ ہے کولیو جار جوکی تحریر کا ہندی میں ترجمہ جناب گنگاپرساد ولی نے کیا اور اس کا ترجمہ سرور الہدیٰ نے اردو میں پیش کیا ہے اسی طرح دو سکل یا جانور کا ترجمہ بھی انہیں دو قلمکاروں کے توسط سے شریک اشاعت ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ایمرا ایکی کو کو بھی انہیں دونوں نے پہلے ہندی پھر اردو میں منتقل کیا ہے۔ یہ دونوں کو یوکوف بھی انہیں کی کاوش سے شریک محفل ہیں۔ یاد رہے ادب دوستوں کو پڑھنے کا موقع میسر آیا ہے اس کے علاوہ بہت سی تازہ تصانیف پر تبصرے بھی شامل اشاعت ہیں۔ صفحات 216 اور قیمت فی شمارہ -/30 روپیہ ہے۔ دستیابی انجمن ترقی اردو (ہند) 212 راؤز ایونیو نئی دہلی 110002 کی وساطت سے ممکن ہے۔

رس رابطے

مجوزہ ترتیب و تدوین

اعجاز کھوکھر

جناب گلزار جاوید صاحب، آداب

آپ کے بھجوائے ہوئے "چہارسُو" کے دونوں پیکٹ موصول ہو گئے۔ نمبر بہت عمدہ شائع ہوا ہے۔ کاش کچھ تصویریں بھی آپ شامل کرتے۔ بہرحال یہاں سب لوگوں نے بے حد پسند کیا ہے۔ جناب آپ نے لکھے تھے ان سب کو دفتر دفتر بھیجا جا رہا ہے۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔ ایک بار پھر تہہ دل سے شکریہ۔ یہاں کے لیے کوئی خدمت ہو تو بلا تکلف لکھیے۔

(گوپی چند نارنگ)

عزیز گرامی گلزار جاوید۔ رحمتیں ہوں برکتیں۔ بہت ساری دعائیں

آج عجب اتفاق ہوا۔ چہارسُو آیا۔ اس کا پیرہن اتنا نازک تھا کہ صرف میرے نام کے ایک حصے کی وجہ سے ڈاک والوں کو کچھ آیا کہ یہ میرا ہی نام ہے۔ اسی وقت میری بیٹی جو ایک ہائی سکول میں ہیڈ مسٹریس ہے لکھنے کے لیے پیڈ لائی۔ اگر یہ نہ ہوتا تو میں آپ کو خط نہ لکھ سکتا۔ میرا ایک داماد خوبصورت سا Ball Point دے گیا۔ یہ سب خدائی انتظام ہے ورنہ میں سوچتا ہی رہتا کہ یہ تمام اسباب کہاں سے فراہم کروں۔ آپ نے نذر طاہر اعزاز کا انداز بدل دیا ہے۔ مجھے یہ چہارسُو تصویر سے خوشنمائی کا احساس ہوتا ہے۔ تحریر سے علمیت کا اظہار ہوتا ہے۔ گوپی چند نارنگ اس لحاظ سے خوش نصیب رہے۔

میں عرصے سے کچھ بھی نہیں لکھ سکا۔ دعا کریں کہ تخلیق کا چشمہ جاری ہو جائے اور چہارسُو کے ساتھ پرانا رابطہ استوار ہو جائے۔ دراصل میری کئی problems ہیں۔ میں ان کو حل بھی نہیں کر سکتا اور بھول بھی نہیں سکتا۔ تم نیا دعا گل ہو لکھتے بھی ہو۔ رسالے کے لئے مواد بھی اکٹھا کرتے ہو اور اللہ کے فضل سے اپنے لئے اچھے ادیبوں میں جگہ پالی ہے۔ مبارک ہو۔

(غلام جیلانی اصغر)

برادرم عزیز گلزار جاوید!

تازہ "چہارسُو" موصول ہوا۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا گوشہ انفرادیت لئے ہوئے ہے۔ سرورق ہی نہیں بلکہ گوشہ بھی "گوشۂ بے تصویر" ہے۔ اس دور میں اہلِ نظر کے لئے یہ ایک روایت پوشیدہ ہے کہ تخلیق کار یا نقاد کی اصل تصویر اس کی تحریر ہوتی ہے۔

"براہِ راست" کے ذریعے نارنگ صاحب کی طرزِ فکر اور نظریۂ تنقید سے مزید آگاہی ہوئی۔ جوابات میں شامل بعض جملے اور پیرا گراف تنقیدی ادب میں حوالے کے طور پر استعمال کیے جانے کے لائق ہیں مثلاً:

"اچھی تنقید تخلیقی احساس کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی طرح جو تخلیق وجود میں آتی ہے کسی نہ کسی تنقیدی تصور کے تحت ہے۔"

..... "زبان کا مذہب نہیں ہوتا، زبان کا سماج ہوتا ہے۔ جو لوگ زبانوں کو ایک مذہب تک محدود کرتے ہیں وہ زبان کے ساتھ ناانصافی کرتے ہیں۔"......

"زمین کا بٹوارہ تو ہو سکتا ہے لیکن زبان کا بٹوارہ ایک ایسی منطق ہے جو میری سمجھ میں نہیں آتی۔".....

"ادب ایک طویل ریاضت ہے۔ یہ تنہائی کا ثمر ہے۔".... "آج کل کا نا ہوسے دوڑی کا رواج ہے۔ ادبی قبولیت اور فلم کی قبولیت میں فرق ہے۔ جو چیز جتنی جلدی مشہور ہوتی ہے وہ چیز اتنی جلدی فراموش بھی ہو جاتی ہے۔ سچے ادب کا رشتہ دوامیت سے ہے۔ فوری نتائج برسوں میں ہوتے ہیں ادب برسوں نہیں!".... "ہجرت سے کمرشل ہوتے ہوئے سماجوں میں سرکاریں بھی اور لوگ بھی زبان کی اہمیت کو بھول گئے ہیں۔ حالانکہ زبان تہذیب کی کلید ہے۔ زبان نہیں ہے تو آپ کا چہرہ نہیں ہے اور چہرہ نہیں ہے تو تہذیب نہیں ہے۔".....

ویسے تو سبھی مضامین لائق مطالعہ ہیں لیکن منشی تبسم کے مضمون "گوپی چند نارنگ کی اسلوبیاتی تنقید" میں شامل مفصل اور مدلل تجزیے نارنگ کے ادبی نظریے اور تنقیدی رویوں کو سمجھنے میں کلیدی حیثیت کے حامل ہیں۔

حصہ نظم میں ایک حمد، دو نعتیں اور خاصی تعداد میں غزلیں اور نظمیں شامل ہیں۔ نذیر کجاہی کی نعت کے ایک مصرعے میں "بھی" زائد کمپوز ہو گیا ہے:

میں "بھی" اسی با صفا کا شیدا ہوں

ان کا ایک اور شعر ہے:

میں بھی روپ بہاول کے صدقے
اک سوہن کا اک ہیرلی ہوں

دوسرا مصرعہ ان کی کمزوری کی وجہ سے "حشو و زوائد" کا شکار ہو گیا ہے۔ شاید وہ

اس سوہن کا اک ہیرلی ہوں

کہنا چاہتے تھے۔ نابغ خانزادہ کی غزل سہل ممتنع کی عمدہ مثال ہے۔ قافیوں کا انتخاب لائق ستائش ہے۔ ایک قافیہ "آلنا" بڑی مدت بعد پڑھنے کو ملا (آلنا بمعنی گھونسلا، آشیانہ)۔

شگفتہ نازلی کا مطلع محل نظر ہے:

سماج کو جو رہے ڈر تو چاہتیں کیسی
اس اک ضمیر کے سوا کیا شباہتیں کیسی

دوسرا مصرعہ بحر سے خارج ہے اس لئے کہ ضمیر کا وزن فعول کے برابر ہے نہ کہ فعولن کے برابر۔ موجودہ صورت میں وزن کے لحاظ سے یہ مصرعہ اس طرح پڑھا جائے گا:

اس اک شجی کے سوا کیا شباہتیں کیسی

انہوں نے اس غزل کے ایک مصرعے میں "جھوٹ و سچ" کی ترکیب استعمال کی ہے جب کہ ہندی یا اردو الفاظ کے درمیان میں و عطف کا استعمال جائز نہیں ہے۔ نوید سروش نئی نسل کے معروف شاعر ہیں۔ ان کا مقطع بھی عیب تنافر کی زد میں آ گیا ہے۔ انہوں نے مقطع میں لفظ "موضوع" کو صحیح تلفظ کے ساتھ نہیں باندھا ہے۔

موضوع شاعری بنا کے سروش
اس کا رنگیں شباب لکھتا ہوں

وزن میں صرف موضوع آ رہا ہے۔ امید ہے وہ نظر ثانی کر لیں گے۔ نسیم سحر نے بھی اپنے ایک مصرعے میں عزّ و جاہت کی ترکیب استعمال کی ہے جو کہ غلط ہے۔ وہ آسانی سے عزّ و الفت کہہ سکتے تھے۔

حصہ غزل کے چند منتخب اشعار

ناجش دہلوی — شہرت کے لئے بھی آپ ہیں رکھتے نہیں لحاظ
شعر سے بیچنے یہ روش عام بہت ہے

قیصر نجفی — کسی مشکل میں پڑنا چاہتا ہوں
میں لب کے بیچ پہ اُٹنا چاہتا ہوں

انور فیروز — نہ جانے کیسا ہے آسیب اپنے گلشن میں
کہ اب کی بار کسی پیڑ پر ثمر نہیں آیا

نسیم سحر — یہ کس نے جھیل سی آنکھوں سے دیکھا میری آنکھوں میں
مجھے اک آن میں گہرا سمندر کر دیا کس نے

انجم جاوید — حیرکاروں کی صف میں شامل ہوں
اگرچہ پیروں میں بیڑیاں بھی ہیں

بزم آرا ہزدی — بس ایک موج بہا لے گئی وہ خواب محل
جو گیلی ریت پہ بچوں نے تھے بنائے ہوئے

شہاب صفدر — جانے کس لہر میں تُو بہتا ہے چلا جاتا ہے
منزلیں تیری ہی رہ تکتی ہیں بھی تو ہوں

نوید سروش — دیکھ کر مسکرائے بچوں کو
میں شگفتہ گلاب لکھتا ہوں

آپ کے فسانے نے منٹو کے اسلوب اور کلائمکس تک پہنچانے کی تکنیک کی یاد تازہ کر دی۔ کرداروں کی زبان پر آپ کی مکمل گرفت حیران کن ہے۔ شیخ خالد کا "نگوں کی عورت" تمہارے پُر تاثر فسانہ ہے۔ پلاٹ کے لحاظ سے عورت لئے ہوئے ہے۔ میرے خیال میں اس فسانے کا نام "محبت کی قیمت" ہونا چاہئے تھا۔ "دل دا بیلی" میں بھی خلاف حقائق معاملہ ہیں۔ راجہ ہیں اور جگن ناتھ آزاد نے اپنے خط میں حضرت ملوک چند محروم کے مجموعے "گنج معانی" کو جو مصرعے نام تھا آپ کے ذریعے بھیجے کا لکھا ہے سو میں منتظر ہوں۔ (محسن بھوپالی)

محترمی! آداب!

"چہار سُو" کے تازہ شمارے میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب کا انٹرویو خاصے کی چیز ہے۔ کئی ادبی سیاسی مذہبی اور اردو زبان کے اعتبار سے حقائق سامنے آئے۔ قدرت نارنگ صاحب پر سدا سے مہربان رہی ہے۔ اس وقت ہندو پاک کے اُردو جگت میں ایسا باخبر باشعور نقاد اور شعلہ بیان مقرر موجود نہیں ہے۔ مطلع دُور دُور تک صاف ہے۔ محترم محمود ہاشمی نے اُن کی کتاب "ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات" کے تناظر میں صحیح لکھا ہے کہ وہ تخلیقی تنقیدی تجزیاتی اور Dynamic ذہن کے مالک ہیں۔ میری نظر میں وہ نبض شناس بھی ہیں اور دُنیا کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات اور رجحانات پر نظر رکھتے ہیں۔ لیکن میں اُن سے مابعد جدیدیت کے سلسلے میں اتفاق رائے نہیں ہوں۔ ادب تو جیون کا بہتا دریا ہے۔ کسی بھی دور میں ادب کسی مخصوص تحریک اور خیال پرستی کے تحت اپنی گہری چھاپ چھوڑ نہیں پایا۔ اس کا تعلق تو براہ راست عوام سیاست مذہب معاشیات سماجیات ثقافت انسانی فطرت جبلتیں یعنی مجموعی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور اقدار سے رہا ہے۔ آدمی ہر عہد میں بدلا ہے اور بدلتا رہے گا۔ یہ جدلیاتی ٹکراؤ کا عمل ہے۔ جہاں تک نارنگ صاحب کی عظمت ذہانت ادبی معلومات اور تخلیقی قوت کا سوال ہے تو اُن کو بار بار فرشی سلام۔

"بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا"

(جتیندر بلّو)

جناب گلزار جاوید صاحب! تسلیم۔

بہت ممنون ہوں کہ آپ نے یاد کیا۔ "چہار سُو" جیسا خوبصورت رسالہ بھی۔ وہ بھی محب مکرم پروفیسر گوپی چند نارنگ کے توسط سے۔ اور انہوں نے کل ہی یہ سوغات مجھ تک پہنچوائی۔ سب سے پہلے تو مبارکباد کہ آپ نے "گوشۂ اعزاز" کے لئے ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا جو آج دنیائے اردو میں انتخاب ہے.... جس کی عمیق نظر سے قدیم و جدید کے تمام گہرہائے تفہیم کی گتھیاں سے ہم کنار ہوئے ہیں۔ جس نے یہ ثابت کیا ہے کہ زندگی آگے... اور آگے.... اور آگے بڑھنے کا نام ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میں بھی نارنگ صاحب کے قریبی دوستوں میں سے ہوں اور ان کی قدم بقدم ترقی اور لمحہ لمحہ عروج کا شاہد۔ آپ نے چہار سُو میں یہ گوشہ شائع کر کے دنیائے اردو کی ایک آرزو کو پورا کیا ہے اور بھی اچھا ہوتا اگر پورا شمارہ نارنگ صاحب کے نام ہوتا۔ کیونکہ چند صفحات نارنگ صاحب کے اکتسابات کا احاطہ نہیں کر پاتے۔

آزاد صاحب کا مضمون پڑھا۔ یہ تاثر ملا ہے کہ یہ اپنی طرح کا الگ مضمون ہے۔ کچھ شاعروں کی یادیں اور ملاقاتیں.... مگر آزاد اور محروم کی ملاقاتیں محترم ہیں۔

"ان کی ہے بات بات میں اک بات"۔۔۔۔ دراصل مجروح کی شاعری کا مقام و مرتبہ کچھ دیر بعد طے ہوگا جب اُن کی وفات کے غم کے بادل چھٹ جائیں گے۔ مجروح نے بہت کم کہا ہے اور نظموں سے وابستگی ان کی قوت بھی ہے اور کمزوری بھی۔ کمزوری انھیں حصوں میں جس طرح آزاد کے مضمون میں کنور مہندر سنگھ بیدی کے تعارفی جملوں کے متعلق مجروح کا ردِ عمل ہو۔ بات سچ ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر مجروح کے کلام کے ساتھ فلمی شہرت نہ ہوتی تو ان کی چالیس پچاس سال پرانی کہی کی چند غزلوں کو کون اس طرح یاد رکھتا جس طرح آج مجروح کا شہرہ ہے۔

عوامی ذہن نے تو مجاز جیسے شاعر کو طاقِ نسیاں کر دیا پھر مجروح کس گنتی میں ہوتے۔ اگر فلمی شہرت کا تاج ان کے سر پر نہ ہوتا ۔۔۔ مجاز تو مدت ہوئی اس دنیا سے اٹھ گئے مگر جذبی تو ابھی زندہ ہیں۔۔۔۔ مجروح سے کہیں بلند مرتبہ شاعر ۔۔۔ مگر اب تو احباب کے سوا کوئی جذبی کا نام بھی نہیں لیتا۔

(رفعت سروش)

پیارے حیدر قریشی! آداب و نیاز!

اس سے پہلے کہ آپ کے نھنے سے پیارے پیارے خط کی سیاہی خشک ہو اور میں کسی اور کام پر نکل پڑوں میرے لیے یہی مناسب نظر آتا ہے کہ میں سب سے پہلے آپ کو سلام عرض کرتا چلوں۔ ارے بھائی! آپ اتنا خوبصورت اور پیارا پیار لکھتے ہیں کہ میں شرمندہ ہو جاتا ہوں۔ آپ کو شاید یہ علم نہیں کہ میں ادب کا بہت ہی معمولی طالب علم ہوں۔ اتنا احسان مجھ پر مت کیا کریں۔ آپ کی چھوٹی سی تحریر وہ کام کر جاتی ہے جو کہ بڑی بڑی تحریریں بھی نہیں کر سکتیں۔

پیارے حیدر قریشی! آپ کا "جدید ادب" اتنا بھرپور اور ضخیم ہوتا ہے کہ اس کے لئے رسمی جملوں سے کام نہیں چل سکتا اور میری عادت رسماً اور سطحی طور پر لکھنا ادبی بددیانتی سے کم نہیں۔ لہٰذا میں اس وقت اس جریدہ کی رسید ہی دے سکتا ہوں۔ آپ کا جریدہ اردو ادب میں ایک تاریخی دستاویز سے کم نہیں ہوتا اور پھر اس سلسلہ میں کچھ لکھنا آسان نہیں۔ لہٰذا میں آپ سے اس سلسلہ میں مہلت کا طلبگار ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ اس پرچے کو مفصل پڑھنے کے بعد کچھ نہ کچھ قلم بند ضرور کروں گا۔ فی الحال آپ سے چند روز کی مہلت ضرور چاہوں گا۔

(سوہن راہی)

محترم حیدر قریشی صاحب! سلام مسنون۔

ڈاکٹر رانگ کے حوالے سے یہ شمارہ اہم ہے۔ آپ کے انٹرویو سے بعض نئی جانکاری ملی ہے۔ مجتبیٰ حسین کی گفتاری کا کیا کہنا۔ "مسخرہ کا متن عمدا اور خالی سنسان ٹرین" اپنی نوعیت کا منفرد مضمون ہے۔

ڈاکٹر قمر رئیس نے اپنے مضمون کو پھیلا کر الجھا دیا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اردو کے اولین افسانہ نگار علی محمود تھے۔ اس سلسلے میں ماہنامہ "سریر" کراچی میں بارہ چودہ سال قبل میں نے اور پروفیسر شفیق احمد نے بحث کے بعد ثابت کر دیا تھا۔ مظہر امام نے "سریر" سے ہی اپنی تحریر کی بنیاد رکھی تھی جس کا حوالہ ڈاکٹر قمر رئیس نے دیا ہے۔ "سریر" کا حوالہ آنا چاہئے تھا۔

"جدید ادب" مجھے اس لئے بھی پسند ہے کہ اس میں آپ گوشہ دیتے ہیں۔ نہ جانے کب کس گوشے سے استفادہ کا موقع نکل آئے۔ عبدالقوی ضیاء صاحب پر جب میں کتاب مرتب کر رہا تھا تب "جدید ادب" سے بھی مدد لیا تھا۔ آپ کا انٹرویو بھی شامل کیا تھا۔ نہ معلوم یہ کتاب آپ تک پہنچی یا نہیں۔

(ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی)

حیدر قریشی صاحب۔۔۔۔ تسلیمات۔

سب سے پہلے تو میں "نئی دنیا" میں شائع شدہ خیال آفاقی کے خط پر آپ کو اور اُن کو مبارکباد پیش کرنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے ایسے افراد کی گرفت کی ہے جو آزادیِ اظہار کے بہانے خرافات سے بھی باز نہیں آتے۔ گوپی چند نارنگ جیسی شخصیات برسوں نہیں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں ان پر قرطاس اعزاز شائع کر کے نہایت مناسب وقت پر آپ نے ایک شاندار خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ اُن پر مشاہیرِ ادب کے تمام مضامین بے حد مفید تو ہیں ہی لیکن "سنتے تو دل عاشق" میں جس طرح مجتبیٰ حسین نے اُن کی دوستی اور اردو دوستی کو نکھارا اور نمایاں کیا وہ اُن ہی کا حصہ ہے پھر ابتدائی دو صفحات پر اُن کی زبان کی شگفتگی نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ بلاشبہ اردو کے واحد مزاح نگار ہیں جن کی تہذیب اور شائستگی کا اردو دنیا میں کوئی بھی مقابلہ نہیں کر سکتا۔

خح خالد نے "نکھی کی عورت" میں عورت کی مظلومیت کی وہ داستان سنائی ہے کہ صرف دل دردمندی نہیں بلکہ جس کی سچائی سے آج کا ترقی یافتہ معاشرہ بھی انکار نہیں کر سکتا اس افسانے کے مرکزی کردار کی کردار نگاری نے مجھے بھی آنسو بہانے پر مجبور کر دیا ہے۔ صاحب اعزاز کے علاوہ جگن ناتھ آزاد نے "کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو" میں ماضی کے ایک ماحول کو اس طرح اجاگر کیا ہے کہ جی چاہتا ہے پھر ایک مرتبہ اُن شب و روز میں سانس لوں۔

حصہ شاعری یوں تو ٹھیک ٹھاک ہے لیکن شگفتہ نازلی کی غزل کے چند عیب کھٹکتے ہیں۔ مثلاً مطلع کا دوسرا مصرعہ جس میں لفظ "عجیبہ" بے وزن "شی" پڑھا جا رہا ہے جو شی کا ہم وزن ہے جب کہ حقیقتاً لفظ "قصیدہ" کا ہم وزن ہے اور "عجیبہ" یہاں اگر صحیح طرح پڑھا جائے تو مصرعہ خارج از بحر ہو جائے گا۔ ٹھیک اسی طرح انہوں نے مطلع میں قافیے "چاہتیں" اور "شناہتیں" استعمال کی ہیں جب کہ باقی دوسرے اشعار میں "کدورتیں" اور "روایتیں" استعمال کی ہیں جو کہ غلط ہیں۔ "چاہتیں" کا قافیہ "کراہتیں" تو ہو سکتا ہے روایتیں نہیں۔

(غالب عرفان)

جناب حیدر قریشی۔

خط لکھنے بیٹھا ہی تھا کہ جناب پروفیسر گوپی چند نارنگ والا "چہار سو" کا شمارہ موصول ہوا۔ ایک نہایت عمدہ اعلیٰ اور بھرپور سعی حاصل جو ہر لحاظ اور ہر طرح سے خوب ہی نہیں خوب تر ہے۔ آپ کی ہمت، لگن اور محنت کی داد دینا پڑتی ہے۔ ادب کی خدمت کیا کوئی آپ سے سیکھے۔ واقعی با ادب با مراد اور بے ادب بے مراد۔ یقیناً آپ اپنی دلی مراد پا کر رہیں گے۔

"چہار سو" میں ہمیشہ کی طرح نظم اور نثر کا حصہ بڑا جاندار اور جامع ہے۔ جہاں اس میں کل کی دید ہے وہاں جزو کی دھڑکن بھی ہے۔ جناب عبدالعزیز خالد، جناب تابش دہلوی اور جناب محسن بھوپالی کی منظومات یعنی رباعیات اور غزلیات خاصے کی چیز ہیں اور یقیناً حاصل مطالعہ ہیں۔ ساگر فوکہا ہونے کے باعث ذرا اوبھی ہے اور چار یار کا یہ جوئے شیر وصل کر رہے گا۔ (دل نواز دل)

پیارے بھائی گلزار، السلام علیکم۔

بوستان چہار سو ہمیشہ کی طرح گلزار رہا۔ ماشاء اللہ منظر بہ منظر ....!

البتہ راقم الحروف سایۂ گل میں تخلیق کی صورت میں نظر نہیں آیا۔ اس کا سبب جاننا چاہتا ہوں تو غالب کا یہ شعر لاجواب کرتا ہے۔

خلش غمزۂ خوں ریز نہ پوچھ

دیکھ خونابہ فشانی میری

سر کھپانے کی فرصت نہیں مگر چہار سو کا قاری اس کے مطالعہ سے روگردانی نہیں کر سکتا.... شمارہ جنوری/فروری 2004 کے براہ راست میں اردو پر سیر حاصل گفتگو، اسلوبیات اقبال اور ہمارے محترم بزرگ شاعر احمد ندیم قاسمی کا چند لمحے نے بے حد لطف عطا کیا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کی قد آور شخصیت اور ان کا فن بلاشبہ ہمارے علم کا ایک اہم باب ہے۔ ان کے گہرے مطالعہ نے اقبال کی شاعری کا جس طرح جائزہ کیا اس قدر دبستان شعر و ادب میں تہلکہ بھی مچایا ہے۔

تقریباً ۲۲ سال قبل مجھے بھی پروفیسر صاحب کو ختم کل سنٹر اسلام آباد میں سننے کا شرف حاصل ہے۔ ناصر کاظمی، شہریار اور سلطان اختر جیسے شعرا بھی اکثر ان کی گفتگو کا موضوع رہے ہیں مگر انہوں نے جس عقیدت و احترام سے اقبال کی ذرا سی شاعری کے حوالے وا کر دیے ہیں کسی نے نہیں کیے۔ گوپی چند کی ناقدانہ اور بسوط ذہنی فصاحت کی نظر نے آسمان ادب پر کہکشاں ٹانک دیے ہیں۔ کوئی بات پس منظر میں نہیں سب کے سب بے خوف و خطر پیش منظر ہیں۔ یہی تو اچھا پن ہے جس سے میر اور غالب کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔

میں ان رابطے چاؤ سے پڑھتا ہوں۔ باقر نقوی (امریکہ) کا شکریہ کہ انہیں میرے کچھ شعر پسند آئے۔ خیال آفاقی کا مکتوب سو فیصد اچھا لگا۔ شمارہ کا ہر ورق داد کا طالب ہے۔ افسانوں میں انتظار مداری ناگ نے متاثر کیا۔ سخن نا زہ نے تازگی بخشی بالخصوص اکبر حمیدی اور قیصر تمکین کی غزلیں اچھی ہیں۔

قلب جسم میں تنویر پھول کی نعت فرحت بخش ہے۔ نظم عصر میں علی آذر اور کرامت بخاری کی نظمیں تحسین ہیں۔ زور قلم اور زیادہ۔ (اسلم راہی)

برادرم گلزار جاوید صاحب! سلام مسنون۔

آپ نے انتظار حسین صاحب سے متعلق جو شمارہ شائع کیا ہے وہ ادب کے طالب علموں کے لئے ایک ریفرنس کی حیثیت رکھتا ہے۔ انتظار حسین صاحب ہماری ادبی تاریخ میں فسانے کے حوالے سے ایک اہم شخصیت ہیں۔ انتظار حسین پر ڈاکٹریٹ کرنے والوں کے لئے بھی چہار سو کے اس شمارے کو نظر انداز کرنا بہت مشکل ہوگا۔ مختصر یہ کہ چہار سو کا یہ شمارہ انتظار حسین کی شخصیت و فن کو سمجھنے میں بہت معاون ہو سکتا ہے اور آپ کی یہ کاوش نہایت ہی مستحسن ہے اور آپ اس کے لئے مبارکباد کے مستحق۔

اسی طرح جنوری/فروری 2004 کا شمارہ قرطاس اعزاز پروفیسر گوپی چند نارنگ کے نام بھی آپ کی سچی لگن اور پر خلوص جذبے کا آئینہ دار ہے۔ موسیٰ رضا صاحب نے بہشت ادب کے ذریعے ہمیں گوپی چند نارنگ سے متعلق مکمل تفصیل سے آگاہ کیا اور ان کا مکمل کام upto date اور ان پر جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان سے احباب ادب کو آگاہ کیا جس سے نارنگ صاحب کی ادبی شخصیت کا مکمل اندازہ اور احاطہ کیا جا سکتا ہے۔ واقعی گوپی چند نارنگ ہمارے عصر کی ایک ایسی شخصیت ہیں اور براہ راست جو آپ کا گوپی چند نارنگ سے مکالمہ نہایت دلچسپ اور خاصے کی چیز ہے۔ نارنگ صاحب کے دونوں مضامین اسلوبیات اقبال اور منٹو کا متن۔ جتنا اور خیالی سنسان تر ہیں قاری کو اقبال اور منٹو کو سمجھنے کا ایک نیا زاویہ عطا کرتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین، محمد ایوب واقف، محمود ہاشمی اور مفتی تبسم کے مضامین اپنی اپنی جگہ نہایت معیاری ہیں..... چہار سو نے قرطاس اعزاز کے حوالے سے زندہ ادبی شخصیتوں پر جس انداز میں شمارے شائع کرنے کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے وہ قابل تعریف و ستائش ہے۔ اس طرح ادب کی شاہراہ پر چلنے والے چراغوں کی روشنی چہار سو پھیل رہی ہے۔ خدا عظیم آپ کو استقامت عطا فرمائے۔ آمین۔ (سلطان صبروانی)

گلزار جاوید صاحب، مکرم!

السلام و علیکم۔ امید ہے آپ خیر و عافیت سے ہوں گے۔ تازہ "چہار سو" کی ترسیل کے لیے آپ کا بے حد شکرگزار ہوں۔ گوپی چند نارنگ صاحب پر گوشہ آپ کی ادیبوں سے محبت کا بھرپور اظہار ہے۔ نارنگ صاحب عہد حاضر کے قد آور ایک اہم نقاد اور محقق ہیں جنہوں نے ادب کے طالب علموں کی بڑے سلیقے سے راہنمائی کا فریضہ ادا کیا ہے۔ (سجاد مرزا)

مدیر محترم، تسلیم و آداب!

ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی آپ کی تگ و انتخاب اس عہد نا پرسان و

دو با مہرباں میں، جس عہد ساز و عہد آفریں شخصیت پر پڑی وہ اپنے تخلیقی جوہر و
تحقیقی تجسس کے باوصف نہایت کمیاب بلکہ نایاب ہیں اور اُن کی انسان دوستی و
وضعداری اس درجۂ کمال پر پہنچی ہوئی محسوس ہوتی ہے کہ بے ساختہ یہ مصرعۂ غالب
یوں کہیے ہو ــ سکے وہ دوست جن کے دشمن اُن کا آسماں کیوں ہو...!

'کتبِ ادب' سے ذہنی بالیدگی و شائستگی لے کر احساسِ تفاخر و
ترفع سے آگے بڑھے تو... 'رُوبرواست' کے توسط سے عکسوں کے نشاں پائے
اور زندگی کے سفر کے تہذیبی، تخلیقی و تحقیقی پڑاؤ ذہن کو اُجالتے اور غالب و اقبال
کے حوالے دانش کو مزید روشنی سے ہمکنار کرتے گئے۔

محترم قاضی صاحب کا تاثر مختصر ہونے کے باوجود ڈاکٹر نارنگ
صاحب کے تخلیقی و تحقیقی کے ضمن میں متوازن و معتدل رجحانات و میلانات کو
جامعیت سے محسوس کراتا ہے۔

جناب مجتبیٰ حسین نے بہت خوبصورت پیرائے اور شگفتہ اسلوب
میں پروفیسر صاحب کا تذکرہ کیا اُن کی شخصیت اور دیگر معمولات کو مختلف جہتوں
سے روشناس کراتے کیا اُن سے قربت کا حق بطریقِ احسن ادا کیا اسی طرح
'علوم و فنون کا تجزیہ' بھی اُن کے بہت گہرے مطالعے و مشاہدے کی نہایت مخلصانہ
غمازی ہے جس سے پروفیسر صاحب کی ہمہ جہت زندگی کے متنوع پہلو اور
گوناگوں گوشے مترشح ہوتے ہیں۔ آخر میں محترم جعفری صاحب کا مکتوب
بلاشبہ اُن کے مدلّل و منطقی اسلوب کا معترف بھی ہے اور مداح بھی۔

مثنوی کی فنی تفہیم کے لئے پروفیسر صاحب نے ایسے فکری دریچے وا
کئے اور ایسے شعوری زاویے روشن کئے ہیں جن تک بالعموم ادبی ناقد و قاری توجہ
مرکوز کر ہی نہیں پاتا یا انہیں اُن پہلوؤں سے درخورِ اعتنا سمجھا ہی نہیں جاتا اُن
کے یہاں لفظیات کے مفاہیم اور مفاہیم کی پرتیں جوں جوں کھلتی جاتی ہیں ذہن
جداگانہ جہتوں سے آشنا اور مختلف فکری زاویوں سے روشناس ہوتا جاتا ہے
علاوہ ازیں کسی بھی تخلیق کے متن کی گہرائی میں اُتر جانا تنقید سے اخلاص کی انتہائی
صورت ہے اس ضمن میں یہ خوبصورت پہلو بھی دیکھنے میں آیا کہ وہ قاری سے تحریر
ہو یا تقریر، بہت مخلصانہ رابطہ استوار کئے رہتے ہیں اور اسے اہم بھی گردانتے
ہیں۔

اس مرتبہ "چہارسُو" کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ قرطاسِ اعزاز پر
تصویر کی جگہ تحریر جگمگا رہی ہے اور حرف حرف نے ایسی جوت جگائی ہے کہ تصویر
پس منظر میں جا پڑی ہے کیونکہ ہر حرف سے تصویر از خود جھانکنے لگی ہے۔ فن کے
سمندر کی گہرائیوں میں جتنا اُترتے چلے جایئے تحریر تصویر کا روپ دھارتی ہے
اور حروف مصور ہونے لگتے ہیں۔ ڈاکٹر نارنگ صاحب کی اُردو زبان و ادب سے
ایسی بے پناہ شیفتگی و وابستگی نیز دوستی و وضعداری ایسی اقدار مشترک ہیں جو ڈاکٹر
کیول دھیر صاحب کے قرطاسِ اعزاز کی یاد دلاتی ہیں اور ہم ان کے بھی اس کے
لئے بے حد ممنونِ احسان ہیں۔

ساحر صاحب کی مسلسل بے اعتنائی اور طرزِ تغافل روا رکھنے کے
باوجود بیچارے 'پیشتر' کا عرضِ تمنا کرتے ہی رہنا دراصل تربیت اور وضعداری مراسم
کے احیا کی خواہش کا بہت مؤثر اظہار ہے۔ 'اِچھا دھاری ناگ' کا مطالعہ ہولناک
آخر بڑی دلچسپی سے کیا نفسیاتی نکتۂ نظر سے ایسے موضوعات سے خوف و ہراس
کے باوجود اسرار کی کشش لپٹی رہتی ہے علامتی طور پر کوئی بھی کردار تشکیل دیا
جائے ناگ کی سرشت کے بارے میں سنتے آئے ہیں کہ اپنے محسن کو بھی ڈسنے
سے باز نہیں آتا تاہم لسانی اعتبار سے مختلف و الگ لب و لہجے کے مکالمے
کرداروں کی کیفیات و تاثرات کے ابلاغ میں بہت چابکدستی و ہنروری سے
معاون رہے۔

آئینۂ فن میں 'ہم عشق کر رہے تھا' کے بعد دیگرے خوشگوار حیرتوں سے
دوچار کرتا چلا جاتا ہے جب کہ 'میرا جادو بول رہا ہے' منظرِ عام پر آنے والے
شعری مجموعے کے اوصاف سے شناسا کرتا ہے اور 'تقریبِ مجموعہ' کو محترمہ عابدہ
تقی نے بہت خوبی سے تمام تر حسنِ اسلوب و جمال تحولات کے ساتھ پیش کیا۔
'بساطِ نشاط' نے بھی شاداب کیا۔

'قرطاسِ اعزاز' کی اس کامیاب پیشکش پر بہت سی مبارکباد۔
(شگفتہ نازلی)

محترم گلزار جاوید۔ السلام علیکم!

تازہ پرچے میں آپ نے ڈاکٹر پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب کو
"قرطاسِ اعزاز" پیش کیا بلاشبہ وہ اس سے کہیں زیادہ کے حق دار ہیں۔ سرورق
پر ہم ڈاکٹر صاحب کی تصویر سے محروم رہے مگر آپ نے اُن کی زبردست تحریر سے
اس کمی کو پورا کیا۔ آپ نے درست لکھا ہے کہ "ایک اور لوگ گھر میں مر گیا جس نقل
جس انداز میں خوب کیا نا خوب کیا" تو صاحب آپ نے خوب نہیں بہت خوب
کیا ہے۔ 'رُوبرواست' میں آپ کے شگفتہ اور تیکھے سوالات سے میں ہمیشہ محظوظ
ہوتا ہوں اس انٹرویو سے ہندوستان میں اردو کے حال و مستقبل کے حوالے سے
مفید معلومات ملیں۔ پچھلے دنوں کراچی کی ایک نجی ادبی نشست میں پروفیسر سحر
انصاری صاحب سے "چہارسُو" اور خصوصاً 'رُوبرواست' کے متعلق گفتگو ہوئی وہ
بھی تعریف کر رہے تھے۔ پچھلے شمارے میں انتظار حسین صاحب کے انٹرویو کا
ذکر بھی ہوا میں کیا لکھوں "چہارسُو" میں شائع مکتوبات میں احباب نے بہت
کچھ لکھ دیا ہے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی تحریریں "اسلوبیاتِ اقبال" اور "مثنوی کا
متن" میں اُن کا مطالعہ اور ادب سے گہری اور مستقل وابستگی کی غمازی کرتی
ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی کتاب "ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات"
جدید اردو تنقید کی اول کتاب میں محمود ہاشمی صاحب نے سچ لکھا ہے کہ یہ کتاب

ادبی افق میں "ماہنامہ جدید ادب" کی حیثیت رکھتی ہے۔ محمد ایوب واقف اور مشتاق تبسم کے مضامین بھی مفید ہیں۔ تجلّی حسین صاحب کا مضمون "سنتے تو دل پاش چلے تو زمانہ ہے" نہایت شگفتہ اور دلچسپ ہے۔ مضمون میں نارنگ صاحب کی شخصیت کی باریکیوں کو بڑے دھیمے لہجے میں کمال سے بیان کیا ہے۔ میں جوگندر پال کے افسانوں کا پرانا قاری ہوں اُن کے افسانے پڑھ کر ہمیشہ خوشی محسوس کرتا ہوں اُن کا "بادشاہ" کا انداز ذرا مختلف ہے۔ ستیہ پال آنند کا افسانہ "بیچاری پیٹر" خودنوشت کا ایک حصہ لگتا ہے اس تحریر میں صرف ایک چیز اسے افسانے کے قریب لاتی ہے کہ "پیٹر" جب تمام خطوط دکھا کر اپنے دوست کو حیران کر دیتا ہے کہ میں نے شکوے شکایت والے خطوط پوسٹ ہی نہیں کیے تھے۔ شیخ خالد کا افسانہ "گنگی کی موت" ایک عام سا سطحی افسانہ ہے مگر افسانے کی بنت اور اسلوب بیان نے افسانے کو خوبصورت بنا دیا ہے۔ "اچھا دھاری ناگ" "گلزار جاوید صاحب آپ کے مشاہدے کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی۔ آپ نے کہانی کے ماحول اور کرداروں کے حوالے سے جو زبان و بیان اختیار کیا ہے وہ اب افسانوں میں کم دیکھنے میں آتا ہے۔ آپ جس فن کاری سے معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں کو موضوع بنا کر نشتر چلاتے ہیں وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ "نشانِ راہ" میں مجروح سلطان پوری صاحب مرحوم پر جگن ناتھ آزاد کی یادوں "محبتوں اور عقیدتوں سے پُر شگفتہ تحریر" "کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو" میں انہوں نے درست لکھا ہے کہ مجروح صاحب پر جتنا کام ہونا چاہیے تھا نہیں ہوا۔ خدا کرے آئندہ اُن کا یہ گلہ ختم ہو اور مجروح صاحب پر کوئی محقق سنجیدگی سے کام کرے۔ ڈاکٹر قمر رئیس صاحب کا مضمون "اردو کے اولین افسانے" میں تشنگی محسوس ہوئی اُن کی اس بات سے کسی حد تک اتفاق کیا جا سکتا ہے مگر پھر افسانے کی تاریخ و تعریف بھی تبدیل کرنی پڑے گی وہ لکھتے ہیں کہ:

"آج کے دور میں لکھے ہوئے تجریدی اور علامتی افسانوں کو افسانے کا نام دیا جا سکتا ہے تو ایسی مختصر تمثیلی کہانیوں کو بھی مختصر افسانے کا نام دینا غلط نہیں ہوگا جن میں ہم عصر زندگی کے مسائل کو حقیقت پسندانہ اور عقلی نقطۂ نظر سے پیش کیا گیا ہو اور جن میں افسانے کی تکنیک کا شائبہ بھی ہو" ص ۷۸۔

قلبِ بسمل میں غزلیں دل و ذہن کو معطر کر گئیں۔ تنویر پھول نے کیا خوبصورت مطلع کہا ہے

محشر میں مجھے آس ہے کیا عدل ہی سے
لوٹا نہیں مایوس کوئی بابِ نبی سے

نابش دہلوی صاحب کی غزل کا کیا خوبصورت اور فکر انگیز مطلع ہے۔ تخلص بھی استعمال کیا ہے:

نابش غمِ جاناں غمِ ایام بہت ہے - اس کار گہہ جاں میں ابھی کام بہت ہے

محسن بھوپالی، اکبر حمیدی، سید معتبر مہدی، کرامت بخاری، انجم جاوید اور فیصل عظیم کی غزلوں اور قیصر تجلّی، پروفیسر ناصر کجاہی، شہاب صفدر کی نظموں سے نہ صرف لطف اندوز ہوا بلکہ ان تخلیقات میں نئے زاویے اور امکانات کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے۔ عبدالعزیز خالد صاحب کی رباعیات بھی قابل توجہ ہیں۔ "آئینہ فن" میں ڈاکٹر انور سدید صاحب نے انجم جاوید کی کتاب "شہرِ عشق گرتا ہوا" کا تعارف انوکھے اور دلچسپ انداز سے کروایا ہے جو اچھا لگا۔ "تخلیقی عصر" میں عطیہ سکندر علی نے نئی کتب کا تعارف اس انداز سے کروایا ہے کہ ہمارے سامنے کتاب کا موضوع اور کسی حد تک شخصیت کا خاکہ ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔

(نوید سروش)

محترم جناب گلزار جاوید صاحب۔ خلوص

آپ نے جس خوبصورتی سے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا انٹرویو کیا وہ نا صرف دلچسپ ہے بلکہ معتبر بھی ہے۔ ڈاکٹر نارنگ کے حوالے سے تجلّی حسین کی تحریر کا شگفتہ انداز بہت پسند آیا اور جگن ناتھ آزاد صاحب کا مجروح سلطان پوری پر مضمون میں محبت اور عقیدت کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔ آپ کے افسانے کی بیا کی پسند آئی۔ غزلوں اور نظموں کا حصہ بھی آپ کے ذوق انتخاب کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

(اکرام تبسم)

محترم گلزار جاوید صاحب۔ دام اقبال

"چہارسو" ملا ہوا۔ محترم انتظار حسین جیسے لوگ ادب کا بڑا سرمایہ ہیں۔ تقسیم ہند سے پہلے سے جو لوگ لکھ رہے ہیں ان کی تحریروں میں بڑا رچاؤ محسوس ہوتا ہے۔ چونکہ وہاں طبقاتی نظام تھا ایک جیسی تہذیب اور بود و باش رکھنے والے لوگ ایک جگہ رہتے تھے۔ ان کے کھانے، رسم و رواج اور لباس ایک جیسے تھے۔ وہاں کے کسی علاقے کا لکھاری جب کوئی افسانہ لکھتا ہے تو اس میں اس تہذیب کی خوشبو محسوس ہوتی ہے کیونکہ وہ بھی اس علاقے کی تہذیب میں رچا بسا ہوتا ہے۔ انتظار حسین صاحب کا شمار ایسے ہی لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ ان کا انٹرویو پڑھ کر دل کو بڑا دھچکا لگا۔ جوابوں سے گریز کا مطلب ایک تو یہ ہو سکتا ہے کہ وہ ان سوالات کے جوابات دیتے دیتے تھک گئے ہوں اور دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی اچھی شہرت سے تھک گئے ہوں۔ خیر بڑے لوگوں کی بڑی بات۔

"تشکیل" پر آپ متاثر کن تھا۔ اردو میں استادی شاگردی کی روایت بہت دلچسپ مضمون تھا۔ "سوغات" اچھا افسانہ تھا۔ غزل و نظم کا گوشہ گوشہ مسرت ثابت ہوا۔ اسی شمارے میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے مضامین اور اُن سے کیا جانے والا براہِ راست انٹرویو ڈاکٹر صاحب کی شخصیت خوب بلند کر رہے ہیں۔

(بزم آرا بزمی)

محترم جناب گلزار جاوید صاحب۔ السلام علیکم!

آپ کا ارسال کردہ "چہارسو" جناب سرور انبالوی صاحب پہنچا

گئے تھے۔ رسید بھیجنے میں تاخیر ہوئی۔ معذرت خواہ ہوں۔ آج اگر میں 'سننے تو دل عاشق' پہلے تو زمانہ ہے" چہار سُو کے لیے کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ آپ کے تعلقات اور پھر آپ کی ذہانت، فطانت اور ذوقِ انتخاب، وقتِ انتخاب اُردو زبان میں "چہار سُو" کے ذریعے اضافہ کا باعث بن رہے ہیں۔ اور یہ بات کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔ بعد از مطالعہ "چہار سُو" میری معلومات میں اضافہ کا باعث بنا ہے۔

(پروفیسر نذیر گجاہی)

برادرِ عزیز و گرامی گلزار جاوید صاحب۔ سلام و رحمت!

بلاشبہ گوپی چند نارنگ کا "چہار سُو" بھی ایک کوہ گراں تھا، جسے آپ نے بحسن و خوبی سر کر لیا ہے۔ امید واثق ہے کہ آپ کی فتح مندیوں کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے گا۔ ہمیں اس حقیقت کا پورا پورا احساس ہے کہ "چہار سُو" one man show ہے۔ اس کی اشاعت میں درپیش دشواریوں سے بھی ہم آگاہ ہیں اور اپنے سمیت رفیقان چہار سُو کے تغافل کا بھی ادراک رکھتے ہیں، جو بالعموم تغافل کی تلافی مزید تخلیقات برائے اشاعت بھیج کر کرتے ہیں۔

تغافل سے جو باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

"براہ راست" نے لب کو سحر کردیا ہے۔ سبحان اللہ! نارنگ جی نے انٹرویو میں بھی اسی سحر بیانی کا مظاہرہ کیا ہے، جو ان کی تحریر و تقریر دونوں کا عمومی وصف ہے۔ گوپی چند نارنگ ایک جامع الکمالات شخصیت کے مالک ہیں۔ ایک ماہر لسانیات، معتبر نقاد، دقیقہ رس محقق اور تجربہ کار استاد کی حیثیت سے تو انہیں خصوصی شہرت حاصل ہے۔ وہ کئی برس سے ہندوستان میں زبان و ادب اردو ہیں۔ اردو زبان و ادب اور اس کے تاریخی، تہذیبی، ثقافتی، سماجی اور تخلیقی پس منظر سے جس معیار و سطح کی انہیں جانکاری ہے، وہ برصغیر پاک و ہند میں معدودے چند اہل علم کو ہوگی۔ ایک ہندو خانوادے سے تعلق رکھنے اور ایک ہفت زبان قلم کار ہونے کے باوصف اردو زبان کے حوالے سے ان کے واضح، دوٹوک اور غیر متعصبانہ افکار و خیالات انہیں نہ صرف اپنے معاصرین میں ممیز و ممتاز کرتے ہیں بلکہ ایک لائق تقلید مثال بھی بناتے ہیں۔ انہوں نے اپنے انٹرویو میں زبان، ادب، تنقید، تاریخ، سیاست وغیرہ کے حوالے سے جو کچھ بھی کہا ہے، وہ تعصب اور مصلحت کوشی کی کثافتوں سے پاک ہے۔ ان کا ہر کلمہ اور ہر قول "از دل خیزد بر دل ریزد" کی کیفیت پیش کرتا ہے۔ اردو زبان کے تعلق سے ایک عام غلط فہمی کا ازالہ کرتے ہوئے انہوں نے جس صداقت، جذبات اور اخلاص نیت کا مظاہرہ کیا ہے، وہ قابل صد ستائش ہے۔

"زبان کا مذہب نہیں ہوتا۔ زبان کا سماج ہوتا ہے۔ جو لوگ زبانوں کو ایک مذہب تک محدود کرتے ہیں، وہ زبان کے ساتھ ناانصافی کرتے ہیں۔ زبان ایک جمہوری سماجی عمل ہے، جو جس زبان کو بولتا ہے، زبان اس کی ہو جاتی ہے.... اگر کوئی اردو زبان کو مسلمانوں تک محدود کرنا چاہے تو یہ اس کی آزادی ہے لیکن یہ کوتاہ اندیشی بھی ہے۔ جس سے زبان کو نقصان پہنچتا ہے۔ کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ گجراتی یا ملیالم یا کنٹر یا مراٹھی کا مذہب کیا ہے تو اردو پر ہی یہ کرم کیوں؟ آسمان، خوشبو اور ہوا کی طرح زبان بھی سب کے لئے ہوتی ہے۔ زمین کا بٹوارہ ہو سکتا ہے، زبان کا بٹوارہ ایک ایسی منطق ہے، جو میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

گوپی چند نارنگ کا مضمون "اسلوبیاتِ اقبال" اپنی نوعیت کی ایک منفرد اور اچھوتی تحریر ہے۔ بقول نارنگ جی "اسلوبیاتی تنقید میرے جملہ تنقیدی عمل کی فقط ایک سمت ہے"۔ قابلِ غور یہ بات ہے کہ ان کی تنقید کی ایک سمت کا یہ عالم ہے کہ انہوں نے اس کے کینوس کو ارژنگ صفت بنا دیا ہے تو دیگر پہلوؤں کا کیا عالم ہوگا۔ اقبال ایسے فلسفی شاعر کے شعر میں نظریہ اسمیت و فعلیت کی روشنی میں صرفیاتی و نحویاتی نظام کا اسلوبیاتی مطالعہ ہمارے نزدیک ایک ایسا چیلنج ہے، جس سے گوپی چند نارنگ جیسے دانشور ہی اپنے تبحر علمی سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ عصرِ حاضر کے ایک صاحبِ بصیرت فنکار احمد ندیم قاسمی کے تاثرات "چند لمحے گوپی چند نارنگ کے ساتھ" تاریخی اہمیت کے ہیں۔ ایک مستند و معتبر شاعر، ادیب، نقاد اور افسانہ نگار کا نارنگ جی کی ادبیات، لسانیات، سماجیات، ساختیات، اسلوبیات، صوتیات وغیرہ پر عبور کا برملا اعتراف حوالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ مجتبیٰ حسین کا مضمون 'سننے تو دل عاشق' پہلے تو زمانہ ہے" گوپی چند نارنگ کی ہشت پہلو شخصیت کا ایک سحر آفریں جائزہ ہے۔ محبت بلکہ فردوسِ محبت کا ایسا سیدھا سچا اظہار بہت کم دیکھنے سننے اور پڑھنے کو ملتا ہے۔ اعتراف حقیقت کے پردے میں حق دوستی ادا کرنے کا فن کوئی مجتبیٰ حسین سے سیکھے۔ اس مضمون میں انہوں نے طنز و مزاح کی ایک نئی معنویت سے آگاہ کیا ہے۔ محمد یعقوب واقف کا مضمون "علوم و فنون کا ارتقا،" گوپی چند نارنگ کے کم و بیش تمام ادبی کاموں کا ایک مختصر تعارف ہے۔ محمود ہاشمی نے گوپی چند نارنگ کی ایک اور تخلیق "ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات" کا ایک تجزیاتی مطالعہ سپردِ قلم کیا ہے، جو صاحبِ مضمون کی بھی ادب شناسی پر دال ہے۔ مشتاق تبسم کا مضمون "گوپی چند نارنگ کی اسلوبیاتی تنقید" ایک پُر مغز تحریر ہے اور اساسی طور پر نارنگ جی کی تنقیدی دانش کا احاطہ کرتی ہے۔

گوپی چند نارنگ نے اپنے مضمون "منٹو متن اور خالی قرینے" میں نامور افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کی افسانہ نگاری کی فنی پرتیں کھولنے میں تحریر کی بالغ نظری کا مظاہرہ کیا ہے۔ انہوں نے منٹو کے بعض افسانوں کے کرداروں مجبور گری پڑی عورتوں کی تحلیل نفسی اس مہارت سے کی ہے کہ ان کی داخلی و خارجی کیفیات کا تضاد کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ خصوصاً انہوں نے منٹو کی

کہانی ''اچھادھاری ناگ'' منفرد لب و لہجہ کی حامل ہے۔ سرفراز شاہد کی مزاحیہ غزل اور قطعات (چوکے) بھی مزے دے گئے۔ خدا کرے کہ ''چہار سو'' کی خوشبو چار کھونٹ میں تیزی سے پھیلے۔ (ٹی۔این۔راز)

محترم گلزار جاوید صاحب! آداب و خلوص۔

گوپی چند نارنگ پر ایسا عمدہ گوشہ چھاپنے کے لئے میری مبارک باد قبول کیجئے۔ گو نارنگ صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں تاہم اس کاوش سے ان کی کئی گوشوں شخصیت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ یہ ان کی بے مثال لگن اور خلوص کا نتیجہ ہے کہ وہ آج ساہتیہ اکادمی ہند کے پریذیڈنٹ کی پوسٹ پر تعینات ہیں اور ابھی بھی اتنے فعال ہیں کہ آگے اور بھی منازل ان کے قدم چومیں گے۔ احمد ندیم قاسمی، مجتبیٰ حسین، محمد ایوب واقف، محمود ہاشمی اور مغنی تبسم کے مضامین نہ صرف ان کے فکر و فن پر روشنی ڈالتے ہیں بلکہ ان کی ہر شخصیت کے اہم پہلوؤں کو بھی سامنے لاتے ہیں۔ خود نارنگ صاحب کے مضامین 'اسلوبیات اقبال' اور منٹو کا متن' گہرے مشاہدے اور گہرے مطالعے کے عکاس ہیں۔ چنانچہ میں خود منٹو کو بار بار پڑھ چکا ہوں، مجھے یہ احساس ہوا کہ نارنگ صاحب نے منٹو کو ایک الگ زاویے سے پرکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ میرا یہ ماننا ہے کہ بمبئی اردو افسانہ نگاروں کا مدفن رہا ہے۔ بڑے بڑے افسانہ نگار فلمستان (فلمی دنیا) کی ریل پیل دیکھ کر اپنے گاؤں اور قصبوں کو جن میں اصلی ہندوستان بستا ہے چھوڑ کر بمبئی آتے رہے اور نتیجتاً اپنی مٹی سے ہمیشہ کے لئے کٹ گئے۔ بمبئی آکر ان کے قلم میں وہ بات نہیں رہی جو دیہی ماحول کے سبب پہلے کبھی ان میں تھی۔ پریم چند جیسے افسانہ نگار اس ماحول سے تنگ آکر جلدی ہی واپس چلے گئے جب کہ بیشتر ادیب ان ہی بھول بھلیوں میں کھو کر گمنام ہو گئے۔ ان کے قلم کی آبیاری کے لئے بمبئی کا ماحول سازگار نہیں بن سکا اس لئے وہ کوئی شاہکار پیدا نہ کر سکے ماسوا مصنوعی رومانوی فلمی کہانیوں، گھسے پٹے ڈائیلاگز اور کچھ فلمی گیتوں کے۔ منٹو ہی صرف ایک ایسا مرد قلندر تھا جس کو بمبئی کی ہوا راس آئی۔ اسی ماحول نے منٹو کو ایسے کردار دیئے جن کو اس کے قلم نے جاودانی بخش دی۔ نارنگ صاحب نے اسی منٹو کو اپنی تنقید کی کسوٹی پر چڑھا کر نئے رنگ و روپ میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ تاہم میں ابھی بھی یہ سمجھتا ہوں کہ منٹو کی زندگی پر بہت کم کام ہوا ہے۔ ان کی نجی زندگی کے کئی تاریک گوشے ابھی بھی ہم سے چھپے ہوئے ہیں اور شاید ہمیشہ کے لئے چھپے رہیں گے کیونکہ فلمی دنیا کے جتنے بھی لوگ منٹو کو قریب سے جانتے تھے وہ ایک ایک کر کے دنیا سے اٹھ گئے۔

حصہ نظم و نثر دونوں بہت خوب ہیں۔ افسانوں کا انتخاب بھی اچھا ہے۔ میں نے حال ہی میں ڈاکٹر انور ظہیر انصاری کی تصنیف (ریسرچ مقالہ) ساحر لدھیانوی۔ حیات اور کارنامے پڑھی۔ ستیہ پال آنند کا افسانہ 'بیچھی پنجرہ' اس سمت میں مزید دروا کرتا ہے۔ جگن ناتھ آزاد کا مضمون 'کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو'' سوز ترقی پسند شاعر مجروح کی شخصیت کو سمجھنے میں معاون ثابت ہو گا۔ افسانوی ادب پر ڈاکٹر قمر رئیس کے خیالات آخری لفظ کا درجہ رکھتے ہیں۔ جس کا ثبوت انہوں نے اپنے مضمون 'اردو کے اولین افسانے اور ان کے پیش رو' میں دیا ہے۔ سچ پوچھئے تو 'چہار سو' میں آپ نے دریا کو کوزے میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ اس کے مطالعے کے بعد قاری کو کیف آور تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ امید ہے آپ آگے بھی چہار سو کی اسی طرح تہذیب و تدوین کرتے رہیں گے اور ہند و پاک کے ادیبوں اور قارئین کے درمیان ایک پل کا کام کرتے رہیں گے۔ (دیپک بدکی)

مکرمی گلزار جاوید صاحب تسلیم!

''چہار سو'' کا نیا شمارہ بابت جنوری۔ فروری ۲۰۰۲ء دہلی سے موصول ہوا۔ اس عنایت کے لئے بے حد ممنون ہوں۔ اس سے پہلے چہار سو کا نام سنا تھا مگر اس کو دیکھا نہیں تھا۔ اس مرتبہ قرطاس اعزاز کے تحت ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا گوشہ خاص توجہ کا مرکز ہے۔ نارنگ صاحب کی ذات اردو زبان و ادب کے لئے منارہ نور سے کم نہیں۔ کم از کم ہمارے ملک میں گزشتہ پندرہ برسوں کے اندر اردو کی جو گرم بازاری ہوئی ہے اس کا کریڈٹ نارنگ صاحب کے علاوہ اور کسی کو نہیں دیا جا سکتا۔ وہ تقریر و تحریر دونوں کے صدر مملکت (بادشاہ نہیں) ہیں اور یہ بے نظیر کمال مجھے تو کسی اور میں نظر نہیں آیا۔

نارنگ صاحب کی شخصیت کا جیسا بھرپور اور بے مثال خاکہ مجتبیٰ حسین نے کھینچا ہے وہ ان کے تمام خاکوں کے گلدستے میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیا کیا گل انہوں نے پیدا کئے ہیں اور اپنے مشاہدے کی داد کے کیا کیا نمونے دکھائے ہیں، اس کا اندازہ اس خاکے کو پڑھنے ہی سے ہو سکتا ہے۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے اپنے مراسلے میں اردو کمپوزنگ کی موجودہ صورت حال کے بارے بڑی صاف صاف باتیں لکھی ہیں اور میں ان کی صدق صد تائید کرتا ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ نوجوان کمپوزر، کمپوزنگ مشین سے تو واقف ہیں مگر اردو زبان و ادب سے قطعاً نابلد ہوتے ہیں، اس لیے مصنف کی غلطی کو وہ کیا ٹھیک کریں گے، خود اپنی غلطیوں سے مصنف کا بھرکس نکال دیتے ہیں۔ پبلشروں کے پاس پروف ریڈنگ کا عموماً کوئی بندوبست نہیں ہوتا، اس لئے بڑے بڑے پبلشروں کی شائع کردہ کتابیں بھی اغلاط سے پر ہوتی ہیں۔ اس مسئلے کا بس ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ اگر توفیق ہو تو مصنف خود اپنی کتاب کی پروف ریڈنگ کا ذمہ اٹھائے ورنہ دوسروں کی غلطیوں کی سزا پائے۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے اردو کے اولین افسانے کی بازیافت میں بڑی محنت کی ہے لیکن اب یہ مسئلہ اتنا الجھ گیا ہے کہ اس پر اتفاق رائے مشکل ہے۔ مجموعی طور سے چہار سو کا یہ شمارہ صرف پڑھنے کے قابل ہی نہیں بلکہ محفوظ کرنے کے بھی قابل ہے۔ (نامی انصاری)